مشکلات القرآن کا آسان حل

دورِ جدید کے تقاضوں کی روشنی میں

خاندانِ ولی اللّٰہی کے تفسیری اجتہادات کی اہمیت

بصائر القرآن

جلد دوم

مفسرِ قرآن

حضرت مولانا سید اخلاق حسین قاسمی دھلوی

toobaa-elibrary.blogspot.com

دِلّی

گہوارۂ محدّثین

مشہور محدثین و مفسرین کا تذکرہ،

مفسرِ قرآن

کا

علمی تعارف

مولانا اخلاق حسین قاسمی

کے

حالاتِ زندگی

ادارہ رحمتِ عالم - لال کنواں، دہلی ٦

زیرِ طبع

فہرست مضامین بصائر القرآن حصہ سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف حصہ سوم

مشکلات القرآن کا آسان حل

بصائر القرآن

مشکلات القرآنِ علم تفسیر کا اہم موضوع ہے اور اکابر علم نے اس موضوع پر بڑا کام کیا ہے۔

اس ناچیز نے شاہان دہلی (شاہ ولی اللہ، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر صاحب) کے اجتہادی تراجم اور مجتہدانہ تشریحات کی روشنی میں مشکلات القرآن کو باسانی حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

الحمدللہ! بصائر القرآن کا تیسرا حصہ قارئین کے ہاتھ میں ہے پہلے حصہ میں اسلام کے بنیادی عقائد کی قرآن کریم کی روشنی میں تشریح کی گئی ہے اور اس حصہ کو قرآنی نصاب کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔

اس حصہ میں (۱۸) مضامین ہیں اور (۱۱۳) صفحات ہیں تبلیغی اور دعوتی مجالس میں ان مختصر مضامین کا پڑھنا اور سنانا اس کا مقصد قرار دیا گیا ہے۔

اس کی اشاعت اگست ۲۰۰۱ء میں ہوئی۔ دوسرے حصہ میں (۳۸) تحقیقی مضامین ہیں اور یہ حصہ (۴۱۹) صفحات پر مشتمل ہے۔

دوسرے حصہ کی اشاعت کے مقدمہ میں اس ناچیز نے جو کلمات تشکر تحریر کیے، پیش نظر تیسرے حصہ میں بھی وہ یادگاری کلمات دوہرانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

''نہ جانے کہ یہ مستعار زندگی کب ساتھ چھوڑ جائے۔ عمر طبعی اپنا حق پورا کر چکی،

اب صرف خدا تعالیٰ کی خصوصی توفیق سے اس کی مقدس کتاب کی خدمت کے لئے دل اور دماغ اور ہاتھ پیر کام کر رہے ہیں"۔

چلو پس ماندگاں اٹھاؤ قدم
دور سے آ رہی ہے صوت جرس

اس خیال سے جلدی کی گئی ہے کہ ضروری مقالات کا حصہ شائع کر دیا جائے، اس امید قوی کے ساتھ کہ باقی مضامین بھی امت کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی اشاعت کے لیے بھی غیب سے کوئی راہ کھول دے گا۔

نغمہ کجا و من کجا، ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار مے کشم ناقہ بے زمام را

الحمد للہ! بفضل خداوندی قرآن کریم پر کام جاری ہے اور یقین واثق ہے کہ خداوند عالم ان مضامین قرآن کی اشاعت کا بھی انتظام فرما دے گا۔

اس ناچیز کے مختلف موضوعات پر دینی، تاریخی اور علمی مضامین جو ملک کے موقر رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں اور ان کی تعداد (۵۷) کے قریب ہے وہ ریکارڈ میں محفوظ کر دیے گئے ہیں اور ان مقالات و مضامین کی ایک فہرست اس کتاب کے آخر میں لگا دی گئی ہے۔ والحمد للہ علی ذالک

اخلاق حسین قاسمی
یکم اپریل ۲۰۰۴ء

علماء دیوبند کی قرآن فہمی کے اصول اربعہ

بصائر القرآن پر تحقیقی نظر

از: حضرت مولانا محمد سالم قاسمی

مہتمم دارالعلوم (وقف) دیوبند

حضرت مولانا سالم قاسمی صاحب زید مجدہم رئیس اہتمام دارالعلوم (وقف) دیوبند نے حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب کی کتاب ''بصائر القرآن'' پر اپنے وقیع علمی تبصرہ سے پہلے حضرات علماء دیوبند کی قرآن فہمی کے عناصر اربعہ پر روشنی ڈالی ہے۔ حضرت موصوف مدظلہ العالی کا وہ تحقیقی مضمون ترجمان جدید کے استفادہ کے لئے شائع کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

''قرآن کریم'' منزل من السماء وہ خاتم الکتب ہے کہ جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی گئی اور جس طرح ختم نبوت کے منصب عظیم کی خاتمیت اس کی متقاضی ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی قیامت تک نہ آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات وامتیازات نبوت قیامت تک باقی رہیں اور دست وبرد زمانہ سے ہمیشہ محفوظ رہیں اسی طرح خاتم الکتب قرآن کریم کی معنویت وہمہ گیری اور انسانی زندگی کے لئے اس کے پیش کردہ لائحہ عمل کی دوامیت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ یہ کتاب مقدس بلا کسی ادنی تغیر کے ہمیشہ محفوظ رہے۔

نبوت محمدیؐ اور آخریت قرآن کریم کا پندرہ سو سال کی طویل ترین مدت میں کسی ادنی فرق وتغیر سے محفوظ و مامون رہنا نبی کریم صلعم کی خاتمیت وصداقت پر اور قرآن کریم کے آخری کتاب اللہ ہونے پر بذات خود ایسی شہادت کبری ہے کہ جسکی نہ اقوام عالم میں کوئی مثال ہے اور نہ اسے کسی لائق اعتماد بنیاد پر کبھی چیلنج کیا گیا ہے اور نہ کیا جاسکتا ہے۔

اس باعظمت کتاب اللہ کی دوامیت اصولی طور پر اسکی متقاضی ہے کہ اسکے مفاہیم ومرادات ہمیشہ زمانی یا مکانی تحدیدات سے ماوراء ہوں لیکن ہر دائرہ رہنمائی میں معانی قرآن کی اس رفعت وعظمت کو ملحوظ رکھنا چار وقیع بنیادوں پر موقوف ہے جس کا بحمد اللہ اپنے اکابر رحمہم اللہ

کے اخلاص وللّٰہیت کے طفیل دارالعلوم ہمیشہ حامل رہا ہے احقر ناکارہ اپنے محدود علم وفکر کے تحت ان کو اپنی طالب علمانہ زبان میں ''دارالعلوم دیوبند'' کی معنویت عمیقہ کے درج ذیل عناصر اربعہ سے تعبیر کرتا ہے:

عنصر اول: حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی فراست ایمانی پر مبنی مآل اندیشی ہے۔ جس پر حضرت موصوف کی اکبر کے مشرکانہ دین الٰہی کے متقابل تحفظ دین توحید پر مشتمل تاریخ ساز خدمات شاہد عدل ہیں۔

عنصر دوم: مسند الہند حضرت اقدس شاہ ولی اللہؒ کی وہ دینی حکمت آفرینی ہے کہ جس نے ارباب اقتدار کی تائید وہمنوائی سے علماء سو کے پیدا کردہ ذوق بدعات کے بالمقابل کتاب و سنت سے مستفاد دین صحیح کی صداقتوں کو عامۃ المسلمین کے لئے مؤثر بنانے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے جبکہ اس دور کے علماء سو مسلمات دین کو بھی عام مسلمانوں کے قلوب میں متزلزل اور ناقابل یقین بنا چکے تھے اس لئے بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کی یہ ہی حکمت آفرینی بدرجہ اسباب مسلمانوں کے قلوب میں دین صحیح کی آبیاری و برقراری کیساتھ علمی ذوق وشوق کا باعث بنی ہے۔

عنصر سوم: بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ کا عالمی فکر اسلامی ہے۔ کیونکہ کتاب وسنت کے علم کثیر وعظیم کی مخاطب پوری کائنات انسانی ہے لہٰذا دین کے مؤیدین کے درمیان طلب صواب میں طبعی اختلاف، خطا و صواب کے مکاتب فکر کی تولید کا باعث بنا اور مخالفین حق کے بالمقابل باطل مکاتب فکر کی وجود پذیری کا سبب بنا اس نقطہ فکر کے تحت حضرت الامام النانوتویؒ کی إنما المومنون اخوۃ سے مستفاد ایمانی اخوت پر مبنی نظر وسیع میں، ملت اسلامیہ کے درمیان خطا وصواب کا اختلاف نہ ادنی درجہ میں موجب بعد ہے اور نہ ذریعۂ تفریق ہے۔ ایسے ہی اشهد ان الناس کلهم اخوة سے حاصل شدہ انسانی اخوت کے تحت انسانیت انکی نگاہ میں قطعاً قابل تقسیم نہیں ہے۔

عنصر چہارم: دارالعلوم دیوبند کے سرپرست اول حضرت بانی دارالعلوم کے رفیق لبیب فقیہ الاسلام
حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا وصف امتیازی اتباع سنت رسول اللہ ہے جس نے
جماعت اہل حق میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایمانی مآل اندیشی حضرت شاہ
ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی حکمت آفرینی اور بانی دارالعلوم حضرت الامام النانوتویؒ کے عالمی
فکر اسلامی کے ساتھ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ کی اتباع سنت رسول اللہ کے امتیازی وصف
نے دارالعلوم دیوبند کی معنویت کو درجہ کمال عطا فرمادیا۔

مختلف مکاتب فکر کی تولید کی بنیاد چونکہ اسلام کی لامتناہی علمی وسعت وعظمت ہے جو نگاہ انصاف میں اس کی متقاضی ہے کہ خاص طور پر خطاوصواب کے مکاتب فکر کے تحمل کے بارے میں، علماء اسلام انتہائی وسیع الحوصلہ ہوں اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب ہر مکتب فکر کے حاملین، اپنے فکر دینی کو ترجیحا پیش کریں جسکا بجا طور پر ان کو حق حاصل ہے لیکن کسی بھی مرحلے میں وہ اپنے فکر کو تبلیغا پیش کرنے کے قطعا مجاز نہیں ہوں گے پس تبلیغ صرف اور صرف دین منزل من اللہ ہی کا حق ہے کیونکہ وہ اپنی وضع وتعین میں عقل کا دخل قطعا نہ ہونیکی وجہ سے خطاء کے احتمال سے قطعا بری ہو کر صواب ہی صواب ہوتا ہے، بخلاف مذاہب فقہیہ یا مسالک مسلوکہ کے کہ ان میں عقلی استنباط واستدلال کی بنا پر صواب کے احتمال کیساتھ خطاء کا احتمال بھی اس سے ختم نہیں ہوتا۔ لہذا وہ لائق ترجیح تو ہو سکتے ہیں لیکن قابل تبلیغ ہرگز نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہیکہ جب کسی مذہب فقہی یا مسلک فکری کو دیگر مذاہب فقہیہ یا مسالک فکریہ کے بالمقابل ترجیحا کے بجائے اہل علم نے تبلیغا پیش کرنا شروع کر دیا تو بظاہر اسباب اسی غلطی نے امت میں بے نہایت طرق اختلاف کے بیج بو دیئے حالانکہ فقہائے کرام نے زمانہ نبوت کے آثار وبرکات سے اور بہت کم واسطوں سے علوم نبوت سے معتمد ومستند طریق پر مستفیض ہونے کے باوجود اپنے مستنبطات فقہیہ کو من کل الوجوہ صواب سمجھ کر پیش فرمایا لیکن اس میں احتمال خطا سے اور دیگر ائمہ کرام کی اپنی دانست میں خطاء میں صواب کے احتمال سے قطعا منکر نہیں ہوئے۔ اس عظیم علم کے باوجود مذاہب فقہیہ کو جب ترجیحی مقام ہی مل سکتا ہے، تبلیغی نہیں، تو مسالک مسلوکہ کے حاملین جو کہ بلحاظ علم اور باعتبار بُعدِ

زمانۂ نبوت فقہائے کرام کے ہم مرتبہ وہم مقام نہیں قرار دیئے جاسکتے تو ان کو بدرجہ اولیٰ تبلیغی درجہ دینے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ بالفاظ دیگر مذاہب فقہیہ کو اگر دین کے برابر کا درجہ نہیں دیا جاسکتا تو مسالک کو کیسے دیا جاسکتا ہے اگر ان دونوں میں سے کسی کو بھی حق تبلیغ دیا جائے جیسا کہ دور حاضر میں یہ امر واقعی بن چکا ہے تو اس حد ناشناسی یا حق ناشناسی ہی کو امت اسلام کے درمیان تفریقات واختلافات عظیمہ کا سرچشمہ قرار دینا احقر جیسے حقیر طالب علم کی نظر میں مبالغہ محسوس نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم بالصواب

مطالعہ بصائر القرآن کے اس نتیجہ نے غیر معمولی طور پر احقر کو مسرور وشاداں کیا کہ حضرت علامہ اخلاق حسین قاسمی صاحب مدظلہ نے مستند اور معتمد علماء اعلام کے تراجم وتفاسیر قرآنیہ کے مابین اپنی ایمانی اور علمی فراست سے اس امر کو پورے طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ یہ سب اکابر رحمہم اللہ طالبین حق ہی نہیں بلکہ انشاء اللہ واصلین حق بھی ہیں اس لئے انہوں نے ان کے اس طریق فکر کو سمجھ کر پیش فرمایا ہے لیکن اپنے بارے میں خطاء کے احتمال سے ان کے قلوب صافیہ خالی نہیں۔

اسی کے ساتھ علامہ اخلاق حسین صاحب قاسمی کی وسعت مطالعہ اور علمی فراست کے مبنی برحق اعتراف کے باوجود کہیں کہیں سبقت قلمی محسوس ہوتی ہے کہ بعض حضرات کے بارے میں ان کا ترجیحی نقطہ فکر دیگر علماء اعلام کے بارے میں ایہام نقص کی جانب مشیر ہوتا ہے جبکہ احقاق حق میں ان کی زبان وقلم کو شاہد عدل کا درجہ حاصل ہے۔

اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی لائق اعتراف اور قابل ذکر ہے کہ حضرت العلامہ مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی دامت برکاتہم وعمت فیوضہم کی ذات گرامی عصر رواں میں مختلف علوم دینیہ میں وسعت وتعمق نظر کے ساتھ خاص طور پر علوم قرآنیہ میں آج جماعت اہل حق میں منفرد ویکتا مقام عظمت کی حامل ہے۔

حق تعالیٰ حضرت والا کے فیض عمیم وکبیر سے ملت اسلامیہ کو تادیر مستفید فرماتا رہے۔ آمین

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

ترجمان دارالعلوم

نام کتاب: بصائر القرآن
مصنف : مولانا سید اخلاق حسین قاسمی
قیمت : درج نہیں
ناشر : ادارہ رحمت عالم ۱۸۳۸، کٹرہ شیخ چاند لال کنواں۔ دہلی۔۶

قرآن مجید عالم انسانیت کی ہدایت ورہنمائی کے لیے اللہ کی عظیم نعمت ہے۔ اللہ وحدہ لاشریک نے اسے سارے انسانوں کی ہدایت کے لئے نازل کیا ہے۔ قرآن کی صورت میں جو معجزہ امت محمدیہ کو اللہ تعالی نے عنایت کیا ہے۔ وہ دیگر امتوں کو نہیں ملا ہے، اللہ تعالی نے جہاں قرآن مجید کے حروف کو اپنی اصلی شکل میں باقی رکھنے کی ذمہ داری لی ہے، وہیں یہ بات بھی ایک تاریخی حقیقت بن چکی ہے کہ بطور معجزہ اس کے تعلیم وتعلم کا فیض جاری رہے گا، اس کے لفظی ومعنوی اثرات کا برابر ظہور ہوتا رہے گا، خوش نصیب ہیں وہ سعید نفوس، جنہوں نے قرآن مجید کے پڑھنے اور پڑھانے کو زندگی کا مشن بنا لیا ہے، اور خود نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد: تم میں سب سے بہتر وہ مسلمان ہے جو قرآن پڑھنا سیکھے اور جس نے دوسروں کو قرآن پڑھانے کا خود کو مصداق بنالیا ہو۔

مولانا اخلاق حسین قاسمی حد درجہ خوش نصیب ہیں کہ انہوں نے قرآن کریم میں غور وفکر کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا، موصوف گزشتہ پچاس سالوں سے تسلسل کے ساتھ دہلی میں قرآن کریم کی درس وتدریس میں ہمہ تن مصروف ہیں قرآنی علوم پر آپ کی گہری نظر ہے، درس وتدریس کے ساتھ آپ نے قرآن کریم کے مختلف موضوعات پر بحث وتحقیق کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہے آپ کو اللہ نے تقریر کے ساتھ تحریر کا بھی وافر ملکہ عطا کیا ہے، آپ کے مضامین علمی اور تحقیقی ہوتے ہیں قرآنی علوم ومعارف پر آپ کی ایک درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں '' محاسن موضح قرآن'' اور '' مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت'' کو اہل علم کے حلقے میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب مولانا اخلاق حسین قاسمی کے قرآنی مضامین کا مجموعہ ہے۔ پہلا حصہ اسلامی

عقائد کی تشریح پر مشتمل ''قرآنی نصاب'' کے نام سے شائع ہوا ہے پیش نظر دوسرے حصے میں اسلام کے اجتماعی مسائل کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے، اس مجموعے کے اکثر مضامین اس لائق ہیں کہ اس کا بالا ستیعاب مطالعہ کیا جائے، یہ مضامین مصنف کے برسوں کے غور و فکر کا حاصل ہیں۔

مصنف کو خاندان شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے حد درجہ عقیدت ہے آپ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ قرآن کو اردو زبان میں الہامی ترجمہ مانتے ہیں اور اپنی تحقیق میں ہر مقام پر شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کی تحقیق سے استفادہ کرتے نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ برصغیر کی اسلامی تاریخ میں شاہ ولی اللہ اور ان کے لائق فرزندوں نے ہی قرآن و سنت کی شمع روشن کی، شاہ کی ذات گرامی ہی سے برصغیر میں عمل بالحدیث کا سلسلہ شروع ہوا یہ سب اپنی جگہ مسلم الثبوت ہیں۔ ان ساری خدمات کے باوجود قرآن کریم کے علوم و معارف کو جس کی وسعت بحر ناپیدا کنار ہے، اس کی انتہا تک پہنچنا کسی ایک ذات یا ایک خاندان کے لئے ممکن نہیں اور نہ ہی اس کا استیعاب کسی ایک زمانے میں ممکن ہے۔

آپ نے اپنے تفسیری مضامین میں خانوادہ شاہ ولی اللہ کے علاوہ اکابر علماء دیوبند کی تفاسیر کو بھی سامنے رکھا ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے قاری کو ۱۹ اور ۲۰ ویں صدی کے نامور مفسرین کی مختلف تفاسیر کی ندرت اور اس کی افادیت سے بھی واقفیت ہو جاتی ہے۔

آپ کے اس مجموعے کا ایک مضمون بعنوان ''سیاسی اقتدار خدا کا انعام ہے''۔ اس میں قاسمی صاحب نے قرآنی نصوص کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ حکومت اور سیاسی اقتدار اللہ کی نعمت ہے اور وہ یہ نعمت اپنے بندوں کو اپنے علم اور اپنی مصلحت کے مطابق تقسیم کرتا ہے، اسی موضوع سے متعلق ایک دوسرے مضمون ''جہاد اور فلسفہ جہاد'' میں یہ صراحت کی ہے کہ قرآن کریم نے جہاد و قتال کی جو حکمت الٰہی بیان کی ہے اس میں صرف ''دفاعی جہاد'' کی ضرورت کا اظہار ہے۔

اسلام ایک آفاقی مذہب ہے اور وہ عالم انسانیت کے لئے نجات دہندہ بن کر آیا ہے اب اسلام کے نام لیواؤں کا فرض منصبی ہے کہ ظلم و تعدی سے کراہ رہی انسانیت کو آزادی دلانے کے لئے پیش قدمی کریں اسلام کے نزدیک الوہیت کا صحیح مظہر حاکمیت خدا ہے، جو صرف خدائے واحد کی بندگی کا قائل ہے جہاں تک عقیدے کا معاملہ ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا تعلق انسان کی آزادی رائے سے ہے۔

یہ کتاب قرآنی علوم کے شائقین اور طلبہ کے لئے ایک گراں قدر تحفہ ہے۔ کتاب کی قیمت اور سن اشاعت درج نہیں ہے۔

مبصر: ابو یوسف مکی

حضرت سلطان المشائخؒ کی
تفسیرِ قرآن کریم پر گہری نظر

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء علیہ الرحمۃ کی نظر جس طرح احادیثِ نبویؐ پر نہایت وسیع اور محققانہ تھی اسی طرح قرآن کریم کی تفسیر پر بھی آپ کو بڑا عبور حاصل تھا اور افادات کے وقت قرآنی لطائف و معارف آپ کے ذہن میں مستحضر رہتے تھے۔ قرآن کریم اور احادیث نبوی ﷺ اسلام کے دو بنیادی اور اصولی مآخذ ہیں اور ان میں تمام دینی علوم تصریح کے ساتھ یا اشارات میں موجود ہیں۔ ایک عالم اگر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں صاحب نظر ہے تو وہ جملہ علوم دینی میں صاحب نظر تسلیم کیا جائے گا۔ فرق یہ ہے کہ کسی عالم کا خاص موضوع قوانین شریعت ہیں تو وہ فقیہ ہے اور اس کی پوری توجہ اسی موضوع پر ہوتی ہے' دوسرے موضوعات اس کی دلچسپی کا مرکز نہیں ہوتے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے قرآنی علوم کو پانچ بنیادی علوم پر تقسیم کیا ہے

(۱) علم الاحکام ---- یہ علم فقہاء کا خاص موضوع ہے۔

(۲) علم المناظرہ --- یعنی باطل قوتوں کے عقائد کی تردید - یہ علم متکلمین اسلام کا موضوع ہے۔

(۳) علم تذکیر بآلاء اللہ --- یعنی انعامات الٰہی کے ذریعہ نصیحت کرنا۔

(۴) علم تذکیر بایام اللہ --- یعنی حوادث تاریخی کے ذریعہ وعظ و نصیحت کرنا۔

(۵) تذکیر بالموت -- یعنی موت کے بعد واقع ہونے والے حوادث کے ذریعہ وعظ و نصیحت کرنا۔

آخری تینوں علوم واعظوں اور معلمین اخلاق کا موضوع ہیں (الفوز الکبیر ۴) اس تقسیم کا تعلق عام معلومات سے نہیں ہے بلکہ خاص دلچسپی اور خاص مہارت سے ہے۔

اس تقسیم کے لحاظ سے شیخ علیہ الرحمہ علم المناظرہ کے منفی پہلو کے علاوہ پانچوں علوم پر حاوی نظر آتے ہیں۔ ردو کد اور تنقید چونکہ تصوف کی روح سے مناسبت نہیں رکھتی اس لئے اس کا اثر شیخ ؒ کے افادات میں محسوس نہیں ہوتا۔ علم الاحکام کے تعلق سے عبادت' طہارت' صدقہ اور مہر کی بحثیں --- علم المناظرہ کے مثبت پہلو کے تعلق سے ایمان باللہ 'ایمان بالغیب اور توبہ پر گفتگو --- علم التذکیر کے تعلق سے ترغیب و ترہیب --- اور خوف ورجاء پر مشتمل حکایات کے ذریعہ تزکیۂ اخلاق و عادات کا حصہ --- جو ملفوظات میں غالب نظر آتا ہے۔ نحو ولغت جو علوم آلیہ کہلاتے ہیں'ان پر بھی شیخ ؒ کی گفتگو موجود ہے' جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

تفسیر کشاف اور تفسیر بیضاوی کا دور

تفاسیر میں وہ دور علامہ زمخشری اور قاضی بیضاوی کی تفاسیر کا تھا۔ فوائد الفواد میں بیضاوی کو تفسیر ناصری کہا گیا ہے' جو اس کے مصنف کے نام کی طرف منسوب ہے۔

علامہ جار اللہ زمخشری

علامہ جار اللہ محمود ابن عمر زمخشری (ولادت ۴۶۷ھ) کی تفسیر کشاف علامہ ابن خلدون کی رائے کے مطابق ایک بہترین تفسیر ہے مگر مصنف نے اس میں اپنے فاسد نظریات کی پرزور وکالت کی ہے۔ کشاف کا مطالعہ کرنے والا اگر اہل سنت کے عقائد سے واقف ہو کر اس کا مطالعہ کرے تو اس کا مطالعہ ضرر رساں نہیں۔ فقہ کے مسلک میں یہ حنفی تھے۔ (مقدمہ ابن خلدون ۴۹۱)

علامہ تاج الدین سبکی نے زمخشری کو حضرات انبیاء اور صالحین امت کی شان میں بے ادبی کرنے والا لکھا ہے۔ وہ اپنے والد علامہ تقی الدین سبکیؒ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے "زمخشری نے رسول اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے' اس لئے میں نے اس کتاب کی تدریس حضور ﷺ سے حیا کرتے ہوئے بند کردی"۔ (النماذج الخیریہ ۳۱۰)

شیخ علیہ الرحمہ نے ایک مجلس میں کشاف سے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کی نحوی ترکیب پر تقریر فرمائی اور اپنے شیخ رشید خواجہ حسن بصریؒ کی قراءت پر حضرت ابراہیم نخعیؒ کی قراءت کو ترجیح دی اور یہ شیخ ؒ کے علمی ذوق کا نتیجہ تھا۔ اور پھر آخر میں اَلْحَمْد کی دال اور اللّٰہ کے

لام سے ایک صوفیانہ نکتہ بیان فرمایا۔ یہ شیخ ؒ کا اصلی ذوق تھا۔ پھر علامہ زمخشری کی علمی جلالت کا اعتراف کر کے اسکے معتزلانہ عقائد کی مذمت فرمائی اور شیخ صدر الدین ؒ کے حوالہ سے فرمایا کہ انہوں نے ایک شخص کو خواب میں دیکھا کہ اسے زنجیر میں باندھ کر لے جایا جارہا ہے۔ انہوں نے پوچھا یہ کون ہے؟ انہیں بتایا گیا کہ یہ نحو مفصل لکھنے والا زمخشری ہے۔ (جلد ۳' مجلس ۱۱' ص ۵۶۱)--- زمخشری کے اعتزال کے باوجود اکابر صوفیہ اس کی تفسیر کی علمی عظمت کے سبب اپنے مطالعہ میں رکھتے تھے۔ قاضی حمید الدین صاحب ناگوری ؒ کے پاس تفسیر کشاف آٹھ جلدوں میں مجلد رکھی ہوئی تھی۔

خواجہ حسن فرماتے ہیں کہ ایک روز میں نے دیکھا کہ شیخ علیہ الرحمہ کے سامنے تفسیر ناصری (بیضاوی) رکھی ہوئی ہے۔ آپ نے اس تفسیر کے مصنف قاضی ناصر الدین ؒ کی ایک کرامت بیان فرما کر اس تفسیر کی عظمت و مقبولیت پر روشنی ڈالی۔ (جلد ۲' مجلس ۱۸' ص ۳۸۷)

اہل علم کی اس رائے کے بعد حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے شیخ صدر الدین ؒ کے حوالہ سے جو خواب بیان کیا ہے اس پر کوئی تعجب نہیں ہوتا' لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ خود شیخ ؒ نے اپنی مبارک زبان سے زمخشری پر جہنمی ہونے کا حکم نہیں لگایا۔ یہ ایک طرف تصوف کے آداب کا تقاضا تھا اور دوسری طرف فقہی اصولوں کی رعایت تھی۔ فقہاء کا متفقہ اصول یہ ہے کہ جس غلط قول کی تاویل صحیح ہو سکتی ہے اور تاویل کر کے اس میں صحیح مفہوم کا پہلو نکالا جاسکتا ہے اس قول پر کفر و ضلالت کا فتویٰ نہیں لگایا جاسکتا۔ کافر و جہنمی قرار دینے کے لئے ناقابل تاویل (کفر بواح) فاسد نظریہ ہونا چاہیے۔ خواب' خواب ہی ہے اور مذکورہ خواب کی یہ تعبیر بیان کی جاسکتی ہے کہ زمخشری کے فاسد نظریات کی طرف اس خواب میں اشارہ کیا گیا ہے' ورنہ فرقہ معتزلہ پر علماء اہل سنت کی طرف سے جہنمی اور کافر ہونے کا فتویٰ نہیں لگایا گیا۔

امام عبداللہ ناصر الدین بیضاویؒ

ان کا لقب ناصر الدین ہے اور بیضاوی نسبت ہے۔ شافعی المسلک تھے۔ آذربائیجانی علاقہ کے عظیم ترین عالم اور زاہد و عابد شمار کئے جاتے تھے۔ ان کی ولادت ۶۸۵ھ کی ہے۔ ان کی تفسیر کو علوم حدیث' بلاغت' نحو' اور درایت کے اصولوں پر مشتمل نہایت اعلیٰ تفسیر کہا گیا ہے۔

فضائل کی موضوع روایات

علامہ زمخشری نے (اعتزالیت سے قطع نظر) ہر فن میں اپنی جلالت کالوہا منوایا ہے۔ اسرائیلی روایات سے بھی اپنا دامن بچانے میں انہوں نے بڑی احتیاط اختیار کی ہے، مگر تعجب ہوتا ہے کہ علامہ نے قرآن کریم کی سورتوں کے فضائل میں ضعیف روایات کو بغیر کسی تأمل کے نقل کردیا ہے۔

زمخشری کے بعد امام بیضاوی ہیں، ان کی محققانہ شان بھی ہر فن میں اپنی عظمت کو تسلیم کراتی ہے اور معتزلانہ تصورات کی تردید میں بھی قاضی صاحب کسی اہلِ سنت مفسر سے پیچھے نہیں ہیں، مگر فضائل کی موضوع روایات کے نقل کرنے میں قاضی صاحب علامہ زمخشری کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ قاضی صاحب بڑے صاحبِ دل عالم تھے، صاحبِ کرامت تھے، ضعیف روایات نقل کرنے کے معاملہ میں قاضی صاحب کو ایک مخلص عالم قرار دے کر معذور قرار دیا گیا ہے۔ صاحبِ کشف الظنون نے لکھا ہے کہ قاضی صاحب ایک صاحب اخلاص آدمی تھے، وہ لوگوں میں قرآن کریم کا ذوق وشوق پیدا کرنا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے اس باب میں چشم پوشی سے کام لیا۔ (جلد اول، ۱۲۷)

اس دور کے مشائخ صوفیہ کے سامنے یہی دو تفسیریں رہی ہیں، اس لئے ان حضرات کا کلام فضائل کی ان احادیث سے متأثر ہوا ہے۔ البتہ صاحب سیرالاولیاء امیر خورد نے شیخ علیہ الرحمۃ کے حوالے سے بعض احادیث وآثار ایسے نقل کئے ہیں جو فوائد الفواد والے محققِ حدیث اور عصمتِ نبوت کا نہایت پاکیزہ اور بلند مذاق ومشرب رکھنے والے شیخ کے شایانِ شان نظر نہیں آتے۔ ان میں ایک تفسیری اثر وروایت وہ ہے جو منافقین اور نو مسلم یہودیوں نے پھیلائی۔ یعنی حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور سرور کونین ﷺ کے

درمیان محبت کا افسانہ، کذب و افتراء۔ اسی قسم کی روایات و آثار کو دلیل قرار دے کر پاکستان کے مشہور عالم جناب پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے "تاریخِ تصوف" میں چشتی تصوف میں الحاق و اضافہ اور باطنیت و شیعیت کی ملاوٹ کا دعویٰ کیا ہے۔ ناچیز نے ایک عنوان کے تحت اس پر مفصل بحث کی ہے۔

تصوف کی اشاراتی تفسیریں

شیخ علیہ الرحمۃ تفسیر قرآن کے باب میں اہل سنت مفسرین و محدثین کے مسلک پر قائم تھے اور تصوف کی اشاراتی تفاسیر کے لطائف بھی آپ کے افادات میں راہ نہیں پاتے تھے۔ اور تفسیر قرآن کا نازک باب اسی احتیاط کا متقضی تھا۔ مولانا رومیؒ نے اپنی مثنوی میں مثالوں اور حکایتوں کے ذریعہ پند و موعظت کے دفتر کے دفتر تحریر کر دیئے ہیں لیکن مولاناؒ تفسیر کے معاملہ میں محدثین و فقہاء کے مسلک کی ترجمانی کرتے ہیں۔۔

معنیٔ قرآں ز قرآں پُرس و بس
وز کسے کاتش زدست اندر ہوس
پیشِ قرآں گشت قربانی و پست
تاکہ عینِ روحِ قرآں شدہ است

یعنی قرآن کا مطلب قرآن سے پوچھو اور بس۔ ورنہ اگر تم ادھر ادھر ہوئے تو ہلاکت میں پڑ جاؤ گے۔ قرآن کے سامنے اطاعت کی گردن جھکا دو تاکہ تم قرآنی روح میں ڈھل جاؤ۔

اشاراتی تفسیروں میں ایک تفسیر مشہور عارف باللہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی (۵۶۸ھ) کی ہے اور ایک تفسیر مولانا رومی کے ہم عصر ابو محمد شیرازی (وفات ۶۰۶ھ) کی۔ صوفیہ کی اشاراتی تفسیروں کے متعلق اہل سنت کے عقائد کی مشہور کتاب "العقائد النسفی" میں لکھا ہے:۔

"نصوص کو ان کے ظاہر پہ محمول کیا جائے گا' ظاہری معنیٰ سے عدول کر کے ایسے معانی مراد لینا جن کا دعویٰ باطنیہ فرقہ کے لوگ کرتے ہیں' دہریت اور الحاد ہے۔" (ص ۴۳)

تاویلِ بعید کی مذمت محققین صوفیاء کے ہاں

مولانا رومی" قرآن کریم کی تفسیر کی اہمیت کو سمجھتے تھے کہ اس بنیادی کتابِ ہدایت میں من مانی تاویلات کا دروازہ کھول دیا گیا تو اصل تعلیماتِ دین کی شکل و صورت بدل سکتی ہے، جس قسم کی تاویلات قادیانی اور مرزائی فرقہ کی طرف سے کی جاتی ہیں۔ اس لئے مولانا فرماتے ہیں۔

کردۂ تاویل حرفِ بکر را
خویش را تاویل کن نے ذکر را
بد ہوا تاویلِ قرآں مے کنی
پست و کژ شد از تو معنی سنی
صاحبِ تاویل باطل چوں مگس
وہم اُو بولِ خر و تصویرِ خس

یعنی اپنے آپ کو بدل، قرآن کریم کو کیوں بدلتا ہے؟ باطل تاویل جو شریعت کے مسلّمہ عقائد و اصول کے خلاف ہو اس کی مثال بولِ خر کی طرح گندی اور رذیل ہے۔

گمراہ فرقے اپنے باطل نظریات کو سہارا دینے کی غرض سے حضرات صوفیاء کرام کے اشاراتی تصورات کو استعمال کرتے ہیں۔ مولانا رومی" نے اس کی مذمت کی ہے۔

موضوع تفسیری روایت کی تاویل

حضرت سلطان المشائخ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً کی شان نرالی تھی، آپ دل کے صوفی تھے اور دماغ کے فقیہ تھے ---- اور جس مقام پر دل اور دماغ کی کش مکش ہو جاتی تھی، آپ پوری قدرت اور مہارت سے دونوں میں مصالحت کرا دیتے تھے۔ اب اس نزاکت کو سمجھے کون؟ غور کیجئے! ایک موقعہ پر آپ نے سورۃ النازعات کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا: "جو شخص نماز عصر کے بعد سورۃ النازعات کی تلاوت کرتا ہے اسے حق تعالیٰ زیادہ دیر تک قبر میں نہیں رکھتا اور وہ ایک نماز کی مقدار سے زیادہ قبر میں نہیں ٹھہرتا۔ حضرت شیخ"

نے یہ احتیاط کی کہ اسے حدیث نہیں فرمایا' حالانکہ یہ بشارت فضائلِ قرآن کی انہی موضوع روایات میں سے ہے جو مفسرین نے نقل کی ہیں۔ شیخ علیہ الرحمۃ نے عام مسلمانوں کو ترغیب دینے کے خیال سے اسے نقل ضرور کر دیا' اور جس جذبہ سے کیا وہ جذبہ آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی صورت میں ظاہر ہو گیا--- شیخ ؒ پر رقت طاری ہو گئی' جو اس بات کی علامت تھی کہ یہ فضیلت بیان کرنے والا اس وقت خشیتِ الٰہی سے مغلوب ہے اور سورۃ "النازعات" کے معانی اور مطالب (موت کی سختی اور عالمِ نزع کی وحشت) اس کے دل پر طاری ہیں۔ پھر ایک عقلی سوال شیخ ؒ کے دل میں پیدا ہوا جو ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے جو عقل و فہم کے ساتھ اس فضیلت کو پڑھے گا۔

"فرمود کہ کسے کہ در گور نماند چگونہ باشد؟... گفت آنچناں باشد کہ روح بکمال مے رسد' چوں روح کامل شد قالب را جذب مے کند! (جلد ۲' مجلس ۳۱' ص ۴۶۳)

یعنی فرمایا کہ جو شخص قبر میں نہیں رہتا تو یہ کیسے ہوتا ہے؟ جواب دیا کہ اس طرح ہوتا ہے کہ جب روحِ انسانی کمال کو پہنچ جاتی ہے تو وہ جسم و قالب کو جذب کر لیتی ہے۔ علماء متکلمین اور اہل عقل محدثین نے اس بات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ روح انسانی جب کمال کو پہنچ جاتی ہے تو وہ جسم کی مادیت پر غالب آ جاتی ہے اور جسم پر روح کے آثار اور روح کی کیفیات (لطافت اور نورانیت) کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اس مفہوم میں جسم قبر سے غائب ہو جاتا ہے۔ امام ولی اللہ محدث دہلوی ؒ نے اس مسئلہ پر خاص طور پر روشنی ڈالی ہے اور اس کی وضاحت کے لئے عالمِ مثال کی اصطلاح وضع کی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ کا یہ باب مطالعہ کے قابل ہے جس سے عالمِ برزخ اور عالمِ قبر کے بارے میں جو عقلی اشکالات پیدا ہوتے ہیں وہ دور ہو جاتے ہیں۔

خواجہ حسن ؒ کا تفسیر میں تحقیقی ذوق

سائل اور مجیب (خواجہ حسن ؒ اور شیخ علیہ الرحمۃ) دونوں کی نظر قرآن کریم پر بھی گہری تھی اور اسی لئے سوال و جواب میں تفسیر قرآن کے اہم نکات واضح ہو جاتے تھے۔ چنانچہ شیخ علیہ الرحمۃ نے خواجہ جلال الدین تبریزی ؒ کے حوالے سے یہ واقعہ نقل فرمایا کہ

کسی نے آپ سے سوال کیا کہ ایک شخص روزہ تو رکھتا نہیں' البتہ سحری کا کھانا کھاتا ہے تو اس شخص کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اسے سحری کے ساتھ دن اور رات کا کھانا بھی کھانا چاہئے' البتہ اس کھانے سے جو قوت اسے حاصل ہو اسے خدا کی عبادت میں صرف کرنا چاہئے اور گناہوں سے بچنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ یہ سوال وجواب نفلی روزہ سے متعلق تھا' ورنہ فرض روزہ کا رکھنا تو لازمی ہے۔ خواجہ حسن" بولے : قرآن کریم کی اس آیت کا یہی مطلب ہے: "کُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ" (المومنون:۵۱) "پاکیزہ چیزیں کھاؤ" ... شیخ علیہ الرحمۃ نے اس آیت کا دوسرا ٹکڑا ارشاد فرما کر اسے مکمل کیا۔ فرمایا : پوری آیت یہ ہے : "کُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا" "پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو"۔ خواجہ حسن نے اصحابِ کہف کے قول کا حوالہ دے کر پوچھا کہ اس آیت میں "طیّبات" کے معنی پاکیزہ ہیں تو اصحابِ کہف کے اس قول کے کیا معنی ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو کھانا لینے بازار بھیجا اور اس سے کہا : "فَلْيَنْظُرْ أَيُّهَا أَزْكٰى طَعَامًا" (کہف: ۱۹) "وہ (کھانا لانے والا) یہ دیکھے کہ کون سا کھانا پاکیزہ ہے"۔ عربی لغت کے اعتبار سے "طَیِّبَات" اور "اَزْکٰی" دونوں کا مفہوم پاکیزہ ہے اور اہلِ تراجم نے دونوں جگہ پاکیزہ ترجمہ کیا ہے۔ خواجہ حسن کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ دونوں جگہ ایک ہی مفہوم ہے یا دونوں میں کوئی فرق ہے؟ شیخ علیہ الرحمۃ نے بڑا لطیف فرق بیان کیا اور کہا" طعامے خواستند کہ طبائع بر آں مائل باشند" ... یعنی ان کی مراد مرغوبِ طبع کھانا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ کھانا لانے والا ہمارا ساتھی ہے' وہ جانتا ہے کہ ہمیں کون سا کھانا پسند اور مرغوب ہے' وہی کھانا بازار سے خرید لائے۔ اصحاب کہف ۳۰۹ برس کے بعد اس کراماتی نیند سے جاگے تھے اور اس شہر کی دنیا اتنے عرصے میں بالکل بدل چکی ہوگی' اس لئے انہوں نے اپنے رفیق سے کہا کہ جو کھانا ہمیں مرغوب ہے وہ خرید کر لانا' خدا جانے اب بازار میں کس کس قسم کے کھانے پک رہے ہوں۔

- زمخشری جیسے نکتہ سنج مفسر نے "اَزْکٰی" کو" حلال' طیب' اکثر اور اَرخص" (سستا) کے معنی میں لیا ہے۔ تفسیر مدارک میں حضرت ابن عباس ﷺ کا یہ اثر نقل کیا گیا ہے کہ اس شہر کے لوگ بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے' اس لئے اصحاب کہف نے اپنے رفیق کو

ہدایت کی کہ وہ ایمان والوں کا حلال ذبیحہ خرید کر لائے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اصحاب کہف کی یہی مراد ہوتی تو قرآن کریم کے پاس لفظ "حلال" موجود ہے، وہ سیدھا اس لفظ کو استعمال کرتا۔ اسی طرح علامہ زمخشری نے جن الفاظ سے تفسیر کی ہے وہ بھی قرآن کریم اور عربی لغت میں موجود ہیں، قرآن کے لئے ان الفاظ کا استعمال کرنا کیا مشکل تھا؟ قرآن کریم میں کئی جگہ "حلال اور طیب" (حَلٰلًا طَيِّبًا) دونوں لفظوں کو ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے (البقرہ : ۱۶۸ اور المائدہ : ۸۸)--- مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ محاورۂ عرب ہے، اہل عرب دونوں لفظوں کو ساتھ ساتھ بطور تاکید کے بولتے تھے۔ اور ایک قول مفسرین کا یہ ہے کہ طیّب بمعنی "مستلذ" (جس سے کھانے والے کو لذت حاصل ہو) ہے (جلالین ص ۲۴) کیونکہ ہر حلال چیز سے ہر شخص کو لذت حاصل نہیں ہوتی اور ہر حلال چیز ہر شخص کے لئے مرغوب طبع نہیں ہوتی۔ حضرت شیخ علیہ الرحمۃ نے سورۂ کہف کے لفظ "ازکیٰ" کو "مستلذ" (مرغوب و پسندیدہ) کے معنی میں لے کر موقع و محل کی رعایت کی طرف اشارہ کیا۔

اب ایک سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کریم میں "اَزْکٰی" کا لفظ پسندیدہ و مرغوب کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے؟ اس ناچیز کے خیال میں سورۃ النور کی آیت ۲۹ میں "اَزْکٰی" کے لفظ میں یہ مفہوم موجود ہے۔ آیت یہ ہے :

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝

"(اے نبی ﷺ) آپ ایمان والوں سے فرمادیں کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ بات ان کے حق میں زیادہ پاکیزگی کی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کی خبر رکھتا ہے"۔

غیر محرم عورتوں سے نگاہیں نیچی رکھنا اور اپنی شرمگاہوں کو چھپا کر رکھنا، یہ بات اخلاقی پاکیزگی کی بھی ہے اور ہر انسان طبعاً اسے پسند بھی کرتا ہے اور مرغوب بھی رکھتا ہے۔ کون ہے جو دوسروں کے سامنے ننگا ہونا پسند کرے یا دوسروں کو ننگا دیکھنا پسند کرے؟ ہر شخص بشرطیکہ فطرتِ سلیم رکھتا ہو، دوسروں کی عورتوں کو گھورنا ناپسند کرے گا

گردش ایام، قانون فطرت

گردش ایام اور برے بھلے دنوں کی باری باری الٹ پلٹ فطرت کا اٹل قانون ہے، اسی قانون نشیب وفراز پر قدرت کا نظام قائم ہے۔ گردش لیل ونہار کا یہ قانون کفر وایمان کے مذہبی دائرے سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا غزوہ احد میں جب مسلمانوں کو جنگی ہزیمت کی ایک چوٹ لگی تو قرآن نے اس غزوہ کی ناکامی پر تفصیلی تبصرہ کرتے ہوئے اس اصول فطرت کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی: ان یمسسکم قرح فقد مس القوم قرح مثله تلك الایام نداولها بین الناس ولیعلم الله الذین آمنوا منکم ویتخذ منکم شهداء والله لا یحب الظالمین (آل عمران ۱۴۰)''اے مسلمانو! اگر اس جنگ میں تمہیں ہزیمت کا زخم لگا ہے تو اس سے پہلے بدر کے غزوہ میں تمہارے مخالف گروہ کو بھی زخم لگا تھا۔ یہ پریشانی اور بزدلی کیسی ہے؟ اس سلسلہ میں نظام فطرت کے اس اصول کو یاد رکھو کہ ہم حوادث زمانہ کو لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔''

اور اس موقعہ کی ہزیمت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ یہ جاننا چاہتا ہے کہ تم میں پکے ایمان والے کون ہیں اور یہ مصلحت بھی ہے کہ خدا تعالیٰ تم میں سے کچھ لوگوں کو نافرمانی کے نتائج کا شاہد حال بنانا چاہتا ہے۔

قرآن کریم کے اسلوب بیان کی بلاغت کا ایک نکتہ یہ ہے کہ اس نے مشرکین مکہ کی ہزیمت کو ایک قوم (مس القوم) کی ہزیمت سے تعبیر کیا، مشرکین کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ حالانکہ موقعہ کے لحاظ سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ مسلمانو! اگر آج تم نے چوٹ کھائی ہے تو کل مشرکین نے چوٹ کھائی تھی، پھر تمہارے دل شکستہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں، اس تعبیر (مس المشرکین) کے بجائے مس القوم کہنے کی یہ وجہ تھی کہ مشرکین کے لفظ سے مسلمانوں کے اندر یہ خیال راہ پاسکتا تھا کہ خدا تعالیٰ نے مشرکین اور اہل ایمان کو برابر رکھا، فرماں بردار اور نافرمان دونوں کو برابر کر دیا۔ قرآن نے مسلمانوں کو اس خیال سے بچایا اور قوم کا لفظ لا کر یہ بتایا کہ فتح وشکست کے حالات قوموں کے درمیان گردش کرتے ہیں اور اس گردش میں خدا کی اپنی عام مصلحت کارفرما ہوتی ہے، ایمان وکفر سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

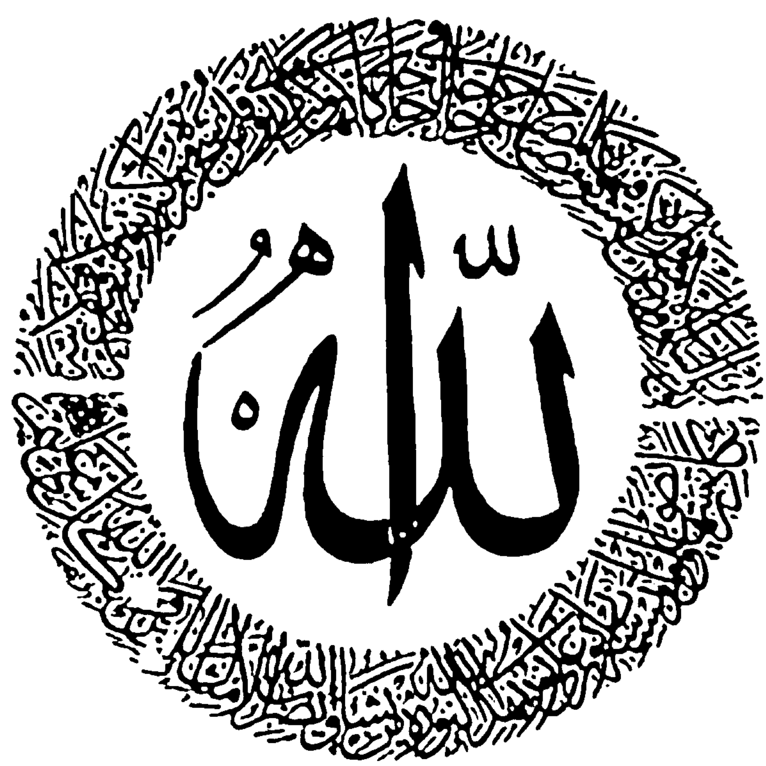
کل کس نے زخم کھایا؟ وہ ایک قوم تھی دوسری قوموں کی طرح، ان کا مذہب کیا تھا، اس سے کوئی بحث نہیں، اور آج تم نے ایک چوٹ کھائی، تم کون ہو، ایک قوم ہو دوسری قوموں کی طرح، گردش ایام کے قانون میں مذہب وعقیدہ کی کوئی بحث نہیں اقتدار وحکومت کی تبدیلی کے عام مصالح کی تحقیق پر اس راقم نے بصائر القرآن میں ایک مفصل مضمون تحریر کیا ہے، وہ دیکھا جائے، قدیم تراجم میں ایام کا ترجمہ حوادث شاہ ولی اللہ نے کیا ہے اور جدید تراجم میں نشیب وفراز ایام کا بہترین ترجمہ ہے جو مولانا مودودیؒ نے کیا ہے۔

عربی میں تداول، مداولۃ کا مفہوم کنوئیں میں ڈول ڈالنا اور ڈول نکالنا ہے، اہل عرب نے اسی مفہوم سے گردش کرنے اور اونچا کرنے کا مفہوم بنایا ہے۔ تغیر حالات اور انقلاب زمانہ کی مصلحت بیان کرنے والی مشہور آیت یہ ہے: ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا مابانفسھم (رعد:۱۱) اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے ضمیر کو نہیں بدلتی (شاہ ولی اللہ کے فارسی کا ترجمہ) ما بانفسھم کا ترجمہ جو کچھ ان کے جی میں ہے، یعنی نیت واعتقاد (شاہ عبدالقادر صاحب) اپنی صلاحیت (مولانا نذیر احمد) ڈپٹی صاحب کے الفاظ ہی مولانا تھانوی اور مولانا آزاد نے اختیار کئے ہیں۔

مودودی صاحب نے "اپنے اوصاف" کے الفاظ سے ترجمہ کیا ہے، لیکن بڑے شاہ صاحب نے ضمیر کی تبدیلی سے انقلاب حالات کا تعلق قائم کر کے بڑی علمی ذکاوت کا اظہار کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب اس آیت کا تعلق عروج وزوال کے عام قانون سے قائم کررہے ہیں کفر وایمان کے دائرہ میں محدود نہیں کررہے جیسا کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے کیا ہے در حقیقت انسانی افراد ہوں یا قومیں ہوں ان کا عقیدہ وایمان کچھ بھی ہو البتہ ان کے اندر ایک ضمیر ہوتا ہے، ایک اخلاقی اور انسانی احساس ہوتا ہے۔ یہی ضمیر انسانی انسان کو بھلائی اور خیر کے راستہ پر چلنے کی ترغیب دیتا ہے اور جب ضمیر کی آواز ہی مردہ ہوجاتی ہے تو پھر گردش ایام کا قانون نافذ ہوجاتا ہے۔ شاہ صاحب نے سورہ انعام (۱۲۹) کی اس آیت کا ترجمہ بھی اسی فلسفہ کے مطابق کیا ہے آیت کریمہ یہ ہے: وکذلک نولی بعض الظالمین بعضا بما کانوا یکسبون: "وہم چنیں مسلط می کنیم بعض ستم گاراں را بر بعض" یعنی ہم انقلاب حال برپا کرنے اور گردش ایام کے قانون کو حرکت میں لانے لئے ایسا کرتے ہیں کہ بعض ظالموں کو بعض ظالموں پر مسلط کردیتے ہیں اور ظالموں کے ہاتھ سے ظالموں کی سرکوبی کرادیتے ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ اہل حق کے ذریعہ اہل باطل کو اقتدار سے ہٹائیں۔ کبھی ایسا بھی کرتے ہیں،

لیکن بھی وہ ہوتا ہے۔ پھر جن ستم گاروں سے ہم اپنے قانون انقلاب اور قانون ردوبدل کا کام لیتے ہیں انہیں اپنا خاص بندہ کہہ کر یاد کرتے ہیں، جیسا کہ عراق کے ظالم حکمراں بخت نصر (بنوکد) کے ہاتھوں ہم نے ظالم یہودیوں اور ان کے وطن فلسطین کو برباد کردیا اور جب قرآن میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا تو ان الفاظ میں کیا: بعثنا علیکم عباداً لنا أولی بأس شدید (بنی اسرائیل) ہم نے اے یہود! تم پر اپنے خاص بندے بھیجے جو نہایت جنگ جو تھے اور وہ تمہارے گھروں میں گھس گئے اور انہیں برباد کردیا۔ بندوں کے ساتھ خاص کا لفظ اسلوب کلام میں لفظ (لنا) کے لام تخصیص سے پیدا ہو رہا ہے آج کے حالات میں مسلمان جن مصائب میں گرفتار ہیں ان کا تقاضا ہے کہ وہ مذکورہ مضمون پر غور کریں۔☆☆☆



تعداد انبیاء علیہم السلام کی تحقیق قرآن واحادیث

(۱) وَرُسُلاً قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلاً لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۞ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۞ (نساء:۱۶۴)

(۲) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۞ (مومن:۷۸) ہم نے ان رسولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں اور ان رسولوں پر بھی جن کا ذکر اے نبی! تم سے نہیں کیا اور ہم نے موسیٰ سے خاص طریقہ پر کلام کیا۔ اس سے اوپر والی آیت میں حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون، سلیمان اور داؤد علیہم السلام کا ذکر کیا گیا ہے۔

قصصنا علیک سے انہی انبیاء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حضرت نوح کا ذکران سے پہلے کیا گیا، حضرت یعقوب کی اولاد یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر بھی اس میں آگیا۔ یہ ۱۳ رسولوں کے نام ہیں۔ سورہ انعام میں حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت الیاس، الیسع اور حضرت لوط کا تذکرہ کیا گیا ہے (انعام ۸۴، ۸۶) یہ ۷ پیغمبروں کا تذکرہ ہے۔ سورہ انبیاء اور سورہ ص میں حضرت ذوالکفل کا تذکرہ ہے (۸۵-۴۸) حضرت آدم علیہ السلام کا تذکرہ مستقل طور پر جگہ جگہ کیا گیا ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ آپ کے نام پاک احمد کے ساتھ سورہ صف (۶) میں اور نام پاک محمد کے ساتھ سورہ آل عمران (۱۴۴)، سورۂ احزاب (۴۰) اور سورہ محمد (۲) اور سورہ فتح (۲۹) میں کیا گیا ہے۔

حضرت عزیر کا تذکرہ سورہ توبہ (۳۰) میں کیا گیا، حضرت یوشع ابن نون کا تذکرہ سورہ کہف (۶۰) میں کیا گیا۔ حضرت خضر علیہ السلام جو راجح قول کے مطابق پیغمبر تھے ان کا تذکرہ سورہ کہف (۶۵) میں کیا گیا، یعنی عبداً من عبادنا کے اندر۔ حضرت شعیب علیہ السلام کا تذکرہ سورۂ شعراء

(۱۷۷) میں کیا گیا اور حضرت ہود اور حضرت صالح کا تذکرہ شعراء (۱۲۲) اور (۱۴۲) میں کیا گیا۔ سورہ بقرہ (۲۴۳) میں اشارتاً حضرت حزقیل کا تذکرہ کیا گیا، طالوت (بنی اسرائیل) کے تذکرے میں جس پیغمبر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ شموئیل نبی ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام کے علاوہ یہ (۲۸) پیغمبر ہیں جن کا تذکرہ قرآن کریم میں کیا گیا ہے۔ خضر علیہ السلام کو بھی اگر شامل کرلیا جائے تو یہ تعداد (۲۹) ہو جاتی ہے، حضرت ابوذر غفاری کی حدیث میں حضرت شیث کو رسولوں میں شامل کیا گیا ہے اس لحاظ سے انبیاء کی متعین تعداد (۳۰) ہو جاتی ہے۔

حضرات انبیاء میں تفریق

قرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام اہل ایمان کی طرف سے اعلان کیا اور اس بات کی تصدیق کی۔ آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَانُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ○ (سورہ بقرۃ:۲۸۵)

> ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام اہل ایمان اس کلام پر ایمان لائے ہیں جو رسول پاک پر نازل کیا گیا ہے: یہ سب کے سب اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اسکی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کا قول وقرار ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ ہم نے خدا کا حکم سنا اور اسکی اطاعت قبول کی وہ کہتے ہیں: اے اللہ! ہم تیری بخشش اور تیرے کرم کے طلب گار ہیں اور تیری ہی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے''۔

تعداد انبیاء کی روایات

تمام رسولوں کی تعداد کے بارے میں جو حدیث مشہور ہے وہ حضرت ابوذر غفاری کی ایک طویل حدیث ہے، اس میں ابوذر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف سوالات کئے ہیں۔ ان سوالات میں ایک سوال یہ ہے:

یارسول اللہ! کم الانبیاء ؟ قال: مائة الف واربعة وعشرون الفا. یارسول اللہ! کم الرسل منهم ؟ قال: ثلاث مائة وثلاثة عشر جم غفير. قلت یا رسولؐ من کان اولهم ؟ قال آدم. قلتُ یا رسول الله! نبی مرسل؟ قال: نعم ثم قال یا اباذر! اربعة سریانیون: آدم وشيث ونوح وفتوخ وهو ادريس وهو اول من خط بالقلم. واربعة من العرب: هود

وصالح وشعیب و نبیك یا اباذر! واول نبی من اسرائیل موسی و آخر هم عیسیٰ واول النبیین آدم وآخرهم نبیك

''یارسول اللہ، دنیا میں انبیاء علیہم السلام کتنے آئے؟ آپ نے فرمایا: ایک لاکھ اور ۲۴ ہزار۔ یارسول اللہ ان میں رسول (صاحب کتاب) کتنے ہیں؟ آپ نے فرمایا: تین سو تیرہ (۳۱۳) کا جم غفیر (بڑا مجمع) میں نے سوال کیا: ان میں سب سے پہلے رسول کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام، میں نے عرض کیا، کیا آدم نبی مرسل (صاحب وحی) تھے آپ نے فرمایا: ہاں، پھر آپ نے انبیاء ورسل کی تفصیل بیان کی اور فرمایا: اے ابوذر! چار رسول سریانی ہیں: آدم، شیث، نوح، فتوخ، یعنی ادریس، جنہوں نے سب سے پہلے قلم سے لکھنے کی ایجاد کی۔ چار ان میں عربی ہیں: ہود، صالح، شعیب، اور تمہارے نبی یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور بنی اسرائیل کے پہلے نبی موسیٰ علیہ السلام ہیں اور آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور اول نبی آدم تھے اور آخری نبی تمہارے نبی یعنی میں ہوں''۔

کتنی کتابیں نازل ہوئیں؟

قال: قلت یا رسول الله کم کتاب انزله الله ؟ قال مائة کتاب واربعة کتب. انزله الله علی شیث خمسین صحیفة وعلی فتوخ ثلاثین صحیفة وعلی ابراهیم عشر صحائف وانزله الله علی موسی من قبل التوراة عشر صحائف و انزل التوراة والانجیل والزبور والفرقان. قلت یا رسول الله، فهل في ایدینا شئ ممن کان فی ایدی ابراهیم وموسی ومانزل الله علیك. قال نعم ،اقرأ یا اباذر: قد افلح من تزکی الخ. یارسول! کتنی کتابیں اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہیں؟ آپ نے فرمایا ایک سو کتابیں چھوٹی اور چار.. کتابیں بڑی۔ چھوٹی کتابیں یعنی صحیفوں میں پچاس صحیفے حضرت شیث پر، تیس صحیفے حضرت ادریس پر، دس صحیفے حضرت ابراہیم پر نازل کئے گئے اور تورات سے پہلے دس صحیفے حضرت موسیٰ پر نازل کئے گئے اور چار بڑی کتابیں توراۃ انجیل زبور اور قرآن کریم نازل کی گئیں۔ میں نے عرض کیا، حضور! کیا ہمارے پاس ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ کے صحیفوں کی تعلیمات میں سے کچھ ہے جو آپ کی لائی ہوئی کتاب (قرآن) کے مطابق ہو، تو آپ نے اس کے جواب میں سورۃ الاعلیٰ (سبح اسم ربك) کی آیات (۱۴ تا ۱۹) کی تلاوت فرمائی۔''قد افلح من تزکی ....الی صحف ابراهیم وموسی''.

حدیث مذکور میں جرح

امام ابن کثیر نے علامہ ابن جوزی کے حوالہ سے اس طویل حدیث پر جرح نقل کی ہے لیکن حضرت انس ابن مالک سے ایک حدیث نقل کی ہے جو حسب ذیل ہے: قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: بعثت علی اثر ثمانية آلاف نبی منهم اربعة آلاف نبی من بنی اسرائیل (یعنی میں بھیجا گیا ہوں آٹھ ہزار نبیوں کے بعد جن میں چار ہزار بنی اسرائیل میں آئے) اس حدیث کی امام ابن کثیر نے صحت تسلیم کی ہے اور لکھا ہے: وهذا غريب من هذا الوجه واسناده لا بأس به رجاله كلهم معروفون الا احمد بن طارق هذا فاني لااعرفه بعدالة ولا جرح والله اعلم.

تائیدی احادیث

امام ابن کثیر نے سورہ نساء آیت (۱۶۴) منهم من قصصنا عليك ومنهم من لم نقصص عليك (ص: ۵۸۶-۵۸۷، عربی مصری جلد اول) کے تحت حدیث ابوذر غفاری کی تائید میں چند احادیث نقل کی ہیں۔ ایک حدیث حضرت ابوسعید خدری کی ہے جس میں آپ نے فرمایا: انی اختم الف الف نبي او اكثر، ما بعث الله من نبي الى قومه الا حذرهم الدجال. میں ایک لاکھ یا ان سے زیادہ انبیاء کے بعد خاتم الانبیاء کی حیثیت سے آیا اور کوئی نبی اپنی قوم کی طرف سے ایسا نہیں آیا جس نے لوگوں کو دجال سے ہوشیار نہ کیا ہو۔ اسی مفہوم کی روایت جابر ابن عبداللہ نے روایت کی اور ان احادیث کو سند کے اعتبار سے قابل قبول (لا بأس بهم) قرار دیا۔ امام ابن کثیر (وفات ۷۷۴ھ) نے احادیث مذکورہ پر یہ بحث و جرح امام نسفی (وفات ۷۰۱ھ) کی تفسیر مدارک التنزیل کے مطابق کی ہے۔

امام نسفی کی یہ تفسیر مستند تفاسیر میں شمار ہوتی ہے: سورہ غافر (مومن ۷۸) کی آیت مذکورہ کی تفسیر میں علامہ جلال الدین محلی شافعی (وفات ۸۶۴) نے لکھا ہے: روی انه تعالى بعث ثمانية آلاف نبي اربعة آلاف نبي من بني اسرائيل واربعة آلاف نبي من سائر الناس (صفحہ ۳۹۶) "روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آٹھ ہزار نبی بھیجے، چار ہزار نبی بنی اسرائیل میں اور چار ہزار دوسری تمام قوموں میں"۔

اس روایت کے بارے میں جلالین کی شرح جمل میں لکھا ہے کہ مشکوۃ کے شارح علامہ عینی نے ابوذر غفاری کی روایت کو اس روایت پر ترجیح دی ہے اور امام بیضاوی اور علامہ زمخشری نے

اس روایت (آٹھ ہزار والی) کو قیل کے کمزور لفظ سے نقل کیا ہے۔ محققین علماء نے لکھا ہے کہ انبیاء پر ایمان لانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ان کے نام متعین طور پر معلوم ہوں بلکہ ان پر بالا جمال ایمان لانا کافی ہے۔

اختلاف تعداد کی وضاحت

مذکورہ احادیث میں انبیاء ورسول کی تعداد میں جو اختلاف نظر آرہا ہے[1] اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہدایت اقوام کے لئے آنے والوں کے لئے تین الفاظ لائے گئے ہیں۔

ایک لفظ رسول، دوسرا لفظ نذیرومنذر اور تیسرا لفظ ہادی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تشریح کے مطابق جو آگے آرہی ہے۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے جہاں مستقل صاحب کتاب رسول کی ضرورت پڑی وہاں رسول بھیجے گئے اور جہاں دعوت وتبلیغ کے لئے رسولوں کے نائب علماء واولیاء کو کافی سمجھا گیا وہاں رسولوں کی طرف سے انہیں بھیجا گیا۔ اس تشریح کے مطابق ایک لاکھ چوبیس ہزار والی روایت میں انبیاء کا لفظ جس کا لغوی مفہوم خبر دینے والا (نبی نباء سے ہے، نباء کے معنی خبر) یعنی پیغامبر ہے استعمال کیا گیا ہے اور اس اعتبار سے لفظ انبیاء میں قرآن کریم کی تینوں قسمیں داخل ہو جاتی ہیں۔

خیر امت سے پہلے ستر امتیں

ایک حدیث میں آپ نے آخری امت سے پہلے ستر امتوں کی خبر دی، وعن بهز بن حكيم عن جده انه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول في قوله تعالى كنتم خير امة اخرجت للناس قال انتم تتمون سبعين امة انتم خيرها واكرمها على الله تعالىٰ. (رواه الترمذى وابن ماجة و الدارمى وقال الترمذى هذا حديث حسن) (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے كنتم خير امة اخرجت للناس کی آیت تلاوت کر کے فرمایا: اے خیر امت کے لوگو! تم ستر امتوں کے بعد ان کی تکمیل کرنے آئے ہو اور تم ان سب سے بہتر ہو اور ان سے زیادہ افضل ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ستر امتوں سے ہر وہ قوم مراد ہے جس کی ہدایت کے لئے کوئی رسول و نبی آیا ہو)۔ جیسے امت موسیٰ، امت عیسیٰ، قوم صابی، مجوسی وغیرہ، اس حدیث سے بھی یہ ثابت ہوا کہ مشہور پیغمبروں اور مشہور کتابوں اور مشہور مذہبی قوموں کے علاوہ بھی پیغمبر اور کتابیں آئی ہیں۔

پیغمبروں کے درمیان مقابلہ کرنے کی ممانعت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہبی ٹکراؤ کا راستہ بند کرنے کے لئے خدا کے پیغمبروں کے

درمیان فضیلت اور بڑائی میں مقابلہ کرنے کی سخت ممانعت فرمائی، آپ نے فرمایا: لا تخیروا بین الانبیاء، لا تفضلوا بین الانبیاء (مشکوۃ ۵۰۷) ''اے لوگو! انبیاء علیہم السلام کے درمیان فضیلت قائم نہ کیا کرو۔ تخیّروا اور تفضلوا دونوں روایتیں ہیں لیکن مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے۔ ایک واقعہ میں خاص طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اپنی فضیلت قائم کرنے سے روکا اور فرمایا: لا تخیّرونی علی موسیٰ. ''مجھے حضرت موسیٰ پر فضیلت نہ دیا کرو''، محدثین فرماتے ہیں کہ آپ کی یہ ہدایات تواضع اور خاکساری کے طور پر تھیں۔ یہ درست ہے البتہ اس مصلحت کے ساتھ یہ سیاسی مصلحت بھی تھی کہ آپ دوسری مذہبی قوموں سے ٹکراؤ کو غلط سمجھتے تھے۔ خاص طور پر حضرت موسیٰ کے بارے میں اس لئے فرمایا کہ مدینہ منورہ میں غیر مسلم اقلیت (یہودی) آباد تھے اور آپ نے ان سے مذہبی آزادی اور امن وسلامتی کا معاہدہ کر رکھا تھا۔

شاہ عبدالحق، محدث دہلوی نے لمعات شرح مشکوۃ میں لکھا ہے کہ یفضی الی خصومۃ وعصبیۃ اس فضیلت کے اظہار سے دوسری قوموں کے ساتھ جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے اور عصبیت پھیلتی ہے یعنی قومیت اور نسل پسندی کے احساسات پیدا ہو جاتے ہیں، اخلاقی تواضع کے ساتھ یہ سیاسی مصلحت بھی آپ کے پیش نظر تھی۔

قرآن کریم کی آیت (بقرۃ:۲۵۳) کا مطلب

قرآن کریم نے حضرات انبیاء کے درمیان فضیلت کے مختلف درجات قائم کرنے کا اعلان کیا۔ تلك الرسل فضلنا بعضهم علی بعض منهم من كلم الله ورفع بعضهم درجات. ''یہ تمام رسول وہ ہیں جن میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی، ان میں سے بعض کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا اور ان میں سے بعض کے درجات بلند فرمائے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اجمال کے ساتھ بعض پیغمبروں کی بعض پر فضیلت کا اعلان کیا لیکن تفصیل کے ساتھ درجات انبیاء کا تذکرہ نہیں کیا۔ آیت مذکورہ میں حضرت موسیٰ کی ایک جزوی فضیلت، ہم کلامی کا ذکر کیا اور حضرت عیسیٰ کی ایک فضیلت تائید روح القدس کا تذکرہ کیا۔ مفسرین نے ورفع بعضهم سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن یہ صرف اشارہ ہے، البتہ حضورؐ نے بعض موقعوں پر اظہار حقیقت کے طور پر بڑی احتیاط سے اپنی فضیلت کا اظہار کیا ہے۔

□□□

قرآن کریم اور سائنس کے مسئلے میں افراط و تفریط

ہندستان کے مشہور عالم مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب (پھلت) کا ایک مضمون زمین کے گھٹنے سے متعلق سائنس (ماہ اگست) میں نظر سے گزرا۔ یہ مضمون اس بات کی ایک مثال ہے کہ سائنسی تجربات کی تائید کے لئے قرآن میں کس طرح کی کمزور تاویلات کی جارہی ہیں اور تاویلات (بلکہ تحریفات) کے سہارے قرآن کریم کی عظمت ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

محترم صدیقی صاحب کے جس عزیز نے امریکہ سے ایک مضمون کے ذریعہ آیت سورہ انبیاء (۴۴) میں زمین کے گھٹانے (نـاتـی الارض نـنـقـصـهـا) کے عربی محاورہ کو سائنس کے زمین گھٹنے اور سکڑنے سے جوڑا ہے وہ قطعی طور پر تاویل سقیم ہے۔ غیر علمی ہے۔

علماء قدیم و جدید نے اسے عربی کا ایک محاورہ تحریر کیا ہے جس کا مطلب اس قوم کی تباہی کی طرف اشارہ کرنا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ ہم اس قوم پر زمین تنگ کرتے چلے آرہے ہیں زمین کی تنگی اور کشادگی کا محاورہ سورہ توبہ میں بھی دو جگہ آیت ۲۵ اور آیت ۱۲۸ میں بیان کیا گیا ہے۔ مولانا کے وہ عزیز قرآن کے اتنے عالم نہیں تھے۔ لیکن مولانا صدیقی ایک ذمہ دار عالم ہیں۔ انہیں اس آیت کی تشریح دیکھ کر اپنا تحقیقی مضمون شائع کرنا تھا۔

زمین گھٹ رہی ہے، سکڑ رہی ہے، یہ ایک سائنسی تحقیق ہے جو اپنی جگہ وزن رکھتی ہے، تخلیقی حقائق سے تعلق رکھتی ہے۔ ضروری نہیں کہ قرآن اس تجربہ کی تائید کرے تو وہ قابل غور ہو، ورنہ نہیں۔ قرآن نے کب دعویٰ کیا ہے کہ وہ کتاب سائنس ہے۔ حضرت امام شاہ ولی اللہ نے اس نظریہ کی پرزور تردید کی ہے۔ اور پھر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے اس پر روشنی ڈالی ہے ابھی حال میں پاکستان سے ایک کتاب ''قرآن اور سائنس'' شائع ہوئی ہے اور مصنف نے اس میں انسان کے چاند پر جانے کے بارے میں یہ لکھا کہ قرآن نے تو آج سے چودہ سو برس پہلے رسول پاکؐ کے معراج و اسراء کا واقعہ بیان کر کے چاند سے بھی آگے جانے کا اعلان کر دیا تھا۔ یہ تمام باتیں احساس کمتری کی ہیں۔ قرآن کریم کی

☆ کنزہ شیخ چاند، لال کنواں دہلی۔۶

صداقت اس کے موضوع (ہدایت زندگی) سے وابستہ ہے؟ سائنسی علوم اپنی جگہ ہیں، علم کی حیثیت سے قرآن اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور جو لوگ اسرار فطرت کے علوم میں محنت کر رہے ہیں ان کی محنت قابل تحسین قرار دیتا ہے۔

ان فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون (یونس:۲۴) قرآن کریم نے آٹھ نو جگہ اس پیرایہ میں نظام عالم میں تفکر، تدبر اور غور کرنے والوں کی محنت کو سراہا ہے۔ تفسیرات احمدیہ (ملاجیون) میں سورہ نحل کی آیت ۸۹: ونزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شیء ''ہم نے اے نبی آپ پر وہ کتاب نازل کی ہے جو ہر چیز کو بیان کرتی ہے'' ملاجیون نے اس آیت کی تفسیر میں ہر چیز اور ہر شی سے مراد کائنات کی ہر چیز مراد لی ہے اور اسی آیت کی اس تفسیر سے قرآن کریم کو شریعت کے ساتھ سائنس اور علوم طبعیات دونوں کی کتاب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ قدیم مفسرین (ابن کثیر، رازی وغیرہ) نے لکل شیء سے شریعت و دین کے علوم مراد لیے ہیں۔ مولانا انور شاہ کشمیری صاحبؒ نے کتاب التفسیر بخاری شریف میں اس نظریہ کی وضاحت سے تردید کی ہے اور بعض صحابہ (حضرت ابن مسعودؓ) کے انس قول کی توجیہ کی ہے جس سے ملاجیون وغیرہ کو التباس ہوا ہے۔

غیب، مخفی حقائق اور سائنس

اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جو اس عالم کائنات کا خالق و مالک ہے اور تمام مخلوقات ارض و سماء کا پروردگار اور رب العالمین ہے وہی ہر شی کی قدرت رکھتا ہے، لکل شی قدیر ہے اور وہی ہر ظاہر و پوشیدہ اور غیب و شہادت کا حقیقی عالم، بکل شیء علیم و بصیر ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر غیب و شہادت اور کھلی اور چھپی چیز کا ذاتی علم اور بلاواسطہ اسباب ہر چیز کا کلی اور مکمل علم صرف خدا تعالیٰ کی صفت و شان ہے، کوئی مخلوق اس علم میں اس کی شریک نہیں یہ علم غیب کا اصطلاحی معنی ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ غیب کا لفظ خدا کے سوا جس ہستی کے لئے استعمال ہوگا وہ لغوی مفہوم (پوشیدہ اور مخفی) میں استعمال ہوگا۔

قرآن نے سورہ لقمان (۳۴) میں پانچ چیزوں کا علم اللہ تعالیٰ کے لئے خاص قرار دیا ہے: اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ ۰ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ۰ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا ۰ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ '' خدا تعالیٰ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہی بارش اتارتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے اور کوئی نفس

نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا اور کس سرزمین پر مرے گا بے شک خدا علیم وخبیر ہے۔''

سوال کیا جاتا ہے کہ آج سائنسی آلات کے ذریعہ ماں کے پیٹ کے جنین کے بارے میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی ہے؟ اسی طرح بارش کے آثار کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ماں کے پیٹ کے بچہ کے لڑکا یا لڑکی ہونے کا علم رنگین ایکسرے کے ذریعہ معلوم ہو جاتا ہے لیکن کوئی سائنسی آلہ یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ لڑکا یا لڑکی کتنے دن زندہ رہے گی اور اعمال کے لحاظ سے یہ بچہ نیک ہوگا یا بد ہوگا؟ اس کی شادی ہوگی یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ اس تفصیل کے ساتھ علم صرف اسی ذات کے ساتھ خاص ہے جو مخلوق کی خالق بھی ہے اور مخلوق کی رب، پروردگار اور پرورش اور پروان چڑھانے والی بھی ہے، ہر چیز کا اتنا مکمل علم اسی ذات کے لئے ضروری ہے۔ انسان کے لئے اتنا وسیع علم ضروری نہیں ہے۔

یہ ہے ذاتی علم اور مکمل علم اور جزوی اور وقتی علم کے درمیان فرق؟ قرآن مکمل اور ذاتی بلا واسطہ علم کو خدا تعالیٰ کی صفت قرار دیتا ہے۔

غیب کا جزوی اور عارضی علم!

وہ حقیقی پروردگار اور حقیقی حاکم انسانوں کی دینی رہنمائی کے لئے حضرات انبیاء کرام پر شرعی حقائق غیب، احکام حلال وحرام اور عبرت کے طور پر گزری ہوئی تاریخ کے واقعات غیب نازل کرتا ہے اور رسولوں پر اپنی معلومات کا حسب ضرورت کوئی گوشہ کھول دیتا ہے اور مخفی حقائق روشن کر دیتا ہے۔ یہ اظہار وانکشاف بذریعہ وحی ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ خالق عالم اپنی دنیا کا فطری اور طبعی نظام چلانے اور اسے ترقی دینے کے لئے اہل تفکر وتدبر اور اصحاب عقل وفکر پر نظام فطرت اور نظام شمس وقمر کی پوشیدہ قوتوں میں سے حسب ضرورت اور حسب محنت وریاضت بعض قوتوں کا علم انہیں عطا کر دیتا ہے اور نظام فطرت کے بعض گوشے ان پر روشن کر دیتا ہے۔

یہ اظہار وانکشاف عقلی تفکر وتدبر کی راہ سے ہوتا ہے دینی حقائق غیب کے بارے میں قرآن کریم نے کہا: عالم الغیب فلا یظہر علی غیبہ احداً الامن ارتضی من رسول (جن ۲۷)'' وہ عالم الغیب اپنے حقائق غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا مگر جس نبی ورسول کو پسند کرتا ہے اس پر ظاہر کر دیتا ہے، اسی مفہوم کی آیت آل عمران (۱۷۹) میں ہے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اعلان کیا: یا ایہا الناس علمنا منطق الطیر واوتینا من کل شیء ان ھذا لھو الفضل المبین (نمل:۱۶)

''حضرت سلیمان نے کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی کا مطلب سکھایا گیا ہے اور ہمیں ہدایت اور

حکومت کے تمام معاملات کا علم عطا کیا گیا ہے اور یہ علم خداتعالیٰ کا خاص فضل وکرم ہے۔"

حضرت سلیمان رسول و نبی بھی تھے اور بنی اسرائیل کے ایک بڑے حکمراں بھی تھے کل شیٔ سے نبوت اور حکمرانی کے دائرہ کا پورا علم مراد ہے، جو حضرت سلیمان کے دور اور حالات کا تقاضا تھا۔ حضور علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا: وما هو على الغيب بضنين (تکویر ۲۴) اور یہ رسول محترم حقائق غیب بتانے میں بخیل نہیں، یعنی جو غیبی امور شرعی احکام سے متعلق ہوں یا ماضی اور مستقبل کے ضروری حالات سے متعلق ہوں یا عالم بالا، جنت، دوزخ اور ان کے احوال سے متعلق ہوں اور خدا کی طرف سے ان کی خبر آپ کو دی گئی ہو ان کے بیان کرنے میں بخل اور تنگ دلی سے کام نہیں لیتے۔

اہل تفکر وتدبر کے بارے میں!

قرآن کریم نے ۱۵ جگہ انسانوں کو تفکر (غور وفکر کرنے کی) دعوت دی ہے اور ۲۵ جگہ تعقل (عقل سے کام لینے) کی ہدایت کی ہے۔ سورہ آل عمران (۱۹۱) میں بطور حکایت ذکر وفکر دونوں صفتوں کے حامل انسانوں: اہل ذکر (اہل ایمان) اور اہل فکر (علماء عقلیات) کے بارے میں کہا گیا کہ یہ لوگ رات دن خالق کائنات کا ذکر کرتے ہیں، شکر کرتے ہیں، اس کی عبادت کرتے ہیں، اور اس کے ساتھ اس کی کائنات کے پوشیدہ حقائق، پوشیدہ خزانوں پر غور وفکر اور اعتراف کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ عالم کائنات بے فائدہ اور بے مقصد پیدا نہیں کیا: إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ٥ قرآن کریم نے اعلان کیا کہ اس کائنات کے عجائب، دولت وثروت کے پوشیدہ خزانے، ان کے لئے ہیں جو خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لیتے ہیں۔ عقل وفکر کو معطل رکھنے والوں کے لئے نہیں ہیں۔

ان فی ذالک لآیات لقوم یتفکرون (رعد۔۳) بے شک زمین وآسمان کے اس نظام میں بڑی بڑی نشانیاں ہیں، اس قوم کے لئے جو غور وفکر سے کام لیتی ہے۔ سورہ روم (۸) میں انسانی وجود کے اندر جو تخلیقی کمالات پوشیدہ ہیں ان پر غور وفکر کرنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا گیا: اولم یتفکروا فی انفسھم ما خلق اللہ السموات والارض وما بینھما الا بالحق (۸۵) "کیا لوگ اپنے وجود باطنی کے کمالات وحقائق پر غور نہیں کرتے یہ غور وفکر ہی ان پر ظاہر کر دیتا کہ خالق ارض وسماء نے

آسمانوں اور زمین میں اور ان کے درمیان جو خلاء ہے اس میں جو کچھ پیدا کیا وہ بالکل صحیح صحیح پیدا کیا''
یعنی نظام ارض وسماء کی ہر چیز اپنے اندر ایک حقیقت رکھتی ہے، ایک مصلحت رکھتی ہے انسانی زندگی کے
لئے ایک نفع رکھتی ہے، بے مقصد کچھ نہیں ہے۔

سورہ یونس (۲۴) میں اور سورہ رعد (۳) میں آسمان وزمین کے حکیمانہ نظام پر تفصیل سے
روشنی ڈالی گئی ہے اور لوگوں کو اس پر غور فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

تفکر وتدبر کے نتائج؟

مولانا آزاد نے قرآنی حکم کے مطابق تفکر وتعقل کی اہمیت کے نتائج پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا
ہے: ''انسان کے ارتقائے ذہنی وفکری کے جس قدر کرشمے دنیا میں نظر آتے ہیں یہ تمام تر اسی انسانی تفکر و
تدبر کے نتائج ہیں لیکن تقلید پرستی کی عادت ہلاکت اور بربادی کی ایک چٹان ہے جو انسانی تفکر وتدبر اور
ادراک وتعقل کی تمام قوتوں کو کچل ڈالتی ہے اور اس کی قوت نشو ونما کا دائمی سدباب کر دیتی ہے۔
(مضامین ابوالکلام، جدید ص:۱۴)

قرآن حکیم اور عقلی علوم کا ارتقاء

مولانا آزادؒ نے سورہ یونس (۳۸) کی تشریح کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا میں عقلی علوم
کے ارتقاء کی تحریک اور تائید کا ماخذ قرآن کریم ہے: اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰاهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ
وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ O بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ
وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ O كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ
O وَ مِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ O ''کیا یہ منکرین
اسلام کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ نے قرآن کے بارے میں جھوٹ بولا ہے اور خدا تعالیٰ پر افتراء کیا ہے،
اے رسول اس کے جواب میں آپ کہیں کہ اے منکرین تم قرآن کریم کی ایک سورت جیسی سورت بنا کر
لے آؤ اور اس کے کام میں خدا کے سوا جن کو شریک کرتے ہو انہیں بھی بلالو اگر تم سچے ہو۔ حقیقت یہ ہے
اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہ جس بات کا یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا
ہے اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے۔ اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں
تو دیکھا ظلم کرنے والوں کا انجام کیا کچھ ہوا۔

مولانا آزاد علیہ الرحمۃ اس آیت پر تشریحی نوٹ لکھتے ہیں:

''اگر تم غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ انسان کی ساری فکری گمراہیوں کا اصلی سرچشمہ یہی بات ہے، یا تو عقل و بینش سے اس قدر کورا ہو جاتا ہے کہ ہر بات بے سمجھے بوجھے مان لیتا ہے۔ اور ہر راہ میں آنکھیں بند کئے چلتا رہتا ہے۔ یا پھر سمجھ بوجھ کا اس طرح غلط استعمال کرتا ہے کہ جہاں کوئی حقیقت اس کی شخصی سمجھ سے بالاتر ہوئی اس نے فوراً جھٹلا دی۔ گویا حقیقت کے اثبات و وجود کا سارا دارو مدار صرف اسی بات پر ہے کہ ایک خاص فرد کی سمجھ ادراک کر سکتی ہے یا نہیں دونوں حالتیں علم و بصیرت کے خلاف ہیں اور دونوں کا نتیجہ عقل و بینش سے محرومی اور عقلی ترقی کا فقدان ہے۔''

ایمان بالغیب کی ضرورت!

مولانا آزاد علوم عقلیہ کی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے مقابلے میں ایمان بالغیب کے مذہبی تصور کو ترجیح دیتے ہیں، لکھتے ہیں: ''سائنس عالم محسوسات کی ثابت شدہ حقیقتوں سے ہمیں آشنا کرتا ہے اور مادی زندگی کی بے رحم جبریت (Physical Determinism) کی خبر دیتا ہے اس لئے عقیدے کی تسکین اس کے بازار میں بھی نہیں مل سکتی، وہ یقین اور امید کے سارے پچھلے چراغ گل کر دے گا مگر کوئی نیا چراغ روشن نہیں کرے گا۔ پھر اگر ہم زندگی کی ناگواریوں میں سہارے کے لیے نظر اٹھائیں تو کس کی طرف اٹھائیں؟''

کون ایسا ہے جسے دست ہو دل سازی کا؟

شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیوند!

(غبار خاطر ص ۱۳)

اہل تفکر، اہل سائنس!

قدیم مفسرین نے اہل تفکر میں علماء طب کی مثال دی ہے کہ یہ محققین طب جڑی بوٹیوں کے اندر پوشیدہ اثرات و خواص کا علم حاصل کر لیتے ہیں، اور غور و فکر اور تجربات کے ذریعہ ان پر اظہار غیب ہو جاتا ہے (روح البیان) یہی صورت ان اہل تفکر کی بھی ہے جو علماء طبیعات اور محققین نظام فطرت کہلاتے ہیں۔ صوفیا میں شیخ اکبر نے بذریعہ الہام اولیا، اللہ پر اظہار غیب کی رائے قائم کی اور امام غزالی نے خواب و منام میں اولیا، اللہ پر غیب کے انکشاف کا نظریہ دیا مگر چونکہ یہ دونوں طریقہ ظنی اور غیر یقینی ہیں اس لیے محدثین کرام نے انہیں اہمیت نہیں دی۔

سائنسی علوم کے ماہر مسلمان علماء!

قرآن کریم کی اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ یوروپین مورخ (چارس جیلسپی) نے عہد وسطی کے جن ۱۳۲ سائنس دانوں کی فہرست مرتب کی ہے ان میں ۸-۱۰ کو چھوڑ کر تمام کے تمام مسلم ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ چند یوروپین سائنس داں بھی وہ تھے جنہوں نے اندلس کے علمی مراکز میں تعلیم حاصل کی تھی البتہ دسویں صدی آئی تو معاملہ الٹا ہو گیا۔ جسٹس امیر علی نے اپنی تاریخ (تاریخ اسلام) میں خلفاء عباسیہ کی علم دوستی پر مفصل بحث کی ہے اور تیسری اور چوتھی ہجری (آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کے علماء طب وطبیعات اور علماء فلسفہ وہیئت کا تعارف کرایا ہے جن میں بغداد، قرطبہ، دمشق اور سمرقند و بخارا کی مسلم یونیورسیٹیوں سے تعلیم حاصل کر کے باکمال اہل سائنس و فلسفہ بن کر نکلے ہیں اور مسلمانوں کے علمی زوال پر تبصرہ کیا ہے۔

مسلمانوں کی اس علمی پستی پر مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں: یہ تاریخ کا عبرت انگیز واقعہ ہے کہ سائنس کی عظیم الشان خدمات انجام دینے کے بعد مسلمان اپنی تحقیقی اور علمی روش کو بھول گئے اور مقلدانہ اور روایتی ذہنیت کے شکار ہو گئے۔'' اس کے سبب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: '' زیادہ تر علماء اور متکرین نے علم مابعد الطبیعات کی طرف توجہ کی اور علوم طبیعہ (سائنس) اور عملی اور نتیجہ خیز فنون کی طرف توجہ کم کی، ان مباحث میں جن کا دنیا اور آخرت میں کوئی فائدہ نہ تھا صدیوں تک دردسری اور دیدہ ریزی کرتے رہے اور ان علوم اور تجربوں کی طرف توجہ نہ کی جو ان کے لئے کائنات کی طبعی قوتوں کو مسخر کر دے اور اسلام کے مادی اور روحانی لفظ کو تمام عالم پر پھر سے قائم کر دے (دعوت اسلام، محسن عثمانی ص: ۹۲)

قرآن نے بتایا کہ مسلمان جب تک اہل ذکر اور اہل فکر دونوں صفتوں کے حامل رہے وہ مسجد و مدرسہ کے بھی امام رہے اور دانش گاہوں کے بھی امام رہے اور جب تھک کر بیٹھ گئے تو اہل ذکر کی راہ اختیار کر کے مساجد و خانقاہوں میں گوشہ نشیں ہو گئے اور ان کے شاگرد آسمانوں پر پرواز کرنے لگے۔ آج یہ صورت حال افسوس ناک حد تک قائم نظر آرہی ہے۔

خلفاء عباسی کے مادی تعیش کا اثر

مسلمانوں کی علمی ترقی کا دور عباسی حکومت کا دور تھا، عباسی حکومت نے سیاسی فتوحات کے مقابلہ میں علمی ترقی پر توجہ کی، حکومتی وسائل، دولت اور ثروت کو علماء کی علمی جدوجہد پر صرف کیا، یونانی کتابوں کے تراجم کرائے، علماء کی سرپرستی کی۔

پھر خلافت عباسی مادی عیش وعشرت میں مبتلا ہوگئی اور حکومتی وسائل دولت، ذاتی عیش و عشرت پر صرف کیے جانے لگے۔ عیسائی حکومتوں نے اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں سے لڑائی چھیڑ دی اور یہ صلیبی جنگیں دو سال تک جاری رہیں ان جنگوں میں خدا تعالیٰ نے نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی جیسے مجاہد کھڑے کر دیے جو غیر عرب (کرد) تھے۔ عیسائیوں نے مسلمانوں سے سیاسی شکست کھا کر علم کی ترقی پر توجہ کی۔

عباسی حکمران عیش وعشرت میں پڑ چکے تھے اور اہل علم حکومتی وسائل سے محروم ہونے کی وجہ سے تحقیق وتفکر کی راہ سے ہٹ کر دینی کتابوں، حدیث و فقہ کی تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گئے تھے۔ تحقیق وتفکر کا میدان مسلمانوں سے خالی دیکھ کر اہل یورپ نے وہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ حاصل یہ کہ زوال کی ذمہ داری سے اہل علم بری ہیں، یہ ذمہ داری تاریخ نے عباسی حکمرانوں کے عیش پرست طبقہ (آخری دور) پر عائد کی ہے۔

آج بھی وسائل کا سوال ہے!

دنیا کی مسلم حکومتوں کا معاملہ ہو یا غیر مسلم ملکوں میں مسلمان دولت مندوں کا معاملہ ہو، ہر جگہ مسلمانوں کی دولت مادی تعیشات پر صرف ہو رہی ہے مادی تعیشات اور مادی زندگی کی خوش حالیاں مسلمان دولت مندوں اور مسلم حکمرانوں کو گھیرے ہوئے ہیں۔

جہاں تک ہندستان کا سوال ہے جو ایک غیر مسلم اکثریت والا ملک ہے اس ملک میں حکومتی وسائل سے یہ اکثریت بھرپور فائدہ اٹھا رہی ہے۔ مسلم اقلیت اپنی زکوٰۃ وخیرات سے دینی تعلیم کے اداروں کو چلا رہی ہے زکوٰۃ وخیرات سے یہ دینی ادارے چل رہے ہیں۔ اس خیرات کے معمولی سرمایہ سے جدید علوم کے ادارے نہیں چل سکتے علماء ہندستان جدید علوم سے خوف زدہ نہیں ہیں بلکہ وسائل کی قلت ان کی کمر توڑ رہی ہے۔

علماء قدیم کی احساس کمتری!

دارالعلوم آگرہ (محلہ پیر جیلانی) میں ختم بخاری شریف (۲/اکتوبر ۲۰۰۳ء) پر روایتی تقریر کرتے ہوئے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر جو کانپور کے قدیم عربی مدرسہ کے شیخ الحدیث ہیں اپنی تقریر میں عصری علوم کی مذمت کرتے ہوئے عصری علوم والوں کے لئے کتے کا لقب اختیار کیا اور فرمایا یہ لوگ کتے ہیں۔ کچھ حضرات بخاری شریف کی اس مبارک مجلس سے اٹھ کر چلے گئے، اسی دن

رات کو اس احقر کی تقریر تھی۔ میں نے اس پر اظہار معذرت کی اور مسلمانوں کو بتایا کہ جو علماء قدیم احساس کمتری میں مبتلا ہیں وہ اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ ہمیں اپنی علمی تاریخ سے آگاہ ہونا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم مسلمان ہی موجودہ عصری علوم کے استاد تھے، ماہر تھے، سائنس اور فلسفہ کے امام تھے آج سوال صرف یہ ہے کہ ہمارے پاس مالی وسائل نہیں ہیں۔

جدید علوم کے جن مالی وسائل کی ضرورت ہے اگر ہمیں وہ حاصل ہو جائیں تو ہم پہلے کی طرح قدیم و جدید دونوں کی اشاعت کا کام انجام دے سکتے ہیں۔

جنوبی ہندستان میں مسلمانوں نے عصری علوم کی اشاعت کے لئے جو مثال قائم کی ہے وہ اس کا ثبوت ہے، البتہ شمالی ہندستان کے مسلمان اس راہ میں پیچھے ہیں۔ جنوبی ہند کی علم دوستی کا ایک نمونہ راقم نے پونہ کے حالیہ سفر (۲/اکتوبر ۲۰۰۳ء) میں اعظم ایجوکیشن کمپلکس کی شاندار عمارت کی صورت میں دیکھا۔ ☆☆

قرآن میں تفکر و تعقل کی دعوت اور نتیجہ خیز تفکر کا طریقہ

مولانا آزاد علیہ الرحمۃ نے تفکر اور تعقل کو قرآن کریم کے طریق استدلال کا اولین مبداء قرار دیتے ہوئے لکھا ہے: قرآن کریم تاریخ مذاہب میں وہ پہلی کتاب ہے جس نے خدا کی صفات وافعال کے لیے عقلی تصور قائم کیا اور اس حقیقت کو واضح کیا کہ حکمتوں اور مصلحتوں کی رعایت خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حاکمیت مطلقہ کے خلاف نہیں۔

قرآن کریم نے اپنی تعلیمات و ہدایات میں اس حقیقت کی جگہ جگہ وضاحت کی کہ جہاں ایمان وعقیدت کے حصول کے لیے ایمان بالغیب کی ضرورت ہے وہاں حقیقت شناسی کی راہ عقل و بصیرت سے کام لینا ہے اور عقل وفکر کی قوت کو استعمال کرنا ہے۔ مولانا مرحوم کے سامنے غور وفکر سے متعلق سورہ آل عمران (۱۹۰) کی مشہور آیت ہے اور اس آیت کی تفسیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے۔

احادیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کے وقت اٹھ کر سورہ آل عمران کی آخری دس آیتوں کی تلاوت فرماتے۔ ان دس آیتوں میں پہلی آیت یہ ہے جس میں ذکر الٰہی اور تفکر وتعقل کو عقل سلیم اور فہم مستقیم رکھنے والوں کی صفت بیان کیا گیا ہے۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. (آل عمران ۱۹۵) ''بلاشبہ آسمانوں اور زمین میں عقل مندوں کے لیے قدرت الٰہی کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں، یہ عقل مند لوگ وہ ہیں جو بیٹھتے اٹھتے اور کروٹوں پر لیٹے خدا تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش وتخلیق میں غور وفکر کرتے ہیں اور زبان حال۔ سے اس حقیقت کا اعتراف (عملی طور پر) اور زبان قال سے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ اے پروردگار عالم! تو نے اس نظام عالم کو بے مقصد اور بے فائدہ پیدا نہیں کیا۔ یعنی اس نظام کائنات کے ہر ذرہ میں اہل دنیا کے کام آنے والی چیزیں پوشیدہ ہیں۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں ایک دن اپنی خالہ حضرت میمونہؓ زوجہ رسولؐ کے گھر میں سویا تا کہ حضور کی شب بیداری کی حالت معلوم کرسکوں۔ چنانچہ آپ نے بستر سے اٹھ کر پہلے آسمان کی طرف دیکھافنظر الی السماء، پھر مذکورہ آیات کی تلاوت کی اور پھر تہجد گیارہ رکعتیں پڑھیں۔

حضورؐ نے اہل عقل کی دونوں صفتوں پر عمل کیا آسمان کی طرف دیکھ کر خدا تعالیٰ کی عظیم قدرت وحکمت کا شعور اور احساس بیدار کیا اور پھر ذکر الٰہی کے لیے کھڑے ہوگئے اور روح کو اس کی غذا پہنچائی۔

قرآن علوم قدیم اور جدید دونوں کا حامل ہے

قرآن آسمانی کتابوں میں آخری کتاب ہونے کے تعلق سے قدیم اور جدید دونوں قسم کے علوم کا حامل ہے۔ علوم قدیم کے لیے قرآن ایمان بالغیب کا حکم دیتا ہے اور علوم جدید کے لیے نظام فطرت پر غور وفکر کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور غور وفکر کے ذریعہ پوشیدہ علمی حقائق کے انکشاف کا راستہ بتاتا ہے۔

قرآن، احادیث اور اقوال صحابہ وتابعین میں جس تفکر کی فضیلت بیان کی گئی ہے اس تفکر کے وسیع مفہوم میں دین اور دنیا دونوں شعبوں میں غور وفکر مراد ہے جیسا کہ سورہ بقرہ آیت (۲۲۰) میں کہا گیا: کذلک یبین اللہ لکم الآیات لعلکم تتفکرون فی الدنیا والآخرۃ ''اسی طرح اللہ آیات، احکام، نشانات وانعامات بیان کرتا ہے اور ظاہر کرتا ہے تا کہ اے لوگو! تم دین اور دنیا کے معاملات پر غور وفکر کرو۔'' دین اور دنیا کے معاملات سے قدیم وجدید کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔

جدید فلسفہ وسائنس پر آیات قرآنی کا انطباق!

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن کی پہلی جلد الفاتحہ میں تفسیر بالرائے کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''یا مثلاً قرآن کے طریق استدلال کو منطقی جامہ پہنانا یا جہاں کہیں آسمان اور کواکب ونجوم کے الفاظ آگئے ہیں ان پر علم ہیئت کے مسائل چپکانے لگنا ہے، یقیناً تفسیر بالرائے ہے۔ یا مثلاً آج کل ہندستان اور مصر کے بعض دانش فروشوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ بقول ان کے زمانہ حال کے اصول علم وترقی قرآن سے ثابت کئے جائیں یا بقول ان کے فلسفہ وسائنس کا ہر مسئلہ قرآن سے ثابت کیا جائے، گویا قرآن صرف اس لیے نازل ہوا ہے کہ جو بات کوپرنیکس (سائنس داں کا نام) یا ڈارون اور ویلس نے بغیر کسی الہامی کتاب کی فلسفہ اندیشیوں کے دریافت کرلی اسے چند صدی پہلے معموں اور

بجھارتوں کی طرح دنیا کے کان میں پھونک دے اور پھر وہ بھی صدیوں تک دنیا کی سمجھ میں نہ آئیں یہاں تک کہ موجودہ زمانے کے مفسر پیدا ہوں اور تیرہ سو برس پہلے کے معمے حل فرمائیں۔ یقیناً یہ طریق کار ٹھیک ٹھیک تفسیر بالرائے ہے۔ (ص:۲۷)

دونوں قسم کے تفکر میں فرق؟

امور ملکوت (مابعد الطبعی امور) پر غور وفکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان امور کی صداقت اور صداقت کے دلائل پر غور کیا جائے تاکہ ان پر ایمان بالغیب لانا آسان ہو اور بن دیکھے اور بن سمجھے ایمان لانے کے باوجود ایمان لانے والے کو شرح صدر حاصل ہو جائے۔ کیونکہ ملکوتی امور کی حقیقت کو سمجھنا عقل انسانی کے لیے مشکل ہے، عقل کی رسائی عالم بالا کے معاملات تک نہیں ہو سکتی البتہ ان معاملات کو عقلی امکان سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔

امور طبعی اور نظام فطرت پر غور وخوض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نظام فطرت کے پوشیدہ حقائق پر غور کیا جائے جو عقل انسانی کے لیے آسان ہے اور اس غور وفکر کے ذریعہ وہ حقائق فطرت ظاہر اور منکشف کیے جائیں تاکہ اہل دنیا ان سے فائدہ اٹھائیں۔ عقل سے ماوراء اور عقل کے خلاف کا مطلب بیان کرتے ہوئے مولانا آزاد نے لکھا ہے: وہ ملکوتی امور (وجود خدا، وجود وحی وملائکہ) جن کا امکان انسانی دماغ وعقل میں آسکتا ہے عقل کے مطابق ہیں، اس میں سے کوئی بات بھی خلاف عقل نہیں البتہ اس کا کیا علاج کہ خود تمہاری عقل راہ خلاف میں گم ہے، تم نے تو آج تک یہ موٹی سی بات بھی نہ سمجھی کہ کسی بات کے ماورائے عقل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خلاف عقل بھی ہو۔ (افکار آزاد ص:۱۲۶)

خالق کائنات کی وحدانیت!

قرآن آیت الٰہی پر غور کرنے کی دعوت جہاں جہاں دیتا ہے وہاں آیات الٰہی کے مختلف مظاہر سامنے رکھتا ہے، خدا تعالیٰ کی قدرت، اس کی حکمت اور رحمت، یہ خدا تعالیٰ کی صفات کا ظہور ہے۔ اس ظہور صفات سے اس کی ذات کا یقین پیدا ہوتا ہے۔ خود انسان کے وجود اور اس کی تخلیق میں اس کے پیدا کرنے والے کی کمل قدرت اور کمل حکمت نظر آتی ہے۔ اولم یتفکروا فی انفسھم (روم ۱۸) کیا وہ لوگ خود اپنے اندر کی حقیقتوں پر غور نہیں کرتے تاکہ اس خالق حقیقی کی وحدت اور قدرت کا یقین ان کے دل میں پیدا ہو۔"

نبوت محمدی کی صداقت پر غور وفکر کی دعوت

خدا تعالیٰ کی توحید مذہب حق کی بنیادی تعلیم ہے، قرآن کریم میں توحید ذات وصفات پر ہر سورہ کے اندر دلائل پیش کیے گئے لیکن نبوت محمدی کی صداقت پر غور وفکر کی دعوت کے ساتھ نتیجہ خیز تفکر کا طریقہ بھی سکھایا گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبوت محمدی کی صداقت دین برحق کی بنیادی تعلیم کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے، سورہ سباء (۴۶) پر غور کیجئے، فرمایا گیا: قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ٥ (سبا ۴۶) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت نبوت پر سورہ سبا کی یہ آیت بڑی اہم ہے، پہلے اس کا واضح ترجمہ دیکھو۔ ''اے رسول! تم ان مکہ والوں سے کہو کہ اے لوگو! میں تمہیں بس ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم برائے خدا (کسی غرض کے تحت نہیں) اس بات کے لیے ہمت کے ساتھ تیار ہو جاؤ، الگ الگ ایک ایک آدمی اور دو دو آدمی مل کر (اجتماعی طور پر) غور کرو اور تحقیق کرو کہ تمہارے ہر وقت کے ساتھی محمدؐ میں کونسی بات اور کونسی ادا دیوانہ پن کی ہے؟ حقیقت تو یہ ہے (جو خلوص کے ساتھ غور وفکر کرنے کے بعد ظاہر ہوگی) کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو صرف قیامت سے پہلے اس کے عذاب شدید سے ڈرانے والے ہیں۔'' تمام مترجم حضرات نے (ما بصاحبکم) کے ما کا ترجمہ مائے نفی کے ساتھ کیا ہے اور تفسیر کا ایک قول ما کو استفہامیہ قرار دے رہا ہے اور تفکر کی دعوت سے استفہام کا تعلق واضح ہوتا ہے جو اوپر کے ترجمہ میں کیا گیا ہے، اسی طرح اس جگہ قوموا (قیام) کا مفہوم کھڑا ہونا نہیں ہے بلکہ پوری طرح تیار ہونا، ہمت کے ساتھ غور وفکر کرنا مراد ہے اور کمزوری اور لاپروائی کی نفی کرنا مقصود ہے۔

رسول پاک قریش مکہ کے لیے کوئی اجنبی آدمی نہ تھے، کوئی باہر کے پردیسی نہ تھے، بلکہ ان کی قوم وقبیلے کے آدمی تھے جو نبوت ملنے سے پہلے چالیس سال تک ان کے ساتھی اور رفیق رہے۔

پھر پیغام توحید سناتے ہی وہ دیوانہ اور پاگل کیسے ہو گئے؟ قرآن اہل مکہ کو بالکل خالی الذہن ہو کر، ہر قسم کے تعصب سے الگ ہو کر الگ الگ ہر شخص کو دو چار مل کر اجتماعی طور پر غور وفکر کرنے کی اور تحقیق کرنے کی دعوت دے رہا ہے، بے دلی اور لاپروائی کے ساتھ نہیں بلکہ خلوص کے ساتھ، ہمت اور مضبوطی سے غور وفکر کرنے اور تحقیق کرنے کی طرف بلا رہا ہے۔

اسی مفہوم کی آیت سورہ اعراف (۱۸۴) ہے، فرمایا گیا: اولم یتفکروا مابصاحبھم من

جنۃ ان ھو الا نذیر مبین ''کیا ان مخالفین نے غور وفکر سے کام نہ لیا، جوان پر ظاہر ہوتا کہ ان کا ہر وقت کا رفیق (محمدؐ) دیوانہ نہیں ہے بلکہ وہ تو صاف صاف خبردار کرنیوالا ہے۔'' اس آیت میں مابصاحبھم کے اندر مائے نفی ہی مناسب حال معلوم ہوتا ہے۔

نبوت کے خصائص پر غور کرنے کی دعوت!

قرآن نے سورہ انعام (۵۰) میں نبوت کے خصائص پر توجہ دلاتے ہوئے نبوت کی حقیقت پر غور کرنے کی دعوت دی اور کہا کہ باوجود ظاہری طور پر ایک انسان ہونے کے رسول پاک علیہ السلام کو عام انسانوں کے مقابلے میں ذہنی، فکری اور روحانی قوتوں کے اندر کتنی امتیازی حیثیت حاصل ہے اس پر غور کرو۔ قل ھل یستوی الاعمی والبصیر افلاتتفکرون ''اے نبی! تم ان مخالفین سے کہو کہ کیا ایک اندھا اور دیکھنے والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟'' تم لوگ اس بات پر غور کیوں نہیں کرتے؟ ایک نبی اور عام انسان کے درمیان یہی فرق ہے اور یہ فرق ہر دیکھنے اور سمجھنے والے کو معمولی غور وفکر کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر تعصب کے اندھیرے نے مخالفین کو گمراہی میں ڈال رکھا تھا۔

حضورؐ کی زبان سے تعقل کی دعوت!

قرآن کریم نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان کرایا، قل لو شاء اللہ ماتلوتہ علیکم ولا ادراکم بہ فقدلبثت فیکم عمرا من قبلی افلا تعقلون (یونس ۱۶) ''اے رسول محترم! تم کہو کہ اگر میری نبوت کے بارے میں خدا کا فیصلہ نہ ہوتا تو میں نہ تو تمہیں قرآن سناتا اور نہ اس قرآن کی میرے ذریعہ خبر کرتا، میں نے تو تمہارے اندر ایک لمبی عمر گزاری ہے کیا تم لوگ اتنی سی بات پر بھی غور نہیں کرتے؟''

حضورؐ کو چالیس سال گزر جانے پر اکتالیسویں سال نبوت عطا کی گئی، مولانا ابوالکلام آزاد نے اتنی عمر گزرنے پر جو تشریح تحریر کی ہے وہ ترجمان القرآن کی خصوصیات میں داخل ہے، لکھتے ہیں: ''تمام علماء اخلاق ونفسیات کا متفقہ فیصلہ ہے کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس برس کا زمانہ اس کے اخلاق وخصائل کے ابھرنے اور بننے کا اصلی زمانہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس عرصہ میں جو سانچا بن گیا، پھر بقیہ زندگی میں وہ بدل نہیں سکتا۔ پس اگر ایک شخص چالیس برس کی عمر تک صادق وامین رہتا ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب ومفتری بن جائے کہ انسانوں پر ہی نہیں فاطر السموات والارض پر افتراء کرنے لگے؟ (ترجمان القرآن: دوم ۱۵۲) خدا تعالیٰ نے قرآن کی جلالت

شان کا حوالہ دے کر سورہ حشر (۹۱) میں غور وفکر کی دعوت دی۔ موت وزندگی کے فطری قانون کا حوالہ دے کر مکافات عمل کی صداقت پر سورہ غاشیہ (۱۳) میں غور وفکر کی دعوت کی۔ سورہ روم (۲۱) میں مرد اور عورت کی تخلیق اور اس کے ازدواجی تعلق کے حوالہ سے انسانی معاشرہ کے بقا اور ارتقاء کی خداوندی مصلحت پر غور وفکر کرنے کی دعوت کی گئی۔

نتیجہ خیز تفکر کا فارمولہ

قرآن کریم نے سورہ سباء (۴۶) میں کامیاب، تفکر وتعقل کا فارمولہ بیان کیا ہے جو انسان کو کسی نتیجہ پر پہنچانے میں مدد دیتا ہے، یعنی (۱) ذہن کو ہر قسم کے تعصب سے خالی کر کے عقل وفکر سے کام لیا جائے، (۲) غور وفکر ہر شخص الگ الگ بھی کرے اور چند آدمی مل کر بھی غور وفکر اور تحقیق حال کی جستجو کریں (۳) غور وفکر بے دلی اور لاپروائی کے ساتھ نہ ہو بلکہ پوری سرگرمی اور سرگرم ہمت کے ساتھ کیا جائے۔ ان شرطوں کے ساتھ جس کسی مسئلہ اور معاملہ پر غور وفکر کیا جائے گا تو اس میں مشیت الٰہی مدد کرے گی اور لوگوں کے سامنے صحیح نتیجہ ظاہر ہو جائے گا۔

خالق کائنات حکیم ہے

قرآن کریم خدا تعالیٰ کو حکیم وعلیم کہتا ہے اور لوگوں کو خدا تعالیٰ کے لیے علم اور حکمت کی صفات پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے۔ حکیم کا کوئی قول حکمت سے خالی نہیں، یہ مشہور قول ہے، پس اس خالق کائنات کو حکیم وصاحب حکمت ماننے کا تقاضا قرار پاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی عطا کردہ شریعت اور اس کی کائنات پر غور وفکر کیا جائے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اسی قرآنی حکم کی تعمیل کرنے اور جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیات (۱۱۹) کی تفسیر میں بیان کیا گیا ہے حضور علیہ السلام آسمان کی طرف بنظر غور دیکھتے اور مذکورہ آیات کی تلاوت فرماتے۔

اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے نازل ہونے والے کلام اور قرآن کریم پر بھی غور وفکر کرتے اور اس کے معارف سے مسلمانوں کو آگاہ فرماتے جیسا کہ آپ نے ایک صحابی کو سفید وسیاہ دھاگے کا مطلب سمجھایا اور بتایا کہ یہ استعارہ ہے، جب کہ صحابی اس استعاراتی کلام کو لغوی مفہوم میں لے کر اس پر عمل کرنا چاہتے تھے۔

خدا تعالیٰ عزیز الحکیم ہے

قرآن کریم نے (۵۲) مقامات میں خدا تعالیٰ کو حکیم کی صفت سے یاد کیا ہے اور ان (۵۲)

مقامات میں (۲۴) جگہ انہ ھو العلیم الحکیم ہے یعنی حکمت کے ساتھ علم کی صفت لگائی گئی ہے اور (۲۹) جگہ انہ ھو العزیز الحکیم ہے یعنی قوت وغلبہ کی صفت کے ساتھ حکمت کی صفت بیان کی گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ علم اور حکمت لازم وملزوم ہیں، جو ذات علم کامل سے متصف ہوگی وہ صاحب حکمت ومصلحت بھی ہوگی اور صاحب حکمت وہی ہوگا جو صاحب علم بھی ہو، البتہ قوت کے ساتھ حکمت کا کیا جوڑ ہے؟ تفسیر قرآن کا یہ ایک نازک مسئلہ ہے اور میں اہل علم کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ کسی عربی اردو تفسیر میں اس سوال کا جواب تلاش کر کے اس ناچیز کو مطلع کریں۔

ترجمان القرآن کی انفرادیت!

اس تفسیری سوال کا جواب مولانا آزاد نے اپنی تفسیر الفاتحہ میں دیا ہے اور تعقل وتفکر کی دعوت کے تحت دیا ہے۔ مولانا آزاد نے قرآنی الفاظ العزیز الحکیم کا حوالہ نہیں دیا، لیکن ان آیات پر جو سوال قائم ہوتا ہے اس سوال کا جواب تفکر وتعقل کی بحث کے ضمن میں بڑی تفصیل سے دیا۔ مولانا کے اپنے الفاظ میں اس پر غور کیجئے۔ ”نزول قرآن سے پہلے تمام پیروان مذاہب نے دنیا کی پیدائش کا جو نقشہ کھینچا تھا، وہ حکمت ومصالح کے تصور سے یک قلم خالی تھا۔ لوگ خیال کرتے تھے کہ طاقت واختیار کے ساتھ حکم ومصالح کی رعایت جمع نہیں ہوسکتی۔ حکم ومصالح کی پابندی وہی کرے گا جو کسی کے آگے جوابدہ ہو۔ خدا جو سب سے بڑا اور سب پر حکمراں ہے، اس کے کام حکم ومصالح سے کیوں وابستہ ہوں؟ وہ مطلق العنان بادشاہوں کو دیکھتے تھے کہ جو جی میں آتا ہے کر گزرتے ہیں اور ان کے کاموں میں چوں چرا کی گنجائش نہیں ہوتی، پس سمجھتے تھے کہ خدا کے کاموں کا بھی یہی حال ہے چنانچہ ہندوستان، مصر، بابل، اور یونان کی تمام علم الاصنامی روایات اسی تخیل کا نتیجہ ہیں۔ دیوتاؤں نے عشق بازی میں رنگ رلیاں منائیں اور ستارے پیدا ہوگئے۔ کسی دیوتا نے شکار کھیلتے ہوئے تیر مارا۔ پہاڑ پیدا ہوگیا۔ ایک دیوتا نے اپنی جٹا کھول دی، دریا وجود میں آگیا۔ اصنام پرست اقوام کے علاوہ یہود اور عیسائیوں کے خیالات بھی اس بارے میں عقلی تصورات سے خالی تھے۔ یہودیوں کا خیال تھا کہ ایک مطلق العنان اور مستبد بادشاہ کی طرح خدا کے افعال بھی حکم ومصالح کی جگہ محض جوش وہیجان کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ وہ غصہ میں آکر قوموں کو ہلاک کر دیتا ہے۔ اور جوش محبت میں آکر کسی خاص قوم کو اپنی چہیتی قوم بنالیتا ہے۔ بلاشبہ عیسائی تصور کا مایۂ خمیر رحم ومحبت ہے۔ لیکن حکم ومصالح کے لئے اس میں بھی جگہ نہ تھی۔ کفارہ کے اعتقاد کے ساتھ حکم ومصالح کا اعتقاد نشوونما نہیں پاسکتا تھا۔

قرآن تاریخ مذاہب میں پہلی کتاب ہے جس نے خدا کی صفات وافعال کے لئے عقلی تصور قائم کیا، اور یہ حقیقت واضح کی کہ حکم ومصالح کی رعایت منافی قدرت نہیں ہے بلکہ محاسن قدرت میں سے ہے۔ بلاشبہ خدا جو کچھ چاہے کرسکتا ہے، لیکن اس کی حکمت وعدالت کا مقتضا یہی ہے کہ جو کچھ کرتا ہے، حکمت ومصلحت کے ساتھ کرتا ہے۔

اسی اصل کا نتیجہ ہے کہ اس نے تخلیق کائنات کا بھی جو نقشہ کھینچا، وہ سرتاسر عقلی نقشہ ہے یعنی حکمت وعلت اور نظم واتقان کا نقشہ ہے اور اس لئے اس نے جابجا "تخلیق بالباطل" کے خیال کو کفر کی طرف نسبت دی ہے۔: وما خلقنا السماء والارض وما بینھما باطلا ذلک ظن الذین کفروا (۳۸:۱۷) ہم نے آسمان وزمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بغیر حکمت ومصلحت کے نہیں بنایا ہے۔ یہ خیال کہ ہم نے بغیر حکمت ومصلحت کے پیدا کیا ہو، ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا (الفاتحہ ۲۴)

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عام طور پر مذہبی دنیا میں یہ خیال پھیلا ہوا تھا کہ قوت اور حکمت ومصلحت دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے جیسا کہ اہل دنیا کو سیاسی حکمرانوں کی زندگی میں نظر آرہا تھا۔ قرآن نے العزیز الحکیم کہہ کر یہ واضح کیا کہ خدا تعالیٰ کی ذات اقتدار وقوت کی مالک ہونے کے باوجود اپنے فیصلوں میں حکمت اور مصلحت سے کام لیتی ہے۔ قہر اور جبر سے کام نہیں لیتی۔ ☆



مسلمانوں کی علمی ترقی کا پانچ سو سالہ دور

تاریخ شاہد ہے کہ موجودہ جدید عہد ترقی کی بنیاد میں مسلمان علماء اور مفکرین کی زبردست علمی جدوجہد اور مسلمان امراء کی مالی اور سیاسی سرپرستی کا بڑا حصہ ہے۔ البتہ اس عہد جدید میں بقول علامہ اقبال ''دانش افرنگ'' کا جو حصہ ہے وہ اس عنوان سے خارج ہے۔ وہ ہے سائنسی تجربات کا غلط استعمال، جس نے موجودہ تہذیب فرنگ کو جنم دیا۔ علامہ کہتے ہیں:

چیتے کا جگر چاہیے شاہیں کا تجس

جی سکتے ہیں بے روشنی دانش افرنگ

خداوند عالم کی سب سے بڑی نعمت عقل و حکمت کی محنت و ریاضت نے آسمان و زمین کی جن بیش قیمت طاقتوں سے نسل انسانی کو مالا مال کیا اس کا استعمال اگر نسل انسانی کی عزت و آزادی کے سلب کرنے کے لئے کیا جاتا ہے تو اس سوچ و فکر کا نام دانش افرنگ ہے اسی اعتبار سے علامہ اقبال نے بطور طنز اس فکر کو فکر گستاخ سے تعبیر کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو

اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

مسلمان اہل سائنس

مسلمان اہل تفکر و تعقل نے جن کا اجمالی تعارف آگے آرہا ہے عقلی علوم میں ترقی کر کے دنیا میں جو انقلابات برپا کیے، ان کا اعتراف کرتے ہوئے مشہور مغربی مورخ رابرٹ بریفالٹ اپنی شہرہ آفاق کتاب "Making of Humanity" میں لکھتا ہے:

''یورپ کی حقیقی نشاۃ ثانیہ پندرھویں صدی عیسوی میں نہیں، بلکہ عربوں کی احیائے ثقافت کے زیر اثر وجود میں آئی، جدید یورپ کی پیدائش کا گہوارہ اٹلی نہیں، اسپین تھا۔ جس زمانہ میں پورا براعظم یورپ جہالت و بربریت کے تعر مذلت میں گرا ہوا تھا، اس زمانہ میں عربی دنیا کے شہر:

بغداد، قاہرہ، قرطبہ اور طلیطلہ تہذیبی اور علمی سرگرمیوں کے مراکز بن چکے تھے۔"

جرمنی سفیر کا اعتراف

ابھی حال (۲۹ نومبر ۲۰۰۳ء) کو جرمنی حکومت کے سفیر ڈاکٹر مولاک نے دلی کی جامع مسجد میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

"اسلام نے یورپ کو سائنس اور طب کے میدان میں بہت کچھ دیا ہے اور پورا یورپ اس میدان میں مسلمانوں کا مرہون منت ہے (قومی آواز ۳۰ نومبر)"

تفسیر قرآن اور احادیث نبوی کی تحقیق و تنقید میں علماء حق محدثین اور فقہاء نے جو بے مثال جدوجہد کی اس کا مطالعہ ایک مستقل موضوع ہے، اسماء الرجال کا فن، امام بخاری کی تحقیق روایات، احکام میں، علامہ ابن کثیر دمشقی کی تحقیق، تفسیری روایات میں محققین علماء کے بے مثال کارناموں کی عظیم یادگار ہے۔ پیش نظر مضمون میں عقلی علوم میں علوم وفن کی جدوجہد کا تعارف کرایا گیا ہے۔

اموی اور عباسی حکمرانوں کی مشترکہ کوشش

تاریخ کا یہ فیصلہ ہوا کہ اسلام کا عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ اسلام کی نظریاتی اور سیاسی بنیاد مضبوط کرنے میں گذرے، عہد رسالت (۲۳) سال کے علاوہ یہ دور چالیس سال کا رہا۔ اس دور خلافت کے بعد اسلام کے سیاسی اقتدار کو وسیع کرنے کے لیے تاریخ نے عرب کے مشہور سیاسی قبیلہ بنی امیہ کو مسند حکومت پر بٹھایا اور اس خاندان کے مختلف حکمرانوں نے ۹۲ سال ۴۱ھ (۶۶۱ء) سے ۱۲۳ھ (۷۴۰ عیسوی) تک حکومت کی اور اسلام کے سیاسی اقتدار کو مشرق کی طرف سندھ اور چینی ترکستان تک پھیلایا اور شمال میں بحر خزر، آذربائیجان اور باڈروم تک اور مغرب میں اندلس تک اسلام کے اثرات قائم کئے۔ سیاسی استحکام کے بعد تاریخ کا یہ فیصلہ ہوا کہ عرب کے سیاسی قبیلہ بنی امیہ اور قریش کے علمی قبیلہ بنی عباس کی مشترک کوششوں سے قدیم علوم (کتاب وسنت) کے ساتھ عقلی علوم کی ترویج و تحقیق کا کام آگے بڑھے اور مسلمان قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق دینی اور عقلی علوم میں آنے والی دنیا کی قیادت کا فرض انجام دیں۔ اور ارباب سیاست بنی امیہ اور علم دوست بنی عباس کے حکمراں اور اصحاب ثروت دونوں مل کر اس قیادت کو سنبھالیں اور انہوں نے خوب سنبھالا اور مسلم دنیا میں بنی عباس نے اور اسپین (ہسپانیہ) میں بنوامیہ نے مسند اقتدار پر بیٹھ کر عقلی علوم کی ترقی کو بام عروج پر پہنچادیا۔

پوری مسلم دنیا پر بنو عباس کی حکومت ۱۲۳ھ (۷۴۰ء) سے ۱۳۸ھ (۷۵۵ء) ساڑھے پانچ

سو سال قائم رہی اور اس سے پہلے مسلم دنیا سے بنی امیہ کا اقتدار سمٹ کر عیسائیت کے اہم ترین حصہ اسپین پر قائم ہوا اور اسپین پر بنی امیہ نے ۱۲۴ہجری (۷۴۵عیسوی) سے ۱۳۸ہجری (۷۵۵عیسوی) تک ساڑھے سات سو سال حکومت کی۔

مورخین عام طور پر اس دور کے مسلم حکمرانوں اور حکمراں خاندانوں کی باہمی خانہ جنگیوں کا تذکرہ کرتے ہیں، اس سے انکار نہیں لیکن اس دور کا جو روشن پہلو ہے وہ ہمارے مورخین کا موضوع بحث کیوں نہیں بنتا؟ حیرت کا مقام ہے کہ خوفناک اور افسوسناک خانہ جنگیوں کے باوجود عرب خاندانوں اور قریش کے مختلف قبائل کے اہل علم اور اہل ثروت نے علوم وفنون کی ترقیات میں جو حصہ لیا دوسری قومیں ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتیں۔ اس موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد گرامی یاد آتا ہے جس میں آپ نے قریش عرب کی علمی اور سیاسی اور فوجی صلاحیت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

الأئمة من قريش، قیادت اور رہنمائی قریش عرب کا حق ہے، اس اعلان میں رسول پاکؐ نے قریش کے نسلی اور قومی عزت کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ ان کی صلاحیت واہلیت کا اظہار فرمایا: بلاشبہ اسلامی تصورات (توحید ومساوات) اور اسلامی عبادات واخلاق کے نہایت معقول، مضبوط اور مقبول عند اللہ نظام کا بھی اس میں دخل ہے بلکہ بڑی حد تک دخل ہے۔

بہر حال مسلمانوں کی علمی اور عقلی ترقیات، دینی علوم، قرآن، حدیث وفقہ میں غور وخوض کے نتائج اور عقلی علوم، آسمان وزمین کے نظام قدرت میں تفکر وتدبر کے نتائج کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے اس وقت کی صاحب اقتدار عیسائی قوموں اور ان کی مذہبی قیادت کلیسا کی جہالت کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری اور آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں کلیسائے مسیح دینی معاملات، انجیل کو سمجھنے میں اور نظام فطرت پر غور وخوض کرنے میں اتنی شدید جہالت میں گرفتار تھی کہ کلیسا کی طرف سے جدید غور وفکر کرنے والوں پر کفر و بے دینی کا فتویٰ لگایا جاتا تھا اور ایسے لوگوں کو گردن زدنی قرار دیا جاتا تھا اور گردن زدنی کے واقعات رونما ہوتے تھے، (زوال روما)

عقلی جمود وتعطل کا یہی حال زار عیسائیوں کے علاوہ فارس کے زرتشتیوں اور آتش پرستوں اور ہندوستان کے برہمن طبقہ کا تھا۔ یہود کی حالت اس معاملہ میں بد سے بدتر تھی۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین کا دور ہو یا اس دور کے بعد بنی امیہ اور بنی عباس کی خاندانی حکومتوں کا پانچ چھ سو سالہ عہد ہو اس نے اپنی اندرونی قبائلی عصبیتوں اور رقابتوں کے باوجود

سیاسی اور علمی عروج کی جو تاریخ مرتب کی وہ حضور علیہ السلام کے مذکورہ بالا ارشاد گرامی کی تصدیق کرتی ہے۔

صلیبی حملوں کی یلغار

پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) میں جب عباسی حکمراں عیش پرستی میں مبتلا ہو گئے تو جو قومی سرمایہ علمی ترقیوں پر صرف ہو رہا تھا وہ مادی عیش پرستی پر صرف ہونے لگا۔ اس کے نتیجہ میں ایک طرف علمی زوال کا آغاز ہوا اور دوسری طرف عیسائی حکومتوں نے (صلیبی) حملے شروع کردیے۔ یہ حملے دوسو سال جاری رہے اور سلجوقی اور کرد مجاہدین (سلطان ارسلان، نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی) کی قیادت میں مجاہدین اسلام نے مسیحی طاقتوں کو عبرتناک شکست سے دوچار کردیا۔

یہ ساتویں صدی ہجری (۶۹۰ھ) اور تیرھویں صدی عیسوی (۱۲۹۱ء) کا دور تھا، ان اہل یورپ عیسائیوں نے مسلمانوں کی تلوار سے شکست کھا کر علمی اور تحقیقی جدوجہد کا میدان اختیار کرلیا کیونکہ یہ میدان مسلمانوں سے خالی ہو چکا تھا، اس طرح یورپ نے علمی ترقی کے ہتھیار سے مسلمانوں کو محکوم بنالیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح لکھا ہے کہ ملت مسلمہ کے زوال کی ذمہ داری سے اہل علم بری ہیں، یہ ذمہ داری اصحاب اقتدار و اختیار پر عائد ہوتی ہے جو مسلمانوں کے قومی سرمایہ پر قابض تھے۔

مسلمان اہل سائنس کا تعارف

جسٹس سید امیر علی نے اپنی تاریخ (تاریخ اسلام) میں صحیح لکھا ہے کہ کسی قوم کی پانچ سوسالہ ذہنی اور فکری ترقی کی تاریخ چند صفحات میں تحریر کرنی ممکن نہیں، پھر بھی بجا طور پر یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ عربوں نے عالمی ترقی کو فروغ دینے کے لیے جو علمی اور عقلی کارہائے نمایاں انجام دیے وہ کسی دوسری قوم نے انجام نہیں دیے (ص:۳۶۰)۔ تاریخ بتاتی ہے کہ عقلی اور طبعی علوم میں عربوں کی ترقی کا دور تیسری اور چوتھی صدی ہجری کا دور تھا، خاص طور پر چوتھی صدی میں عربوں کی عقلی اور علمی ترقی معراج کمال کو پہونچی ہوئی تھی۔ یہ دور (آٹھویں اور نویں صدی عیسوی) اہل یورپ کی جہالت کا دور تھا ان دو صدیوں میں جن اہل کمال نے جنم لیا ان کا اجمالی تعارف کرایا جاتا ہے۔

منصور عباسی کا دور عباسی حکومت کا ابتدائی دور تھا، اس کے عہد حکومت میں علم ہیئت اور فلکیات کے ماہر ماشاء اللہ احمد ابن محمد نہاوندی پیدا ہوئے مامون الرشید کے دور حکومت میں سند ابن علی یحییٰ ابن منصور اور خالد ابن عبدالملک علم ہیئت کے امام پیدا ہوئے۔

ابوموسیٰ جابر ابن حیان تیسری صدی کا مشہور ماہر کیمیا (کیمسٹ) تھا، چوتھی صدی کی مشہور

شخصیت ابوبکر رازی کی ہے جو اپنے دور کا عظیم طبیب اور کیمسٹری اور طبعیات کا بڑا ماہر تھا۔ اسی صدی کی مشہور شخصیت علی حزیں کی ہے جو روشنی (نور) کے حقائق کا ماہر تھا، اس کی اہم کتاب کا جو اسی موضوع پر تھی لاطینی زبان میں (۱۲۷۰ء) ترجمہ ہوا۔

بخارا کی تاریخی عظمت

سرزمین بخارا نے تیسری صدی (۲۵۶ھ) میں علم حدیث کے بڑے محقق محمد ابن اسماعیل بخاری کو جنم دیا جنہوں نے احادیث نبوی میں پھیلائی گئی غلط احادیث کو صحیح احادیث سے الگ کر کے علم حدیث کی مشہور کتاب بخاری شریف ترتیب دی۔ اس سرزمین کا یہ کرشمہ تھا کہ اس نے امام بخاری سے ایک سو سال کے بعد شیخ الرئیس بوعلی سینا کو کھڑا کیا جس نے ۱۲ سال کی عمر میں قرآن حفظ کر کے (۱۸۔۱۹) سال کی عمر تک جملہ علوم سے فراغت حاصل کی اور خاص طور پر علم طب میں شہرت دوام کی مسند پر جلوہ افروز ہوا یہ فلسفہ کا بھی بڑا ماہر تھا۔

ابن سینا کی مشہور کتابوں میں قانون (تین جلدوں میں) فن طب کی لاثانی کتاب ہے، ابن سینا نے (۱۵۳۰ء) میں ہمدان میں وفات پائی فلکیات اور جغرافیہ کے امام البیرونی کی صدی (۳۶۱ھ) چوتھی صدی ہے حسن ابن ہیثم اسی صدی کی مشہور شخصیت ہے، حسن نے فضائی تحقیقات میں کمال پیدا کیا اور علم ہیئت اور علوم بصریات میں بڑی شہرت حاصل کی، یہ باکمال شخصیت اسپین میں پیدا ہوئی اور زندگی کا بڑا حصہ مصر میں گزارا، بصریات (آنکھوں کے امراض) پر حسن ابن ہیثم کی کتابیں عربی سے دوسری زبانوں میں ترجمہ کی گئیں۔

ابن طولون کے عہد میں ابن شاغر اور عمر خیام باکمال ریاضی داں اور ماہرین علم ہیئت تھے، عمر ابن خیام کی زیادہ شہرت اس کی شاعری میں ہوئی۔ اسی صدی نے دنیا کو یعقوب ابن اسحاق الکندی جیسا فلسفہ داں دیا ابونصر فارابی جیسا ماہر علم طب دیا، جسے عرب ارسطو ثانی کہتے ہیں، ابونصر ابن سینا کا استاد تھا۔ مامون کے عہد کا مشہور ماہر علم ہیئت محمد ابن موسیٰ خوارزمی تھا جس نے مامون کے حکم سے سدھانتا کتاب کا ہندی سے عربی میں ترجمہ کیا اور اس کتاب پر اپنے اشارات واعتراضات تحریر کئے الکندی نے جیومیٹری، فلسفہ، بصریات اور علم طب پر دو سو کے قریب کتابیں تحریر کیں ابومعشر جسے عہد وسطیٰ کے اہل یورپ ابوماذر کہتے تھے، فلکیات کے اس ماہر نے آسمانی اور فضائی تحقیقات کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا، اور ابومعشر کے جدول کا علم ہیئت کے بڑے معلوماتی ذرائع میں شمار ہوتا ہے۔ ہارون الرشید کے عہد میں

موسیٰ ابن شاکر بہت با کمال مہندس تھا، موسیٰ کے بیٹوں نے جو مامون، معتصم اور واثق باللہ کے عہد میں تھے انہوں نے اپنے باپ کے علم کو ترقی دی اور سورج اور دوسرے سیاروں کی تحقیقات میں حیرت انگیز انکشافات کئے۔

پانچویں صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کے آخر میں بغداد کے اندر علم فلکیات وہیئت کے دو بڑے ماہر تھے، ایک علی ابن ماجور اور دوسرا ابوالحسن علی ابن ماجور (بنو ماجور مشہور نام) انہوں نے قمری حرکات اور چاند کی گردشوں کے متعلق حیرت انگیز انکشافات سے دنیا کو حیرت زدہ کر دیا چوتھی صدی ہجری کے مشہور علماء فلکیات میں الکوہی اور ابوالوفاء کے نام بھی شامل ہیں، ابوالوفا کخراسان میں پیدا ہوا اور عراق میں اپنی علمی زندگی گزاری، ان ماہرین فلکیات نے سیاروں کی گردش کے بارے میں حیرت انگیز دریافتیں پیش کیں۔

اسی صدی کا ایک بڑا ہیئت داں اور ریاضی داں ابن یونس تھا، اس نے قاہرہ میں وفات پائی۔ اہل یورپ ابن الہیثم کو بابائے بصریات کہتے ہیں ان کی مشہور کتاب آنکھوں کے امراض پر ہے، جس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا گیا ہے۔ دنیا کا پہلا سرجن ابوالقاسم زہراوی تھا، انہوں نے آپریشن کے ذریعہ علاج جاری کیا اور ہزاروں مریضوں کا آپریشن سے علاج کیا زہراوی نے آنکھوں کے موتیابند کا علاج کیا، ہڈیوں کو جوڑنے اور توڑنے کا عمل کیا اور کامیاب ہوئے۔ اندلس کے مشہور حکمراں عبد الرحمٰن الناصر نے زہراوی کو شاہی ہسپتال کا انچارج مقرر کیا۔ زہراوی کی مشہور کتاب ''تصریف'' آپریشن کے علوم پر ایک مکمل کتاب ہے۔ امریکہ کی ایک یونیورسٹی کی دیوار پر جن تین مسلمان علماء سائنس کے نام کندہ ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔ مشہور ماہر علم کیمیا ابوموسیٰ ابن حیان، ابن ہیثم ماہر بصریات (امراض چشم) بوعلی سینا، مشہور فلسفی وطبیب۔ ☆☆

فہرست خطبات وتقاریر ''دورِ جدید اور اسلام''

انسان کے بنیادی حقوق کا اسلامی منشور، دورِ جدید میں اسلام کی افادیت

اہلِ حق اور اہلِ باطل کا پہلا مقابلہ اخلاقی کردار کے میدان میں

رسولِ پاک کے مشن توحید ومساوات کو آج کی دنیا تسلیم کرتی ہے

یہود و نصاری اور ابدی بغض و عداوت؟

دلی میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک جماعت تفسیر قرآن کا مذاکرہ کرتی ہے، اس جماعت کے ایک رکن ڈاکٹر عقیل احمد (چتلی قبر دلی) نے بہت ہچکچاتے ہوئے ایک ملاقات میں مجھ سے سوال کیا کہ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ ہم نے یہود و نصاری میں بغض و عداوت پیدا کر دی ہے جو قیامت تک ان کے اندر رہے گی۔ پھر یہ آج ان دونوں قوموں کے اندر جو اتفاق نظر آ رہا ہے اور مسلمانان عالم کے خلاف یہودیت اور نصرانیت کا متحدہ محاذ سرگرم عمل ہے یہ کیوں ہے، کیا یہ قرآن کے اعلان کی نفی نہیں ہے؟

موصوف نے سورۃ المائدۃ (۱۴) کی تلاوت کی: فَاَغْرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ "یعنی ہم نے (خدا نے) ان یہود و نصاری کے اندر دشمنی اور بغض و عناد پیدا کر دیا ہے۔" پچاس ساٹھ سال سے قرآن کریم اس ناچیز طالب علم کے غور و فکر کا موضوع ہے مگر ڈاکٹر عقیل احمد نے جو سوال کیا وہ میرے لیے بالکل نیا تھا۔

درحقیقت یہ آج کے سیاسی حالات کا نتیجہ ہے، جو شخص کھلے دل و دماغ سے زمینی حالات کو دیکھ رہا ہے اور قرآن بھی اس کے سامنے ہے اس کے ذہن میں قرآن و حدیث اور شریعت اسلامیہ کے بارے میں اس قسم کے سوالات کا پیدا ہونا ایک لازمی بات ہے۔ ڈاکٹر عقیل کا جواب فوری طور پر میرے ذہن میں نہیں آیا، میں نے موصوف کی توجہ دہانی کے بعد قرآن کریم کی آیات متعلقہ پر غور کیا، اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ یہ سوال قرآن کے سرسری مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اور آج کے عالمی سیاسی حالات اس قسم کے سوالات مسلمانوں کے ذہن میں پیدا کرتے ہیں۔ اور یہ سوال خدا جانے کتنے مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہو رہا ہوگا اور یورپ کی یہودی اور عیسائی طاقتوں کا متحدہ محاذ جس طرح مکمل کر مسلم دنیا کو تہ و بالا کرنے پر تلا ہوا ہے، اس صورت حال میں یہ سوال سمجھ بوجھ رکھنے والے مسلمانوں کو بہت بے چین کر رہا ہوگا۔ عربی تفسیریں اس اشکال اور اس کے جواب سے خالی ہیں، البتہ پہلی اردو علمی تفسیر بیان القرآن (۱۹۳۱) میں مولانا تھانویؒ نے اس سوال کا جواب تحریر کیا ہے لیکن اس سے تشفی اور تسلی کا ہونا آسان نہیں

معلوم ہوتا۔

مولانا تھانوی کا دور عیسائی اور یہودی طاقتوں کے اتحاد اور عروج کا دور تھا مگر یہ اتحاد جس ننگی جارحیت کے ساتھ آج سامنے آرہا ہے اس دور میں اس ظالمانہ جارحیت نے اتنا زور نہیں دکھایا تھا۔حضرت تھانوی اور حضرت عثمانی نے عیسائی دنیا کے موجودہ اتحاد کے تعلق سے جو جواب دیا اس کا حاصل یہ ہے کہ موجودہ عیسائی دنیا اپنے مذہب سے بے دین ہو چکی ہے اس لیے ان میں اتحاد نظر آرہا ہے۔سوال یہ ہے کہ یہی اشکال یہودی دنیا کے موجودہ اتحاد کے بارے میں بھی پیدا ہوتا ہے تو کیا وہاں (مائدہ ۶۴) بھی یہی جواب دیا جائے گا کہ آج کے یہودی اپنے مذہب کو چھوڑ چکے ہیں اس لیے وہ متحد نظر آرہے ہیں؟ حالانکہ یہ بات خلاف واقعہ ہے۔

مولانا آزاد کی ترجمان القرآن اور مولانا مودودی کی مختصر تفہیم القرآن اس اشکال اور اس کے جواب سے خالی نظر آرہی ہے۔جواب کی تفصیل سے پہلے مختصر طور پر یہ عرض کیا جارہا ہے کہ (۱) ان آیات (المائدۃ:۱۴۔۶۴) میں قانون فطرت کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے کہ ان قوموں کے اندر جو مذہبی گروہ بندیاں اور عقائد کے اختلاف کی شدت ہے اس کے نتیجہ میں ان کے اندر بغض وعناد کے جذبات پیدا ہوگئے ہیں۔خدا تعالیٰ کو ان قوموں سے ذاتی طور پر کوئی دشمنی نہیں ہے بلکہ یہ ان کے اعمال کا نتیجہ ہے۔قرآن کریم کا یہ اسلوب بیان بہت اہم اور عام ہے کہ قرآن قانون فطرت کو خدا تعالیٰ کا فعل قرار دے کر اپنی بات کو واضح کرتا ہے۔کیونکہ قانون فطرت کا خالق خدا تعالیٰ ہے۔دلوں پر خدا نے مہر لگا دی اور خدا تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے،اس طرح قرآنی آیات میں یہی اسلوب جاری ہے۔

اردو تفاسیر میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اس قرآنی اسلوب کو جگہ جگہ واضح کر کے آیات قرآنی کو اشکالات سے بچایا ہے۔(۲) قرآن کریم نے یہود و نصاریٰ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ تنقید برائے اصلاح اس دور سے تعلق رکھتی ہے جس دور میں اسلام کا ظہور ہورہا تھا،ظہور اسلام کے بعد ان قوموں نے اسلام اور مسلمانوں کو اپنا حریف اور مدمقابل بنالیا۔اسلام نے تو انہیں اہل کتاب اور اہل وحی کہہ کر پکارا اور حضرت ابراہیم کی اولاد کہہ کر انہیں دین ابراہیم کی طرف بلایا مگر اسرائیل (حضرت ابراہیم کے پوتے) کی اولاد نے معاندانہ اور حریفانہ محاذ آرائی شروع کر دی۔اس مقابلہ آرائی کے سبب ان دونوں قوموں میں ذاتی طور پر آپس میں متحد ہونے کا احساس پیدا کر دیا اور آپس کی مذہبی فرقہ بندیوں میں جو شدت تھی اسے ختم کرنے میں اپنی عافیت سمجھی۔

وہیں سے یہودی اپنے اندرونی فرقہ بندیوں کو اور نصاریٰ اپنی اندرونی گروہ بندیوں کو اور پھر دونوں ایک دوسرے کے مقابلے میں پیدا شدہ پرانی دشمنی کو ٹھنڈا کرنے میں مشغول ہو گئے۔ تیسری قوت (اسلام) کے سامنے آنے کے بعد ان اہل کتاب کے اندر پہلی تفرقہ بازی اور اس کے ساتھ پیدا ہونے والے بغض وعناد سے دور رہنے کی کوشش ایک لازمی بات تھی۔ یہود و نصاریٰ کے اندر آج جو اتحاد نظر آ رہا ہے وہ ایک دو دن کی سرگرمیوں کا نتیجہ نہیں بلکہ پچھلی کئی صدیوں کے حالات کا نتیجہ ہے۔

جمہوری دور میں

موجودہ یورپ میں باہمی مذہبی اتفاق کا ایک سبب یہ بھی ہے یورپ نے اپنے لئے سیکولرزم کو اپنا لیا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل مغرب نے مذہب کو اجتماعی زندگی سے بے تعلق کر دیا ہے اور مذہب کو پرائیوٹ اور نجی معاملہ قرار دیا ہے اور اس پالیسی سے مذہب کی اہمیت ختم ہو گئی ہے اور اہل مغرب یہودی ہوں یا عیسائی اجتماعی اور سیاسی معاملات میں متحد نظر آ رہے ہیں۔ یہ اہل مغرب دنیا کی تمام مذہبی قوموں سے یہی مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ اجتماعی زندگی سے اپنے اپنے مذہب کو خارج کر دیں۔ اہل یورپ اور اہل باطل کے اس چیلنج کا جواب دینا مسلمانوں کی ذمہ داری تھی اور ہے کہ مذہب پر قائم رہتے ہوئے باہمی اتحاد و اتفاق دکھایا جائے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیلنج کا جواب دیا اور مسلمانوں کو مذہب پر قائم رکھتے ہوئے متحد و متفق کر کے دکھا دیا۔ پچھلے دور کو چھوڑ دیجئے۔ کیا ہم مسلمان یورپ کے مادہ پرستوں کے اس چیلنج کا جواب دے سکتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم ناکام ہیں۔ ہم نے اپنے مذہبی اختلافات کو اس درجہ شدت میں ڈال دیا ہے کہ اہل باطل کو اس بات کا پورا موقعہ مل گیا ہے اور وہ مسلمانوں سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ مسلمان اپنے مذہب کو اجتماعی اور معاشرتی زندگی سے خارج کر دیں اور یورپ کی طرح مذہب کو ایک گھریلو مسئلہ بنا دیں۔

حالانکہ اسلام کی دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں یہی خصوصیت ہے کہ وہ پوری زندگی کا نظام عمل ہے، اسلام اتحاد کی قوت ہے، ترقی کی قوت ہے لیکن اسلام کی یہ قوت اسلام کے ماننے والوں کے اخلاص اور ایثار سے تعلق رکھتی ہے اور مسلمانوں کی قیادت مذہبی ہو یا قومی ان صفات سے خالی ہے اور اس افسوسناک صورت حال سے اسلام بدنام ہو رہا ہے اسلامی نظام حیات بدنام ہو رہا ہے۔ آج ہم صرف مبلغ اسلام ہیں، شاھد علی الناس نہیں ہے، قوامین بالعدل نہیں ہیں۔

ابدی بغض وعناد کی آیات

یہود ونصاری کے اندر دشمنی اور عناد کے ابدی ہونے کی تردید میں تفصیلی بحث یہ ہے: سورہ مائدہ (۱۴) میں نصاری کے بارے میں کہا گیا: وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّا نَصٰرٰىٓ اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ. ''اور جو لوگ اپنے آپ کو نصاری کہتے ہیں، ہم نے ان سے بھی (یہود کی طرح) یہ عہد لیا تھا (کہ وہ ایمان وعمل صالح پر قائم رہیں) لیکن وہ بھی اس نصیحت سے فائدہ اٹھانا بھول گئے جو نصیحت انہیں کی گئی تھی پھر ہم نے ان کے اندر دشمنی اور بغض ڈال دیا قیامت تک کے لیے اور اللہ تعالیٰ انہیں ان کے کاموں کی حقیقت سے بہت جلد خبردار کرے گا''۔ اس سے اوپر کی آیت (۱۳) میں یہود کی بداعمالیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور آیت (۱۴) میں نصاری کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

نصاریٰ کے فرقے

قاضی بیضاوی نے نصاری کے تین بڑے فرقوں کا تذکرہ کیا:

(۱) نسطوریہ: یہ فرقہ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا قرار دیتا ہے۔

(۲) یعقوبیہ: یہ لوگ خدا اور حضرت عیسیٰ کو ایک متحد حقیقت کہتے ہیں۔

(۳) ملکانیہ: یہ فرقہ تثلیث کا قائل ہے یعنی خدا تین اجزاء کے مجموعہ کا نام ہے: خدا روح القدس اور مسیح ابن اللہ۔ تاریخ میں عیسائیوں کے مشہور دو فرقوں: کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے درمیان خوں ریز تصادم کی عبرتناک داستانیں موجود ہیں۔

سورہ مائدہ (۶۴) میں یہودیوں کے بارے میں کہا گیا: وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ. ''اور یہودی کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے ہاتھ بخشش وکرم کی طرف سے بندھ گئے ہیں (یعنی خدا بخیل ہو گیا ہے) حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہی کے ہاتھ بندھ گئے ہیں (یعنی بخل وکنجوسی ان پر مسلط ہے) خدا تعالیٰ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے اپنا فضل وکرم عطاء کرتا ہے اور اے نبی محترم! قرآن کریم کا نازل ہونا ان کی ضد اور ان کے عناد کی وجہ سے ان کی سرکشی اور زیادتی کا سبب

بن گیا ہے اور ہم نے ان کے اندر دشمنی اور عناد قیامت تک کے لیے ڈال دیا ہے، یہ لوگ جب بھی فتنہ و فساد کی آگ بھڑکاتے ہیں خدا تعالیٰ اسے بجھا دیتا ہے اور یہ لوگ فساد پھیلانے میں سرگرم رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو فساد پھیلانے والے پسند نہیں۔" ہم نے اوپر دونوں مقام کی آیات ترجمہ کے ساتھ نقل کر دی ہیں تا کہ مذکورہ سوال صاف ہو جائے۔

زیر بحث آیات میں خدا تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کی فرقہ بندیوں کو ان کے اندرونی بغض و عناد کا سبب قرار دیا ہے اور خدا تعالیٰ نے اس بغض و عداوت کو اپنی طرف منسوب کر کے اور اسے اپنا فعل قرار دے کر دراصل قانون فطرت کا اظہار کیا ہے، اس نسبت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ کو ان قوموں کے ساتھ ذاتی طور پر دشمنی ہے، اور اس ذاتی دشمنی کی وجہ سے ان کے دلوں میں بغض و عداوت ڈال دی ہے تا کہ یہ قیامت تک لڑتے رہیں، خدا تعالیٰ کو ان قوموں میں دشمنی پیدا ہونے سے کوئی دل چسپی ہے یہ تصور خدا تعالیٰ کی صفت عدل و رحمت کے خلاف ہے۔

قدیم مفسرین کی تشریح

قدیم مفسرین نے اغراء خداوندی اور القاء خداوندی کی تفسیر میں لکھا: بتفرقهم واختلاف اهوائهم (جلالین ۹۷) یہود و نصاریٰ کے اندر جو تفرقہ بازی اور اختلاف خواہشات کی شدت تھی اس کی وجہ سے ان کے مختلف فرقوں میں بغض و عناد پیدا ہو گیا تھا۔

ابراہیم نخعی کہتے ہیں: الخصومات والجدال فی الدین (ابن کثیر جلد اول ۶۷) ان کے آپسی جھگڑے اور دین کے معاملہ میں ان کی جھگڑے بازی اور ہٹ دھرمی نے ان کے اندر آپسی بغض و دشمنی پیدا کر دی تھی۔ اردو مفسرین میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ترجمان میں اس اشکال کو واضح طور پر دور کیا اور لکھا "اور پس ہم نے ان (نصاریٰ) کے مختلف فرقوں کے درمیان قیامت تک کے لیے دشمنی اور کینے کی آگ بھڑکا دی" (یعنی جب وہ ہدایت سے برگشتہ ہو کر مختلف فرقوں میں بٹ گئے تو ہمارے مقررہ قانون کے بموجب ان میں باہمی بغض و عناد کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ وقت دور نہیں کہ جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی حقیقت انہیں بتائے گا (ترجمان القرآن: ۳۸۸)

المائدہ آیت (۶۴) پر حاشیہ لکھتے ہیں: "عیسائیوں کی طرح یہودی بھی مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں اور مذہبی فرقہ بندی نے ہمیشہ کے لیے ان میں باہمی بغض و عناد کے جذبات پیدا کر دیے ہیں"۔ (۴۲۱)

یہودیوں کے فرقے

یہودیوں میں بارہ قبیلے تھے، یہ قومی اختلاف تھا اور اس کے علاوہ مذہبی اختلاف بھی تھا، ایک فرقہ حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا کہتا تھا قومی اور قبائلی اختلاف کی شدت کا یہ حال تھا کہ خدا تعالیٰ نے میدان تیہ (دریائے نیل کے اس پار) میں پانی سے چشمے جاری کرتے ہوئے بارہ چشمے جاری کیے، تا کہ ہر قبیلہ بغیر باہمی تصادم کے پانی لیتا رہے۔ اس تشریح سے یہ بات صاف ہوگئی کہ ان آیات میں یہود اور نصاری کے اندر الگ الگ جو فرقہ بندی تھی اس کو قرآن نے ان کے بغض و عناد کا سبب قرار دیا۔

بحیثیت دو قوموں کے ان کے اندر جو اختلافات تھے ان اختلافات کی طرف ان آیات میں اشارہ نہیں کیا گیا، یہ بعض مفسرین کی اپنی قیاس آرائی ہے۔ یہود و نصاری دونوں قوموں کے اندر بھی اختلاف کی شدت اور باہمی دشمنی ایک تاریخی حقیقت ہے لیکن قرآن کریم اس قومی اختلاف کا مذکورہ آیات میں کوئی تذکرہ نہیں کررہا ہے۔ البتہ قرآن نے یہ بتایا: وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصَارٰی عَلٰی شَیْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارٰی لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰی شَیْءٍ وَهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتَابَ (بقرہ) ''یہودی کہتے ہیں کہ نصاری کے پاس کچھ نہیں اور نصاری کہتے ہیں کہ یہودیوں کے پاس کچھ نہیں حالانکہ یہ دونوں آسمانی کتابیں (تورات اور انجیل) پڑھتے ہیں۔ یعنی تورات اور انجیل ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں، مگر ان کتابوں کے ماننے والے ایک دوسرے کو رد قرار دیتے ہیں۔

جنگ و پیکار کے حالات کا اثر

یہ بھی واضح رہے کہ اہل کتاب یہود و نصاری اور مسلمانوں کے درمیان باہمی جنگ و جدل کا طویل دور گزرا ہے۔ اس دور کے حالات کا یہ اثر تھا کہ قرآن کریم میں یہود و نصاری کے بارے میں جو اصلاحی تنقیدی مضامین وارد ہوئے تھے مسلمان اہل قلم نے ان مضامین قرآنی کو نہایت سرسری انداز میں بیان کیا۔ ان حضرات نے نہ تو اس بات کی ضرورت سمجھی کہ ان مضامین و مباحث پر غور و فکر کر کے ان کا صحیح مطلب و مفہوم بیان کریں اور نہ انہیں اس کا اندازہ تھا کہ مسلمانوں کا یہ سیاسی غلبہ ہمیشہ قائم رہنے والا نہیں ''ہر کمالے راز والے'' کا فطری قانون سرگرم عمل ہے اور صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کی زبان وحی میں اور اپنی زبان تشریح میں امت مسلمہ کے اخلاقی اور سیاسی زوال کے اسباب پر اور دور زوال کی آمد پر بہت کچھ ارشاد فرمایا ہے۔ اس ناچیز نے اس سلسلہ میں تحقیقی مضامین تحریر کیے ہیں ایک مقالہ میں یہ بتایا ہے کہ بنی اسرائیل کے مصری قوم سے زیورات مستعار مانگ کر اسے ساتھ لے جانے کا واقعہ غیر واقعی

ہے اور یہ الزام بائبل نے یہودیوں پر لگایا ہے، قرآن کریم اس واقعہ کے خلاف ہے۔

دوسرا مقالہ اس ناچیز نے اس مسئلہ میں لکھا ہے کہ مشہور قول کے مطابق یہودیوں پر سخت احکام کا نزول، ایک سرسری اور غیر علمی تصور ہے اور یہ تصور ان قوموں کے ساتھ جنگ و پیکار کے حالات کی پیداوار ہے۔ تیسرا پیش نظر مقالہ یہود و نصاریٰ کے اندر خدا تعالیٰ کی طرف سے بغض و عناد پیدا کرنے کے غلط تصور کی تردید میں ہے۔ چوتھا مقالہ جو زیر ترتیب ہے اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ یہودیوں پر ذلت و مسکنت (ضربت علیہم الزلۃ (البقرۃ:٦١) کا قرآنی اعلان ان قدیم یہودیوں سے تعلق رکھتا ہے جنہوں نے حضرات انبیاء کرام کو قتل کرنے جیسا سنگین جرم کیا تھا، اس مذمت اور اخلاقی سزا کا تعلق عہد رسالت کے یہودیوں سے قائم کرنا صحیح نہیں ہے اور نہ یہ بات درست ہے کہ عہد رسالت کے یہودی اپنے اسلاف کے اس جرم عظیم کو درست قرار دیتے تھے بلکہ قرآن کہتا ہے کہ عام یہودی بچھڑے کی پوجا کرنے کے فعل کو گناہ سمجھتے تھے، تفصیل مضمون میں دی گئی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب دنیا میں نصاب کی کتابوں میں ترمیم کرنے کی جو خبریں آرہی ہیں وہ اسی قسم کی باتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ الگ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عہد رسالت کے یہودیوں نے اسلام اور ہادی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہایت گھٹیا قسم کے معاندانہ معاملات کئے اور آپ کی پر امن اور اتحاد پرور جدوجہد کو اپنی جنگ جویانہ اور حریصانہ طبیعت کے تحت ناکام کرنے کی کوشش کی اور اس کے نتیجہ میں مدینہ کے یہودی قبائل بنونظیر اور بنو قریظہ اور اہل خیبر کے ساتھ وہ دفاعی واقعات پیش آئے جن پر آج کے یوروپین مورخین انگلی اٹھاتے ہیں۔☆

شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالقادرؒ میں ایک اہم تفسیری اختلاف

شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ اور شاہ عبدالقادر علیہ الرحمۃ کے درمیان تفسیر قرآن میں تاویل وتعبیر کے اختلاف کی کافی مثالیں موجود ہیں۔ان مثالوں میں ایک اہم مثال سورہ بقرہ کی آیت (۲۰۸) کی تاویل کا اختلاف ہے۔تفسیر قرآن کے دونوں اماموں کے درمیان یہ اجتہادی اختلاف بہت غوروفکر کے بعد ظاہر ہوتا ہے،سرسری نظر سے مطالعہ کرنے والے اس اہم اور فکر انگیز اجتہادی اختلاف سے آگاہ نہیں ہوسکتے۔

پہلے اختصار کے ساتھ تحریر کیا جاتا ہے کہ بعض یہودی حق پسندوں نے اسلام قبول کر کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے اس امر کی اجازت چاہی کہ ہمیں اپنی سابق یہودی روایات کے مطابق ہفتہ (سبت) کی تعظیم کرنے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی نذر کے مطابق اونٹ کے گوشت اور دودھ کو چھوڑنے کی چھوٹ دی جائے۔اس واقعہ پر قرآن کریم سورہ بقرہ آیت (۲۰۸) یا ایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ نازل ہوئی یعنی "اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ۔"

شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کی تحقیق یہ ہے کہ اس آیت میں اہل ایمان کو ہدایت کی گئی کہ وہ دین اسلام کے بنیادی اصولوں کی اطاعت میں اتحاد اور اتفاق کی راہ اختیار کریں۔شاہ صاحب نے آیت مذکورہ سے اصول دین میں اتحاد کے نظریہ کا استنباط کر کے یہ اشارہ کیا ہے کہ فروع دین میں اتحاد کی اتنی اہمیت نہیں،جتنی اصول دین میں اہمیت ہے،فروع دین میں اختلاف کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔شاہ عبدالقادر صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں اہل ایمان کو دین کی اطاعت کے ساتھ مسلمانوں کے طور وطریق (فروعی مسائل) کی پابندی کا بھی حکم دیا گیا ہے۔اس بحث کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

<u>بقرہ (آیت ۲۰۸) کی تشریح!</u>

<u>شاہ ولی اللہ اس آیت کا ترجمہ کرتے ہیں: "اے کسانیکہ ایمان آوردید درآئید باسلام جمہ</u>

یکجا" شاہ رفیع الدین صاحب نے اپنے والد کے فارسی ترجمہ کو تحت لفظ اردو میں ان الفاظ میں منتقل کیا۔
"اے لوگو! کہ ایمان لائے ہو داخل ہو بیچ اسلام کے سارے" حضرت شاہ ولی اللہ اس آیت پر فتح الرحمٰن میں مختصر حاشیہ لکھتے ہیں: یعنی "دراصول مختلف مشوید" یعنی ...... اصول دین میں اختلاف نہ کرو۔ شاہ ولی اللہ نے کافۃ کے لفظ کو ادخلوا کی ضمیر جمع (داخلین) سے حال قرار دیا اور السلم (اسلام) سے اسلام کے بنیادی اصول (الدین) مراد لئے۔

شاہ صاحب نے اصول دین کی اہمیت پر حجۃ اللہ البالغۃ میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے جس میں قرآن کریم کی تین آیات (مائدہ ۴۸، مومنون ۵۲، شوریٰ ۱۳) سے استدلال کر کے یہ بتایا ہے کہ تمام پیغمبروں نے دین حق کے اصولوں کی دعوت دی ہے اور اصول دین کی دعوت و تبلیغ میں تمام رسول و نبی متحد رہے ہیں شاہ صاحب نے حجۃ اللہ کی اس بحث میں بقرہ (۲۰۸) کو شامل نہیں کیا کیونکہ یہ آیت اس مفہوم میں واضح الدلالت نہیں ہے بلکہ شاہ صاحب کا اپنا اجتہاد ہے۔

جمہور علماء کی تحقیق!

حضرت امام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بقرہ کی آیت (۲۰۸) کی تشریح میں جمہور مفسرین سے الگ راہ اپنائی، جمہور کی ترجمانی کرتے ہوئے امام ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس، مجاہد اور دوسرے علماء تابعین کے نزدیک کافۃ السلم (اسلام) سے حال واقع ہوا ہے اور اس ترکیب کے مطابق اس حکم الٰہی کا مطلب یہ ہوا کہ اے اہل ایمان تم مکمل شریعت اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

بعض مفسرین نے کافہ کو ادخلوا کی ضمیر جمع مخاطب (داخلین) سے حال قرار دیا ہے لیکن پہلی توجیہ صحیح ہے۔ پہلی توجیہ کے راجح ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے ابن کثیر نے اس آیت کے شان نزول کو سامنے رکھا ہے اور وہ حضرت عکرمہ کا یہ اثر ہے کہ نو مسلم یہودی عبداللہ ابن سلام، اسد ابن عبید، ثعلبہ وغیرہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہفتہ (سبت) کے احترام کرنے اور رات کے وقت تورات کی تلاوت کرنے کی اجازت طلب کی۔ اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی ابن کثیر نے شان نزول کی اس روایت میں حضرت عبداللہ ابن سلام کو شامل کرنے سے اختلاف کیا ہے اور ان کے اخلاص کو پیش کیا ہے، البتہ ان کے علاوہ دوسرے نو مسلم یہودیوں کے بارے میں اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے۔

ایک درجہ کا گناہ قرار دیا ہے۔

علمائے اسلام نے اسی آیت سے اجماع امت کے دلیل شرعی ہونے پر استدلال کیا ہے۔

حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ کی تسہیل!

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ صاحب کے ترجمہ کے اندر اپنی تسہیل (موضح فرقان) میں شاہ صاحب کے لفظ مسلمانی کو شاہ ولی اللہ اور شاہ رفیع الدین کے تراجم کے مطابق لفظ اسلام سے بدل دیا ہے لیکن اس تبدیلی سے آیت کا ترجمہ شان نزول کی مطابقت سے خالی ہوگیا۔ حالانکہ حضرت شیخ نے اپنے تفسیری حاشیہ میں شان نزول کے لحاظ سے بہترین توضیح کی اور اپنے مسلک حق (دیوبندی فکر) کو بڑی خوبی سے واضح کر دیا، لکھتے ہیں:

''پہلی آیت میں مومن مخلص کی مدح فرمائی تھی جس سے نفاق کا ابطال منظور تھا اب فرماتے ہیں کہ اسلام کو پورا پورا قبول کر دیعنی ظاہر اور باطن اور عقیدہ اور عمل میں صرف احکام اسلام کا اتباع کرو یہ نہ ہو کہ اپنی عقل یا کسی دوسرے کے کہنے سے کوئی حکم تسلیم کرلو یا کوئی عمل کرنے لگو سوااس سے بدعت کا قلع قمع مقصود ہے کیونکہ بدعت کی حقیت یہی ہے کہ کسی عقیدہ یا کسی عمل کو کسی وجہ سے مستحسن سمجھ کر اپنی طرف سے دین میں شمار کرلیا جائے مثلاً نماز اور روزہ جو کہ افضل عبادات ہیں اگر بدون حکم شریعت کوئی اپنی طرف سے مقرر کرنے لگے جیسے عید کے دن عیدگاہ میں نوافل کا پڑھنا یا ہزار وروزہ رکھنا یہ بدعت ہوگا، خلاصہ ان آیات کا یہ ہوا کہ اخلاص کے ساتھ ایمان لاؤ اور بدعات سے بچتے رہو چند حضرات یہودیت سے مشرف بہ اسلام ہوئے مگر احکام اسلام کے ساتھ احکام تورات کی بھی رعایت کرنی چاہتے تھے مثلاً ہفتہ کے دن کو معظم سمجھنا اور اونٹ کے گوشت اور دودھ کو حرام ماننا اور تورات کی تلاوت کرنا اس پر آیہ نازل ہوئی جس سے بدعت کا انسداد کامل فرمایا گیا۔''

سورہ نساء (آیت ۱۱۵) کی تشریح!

سورہ نساء (۱۱۵) میں خدا تعالیٰ نے راہ مسلمین کی اتباع کا حکم دیا: وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ ''جو شخص رسول محترم کے خلاف کرے گا اس حقیقت کے بعد کہ اس کے سامنے ہدایت کی راہ واضح ہو چکی ہے اور وہ اہل ایمان کی راہ کے سوا دوسری راہ پر چلے گا تو ہم اسے اسی راہ کے سپرد کر دیں گے

شاہ عبدالقادر صاحب کی منفرد تحقیق!

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے ترجمہ میں اپنی منفرد تحقیق کا اظہار کیا اور السلم کا ترجمہ لفظ "اسلام" سے کرنے کے بجائے لفظ "مسلمانی" سے کیا ہے، یعنی بڑے شاہ صاحب نے السلم کے مفہوم کو اصول دین میں محدود کر دیا ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب نے السلم کا ترجمہ مسلمانی کے لفظ سے کر کے اس کے مفہوم کو وسیع کر دیا ہے، لکھتے ہیں: اے ایمان والو! داخل ہو مسلمانی میں پورے، "مسلمانی سے مراد مسلمانوں کے طور و طریق، یعنی شاہ صاحب نے اسلام کے دائرہ کو وسیع کر دیا اور قرآن و حدیث کے احکام کے ساتھ مسلمانوں کے طور و طریق کو بھی اسلام کی پیروی میں داخل کر دیا اور یہ عموم شان نزول کے واقعہ کی روشنی میں کیا ہے۔

اسلام اور مسلمانی میں کیا فرق ہے؟

سلم کا ترجمہ عرب مفسرین اور اردو اہل تراجم نے اسلام کے لفظ سے کیا ہے، حضرت شاہ صاحب کے سامنے یہ تمام تراجم موجود تھے، مگر شاہ صاحب نے اپنے پیش رو حضرات کی پیروی سے گریز کر کے اسلام کے معنی مسلمانی بیان کئے۔ شاہ صاحب کا یہ اختلاف شاہ صاحب کے بڑے غور و فکر کا نتیجہ ہے اور ہمارے بزرگوں کے بقول یہ شاہ صاحب کی وہبی رہنمائی (الہام و القاء) ہے۔ اسلام اور مسلمانی میں فرق یہ ہے کہ اسلام قرآن و حدیث کے احکام اور ہدایات کا نام ہے اور مسلمانی کے لفظ میں احکام الٰہی کے ساتھ اہل حق مسلمانوں کا طرز عمل بھی شامل ہے۔

شان نزول کے واقعہ میں ہفتہ کی تعظیم اور اونٹ کے گوشت اور دودھ سے پرہیز کا بھی تذکرہ ہے اور قرآن و حدیث میں ہفتہ کی تعظیم سے روکا نہیں گیا اور اونٹ کے گوشت اور دودھ کے استعمال کا حکم نہیں دیا گیا البتہ اہل حق مسلمان جمعہ کی تعظیم کرتے ہیں اور اونٹ کے گوشت اور اس کے دودھ کو اپنے استعمال میں لاتے ہیں، یہ مسلمانی ہے، مسلمانوں کا معمول ہے۔

اس لئے آیت مذکورہ میں اسلام سے مراد مسلمانی لینا آیت کے مطلب کو زیادہ واضح کرتا ہے۔ یہ حضرت شاہ صاحب کی قرآن فہمی کا وہبی مقام ہے۔ اس آیت کے ترجمہ میں حضرت شاہ صاحب کے سامنے سورہ نساء (۱۱۵) کی آیت رہی ہے جسمیں قرآن کریم نے مسلمانوں کے راہ عمل (سبیل المومنین) کی اہمیت بیان کرتے ہوئے رسالت کی نافرمانی اور مسلمانوں کے راہ عمل کی خلاف ورزی کو

جسے اس نے اختیار کیا ہے اور اسے انجام کار دوزخ میں داخل کردیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔"

علمائے اسلام نے اس آیت کریمہ سے اجماع امت کے دلیل شرعی ہونے پر استدلال کیا ہے، حضرت امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں: وهذا غير الاجماع الذى اجتمعت الامة عليه فانهم اتفقوا على القول بالاجماع الذي مستنده الكتاب والسنة والاستنباط من احدهما (حجۃ اللہ البالغہ جلد اول مصری، ص ۱۲۱)

اجماع کے مشرکانہ تصور کی تردید کرنے کے بعد۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں: اس اجماع امت پر تمام امت کا اتفاق ہے جو کتاب الٰہی اور سنت نبوی پر قائم ہو یا اس میں کتاب وسنت میں سے کسی ایک سے استنباط اور استخراج کیا گیا ہو۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کا ہاتھ ہے مسلمانوں کی جماعت پر جس نے جدا راہ پکڑی وہ جا پڑا دوزخ میں۔ پس جس بات پر امت کا اجماع ہو وہی اللہ کی مرضی ہے اور منکر ہو سو دوزخی ہے (مستند موضح قرآن ۱۲۵)

اجماع امت کا کیا مطلب ہے؟

اس آیت سے اجماع امت کے دلیل شرعی ہونے کی وضاحت کرتے ہوئے علماء تفسیر نے یہ تقریر کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق زندگی کا علم بالمشاہدہ (آنکھوں سے) عام لوگوں کے لئے حضور والا کی حیات پاک میں بھی مشکل تھا کیونکہ کافی لوگ دور دراز رہتے تھے اور آپ کی وفات کے بعد تو سب کے لئے مشکل ہو گیا ہے۔ اب اس علم کی ایک یہی صورت رہ جاتی ہے کہ آپ کی زندگی پاک کا علم اس طبقہ سے حاصل کیا جائے جس نے آپ کے طریق حیات اور آپ کی سنت اور سیرت کو آنکھوں سے دیکھا اور اس کو نقل کر کے دوسروں تک پہنچایا۔ اسی طبقہ (رواۃ) کی راہ عمل کو قرآن نے سبیل المسلمین کہا اور اس طریق مسلمین کی مخالفت کو مخالفت رسول کا درجہ دے کر دونوں کی سزا جہنم قرار دی۔

حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ نے اس تقریر و توضیح میں راہ مسلمین کی مخالفت کو مخالفت رسول کی علامت قرار دیا اور یہ لکھا کہ یہ منطق کی اصطلاح میں دلیل "انی" ہے اور یہ علمی نکتہ میرے دل میں القاء ہوا ہے، میرے غور وفکر کا نتیجہ نہیں۔ فانه من المواهب لا من المكاسب (بیان القرآن کلاں جلد ۲ ص:۱۵٦)

منطق میں ایک دلیل "لمی" اور ایک دلیل "انی" ہے، دلیل لمی کا مطلب یہ ہے کہ علت سے معلول کو سمجھنا اور دلیل انی یہ ہے کہ معلول سے علت کو سمجھنا۔ اس بحث میں دلیل لمی یہ ہے کہ رسول پاک

کی صداقت سے پیروان رسول (مسلمین) کے راہ عمل میں صداقت پیدا ہوئی، تو آپ کی صداقت علت ہے اور مسلمانوں کی زندگی میں صداقت معلول ہے۔ اصلی صورت یہی ہے۔

قرآن کریم نے اس آیت میں معلول کو علت کی حیثیت دیدی اور یہ اشارہ کیا کہ راہ مسلمین (صحابہ کرام، خواص امت) کے خلاف چلنا طریق نبوت کے خلاف چلنے کے برابر ہے۔ اسی حیثیت سے راہ مسلمین کا کسی مسئلہ میں اجماع دلیل شرعی قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ رسولؐ پاک کے طریق زندگی کے بالمشاہدہ ناقل وراوی حضرات صحابہ کرام کی جماعت ہے، یہی خواص مسلمین اور خواص امت ہیں۔ قرآن کریم نے اسی طبقہ کو اولئک هم الراشدون (یہ لوگ ہدایت یافتہ ہیں) کہا، حضور علیہ السلام نے اسی طبقہ کے لئے فرمایا: اصحابی کالنجوم بایهم اقتدیتم اهتدیتم "میرے اصحاب ہدایت کے چراغ ہیں ان میں سے تم لوگ جس کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے۔" ان نجوم ہدایت کی موافقت اور مخالفت، اسی آفتاب ہدایت کی موافقت اور مخالفت ہے جس آفتاب سے یہ ستارے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ یہی طبقہ قرآنی خطاب کنتم خیر امة (بہترین امت) کا صحیح مصداق ہے، حضرت عمر فرماتے تھے: هی للا صحاب خاصة لقوله کنتم ولو قال انهم یعم کلنا. ابن عباس فرماتے ہیں: هم الذین هاجروا معه صلی الله علیه وسلم۔ حضرت عمر نے اس لقب کا مصداق تمام صحابہ کو قرار دیا حضرت عمر کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ: اے جماعت صحابہ! تم خدا تعالیٰ کے علم میں پہلے ہی خیر امت تھے (کذلك ثابتین فی علم الله تعالی مکتوبین فی اللوح المحفوظ مذکورین فی الامم المتقدمة) "لوح محفوظ میں تمہارا ذکر ہے اور سابق امتوں میں تمہارا تذکرہ ہے" (مرقاۃ شرح مشکوۃ) حضرت ابن عباس نے اس امت کے دائرہ کو مہاجرین کے ساتھ خاص کیا۔

اہل علم نے لکھا کہ یہ لقب خیر امت 'کے ان تمام افراد پر صادق آتا ہے جو علم و عمل اور صلاح و تقوی کی خیریت وصلاحیت پر قائم ہیں۔ اسی طبقہ مسلمین کی پیروی اور مخالفت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور نافرمانی ہے، اجماع امت کی پوری تفصیل اصول فقہ کی کتابوں میں دیکھی جائے۔

اتحاد امت کی اہمیت!

اجماع امت کی اہمیت اتحاد امت سے وابستہ ہے، آپ نے فرمایا: لا تجمع امتی علی الضلالة، "میری امت گمراہی پر کبھی جمع نہیں ہوگی" بلکہ یہ صورت رہے گی، ارشاد فرمایا: لا یزال من

امتی امة قائمة بامر الله ،لایضرهم من خذلهم و لا من خالفهم حتی یاتی امر الله وهم علی ذلك (متفق علیہ مشکوۃ ۵۸۳)

''میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ ایسی رہے گی جو دین حق کے ساتھ قائم اور وابستہ رہے گی اس جماعت کو کوئی دشمن اور مخالف نقصان نہیں پہنچا سکے گا، یہاں تک کہ خدا کا آخری فیصلہ (قیامت) آجائے اس وقت تک وہ جماعت اہل حق اپنے مشن پر قائم رہے گی۔

سورہ آل عمران (۱۰۳) کی تشریح اور اتحاد امت کی اہمیت!

واعتصموا بحبل الله جمیعا و لا تفرقوا شاہ ولی اللہ اس آیت کا ترجمہ کرتے ہیں: وچنگ زنید برسن خدا جمع آمدہ وپراگندہ مشوید'' شاہ عبد القادر صاحب اس مفہوم کو اس طرح ادا کرتے ہیں۔اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی سب مل کر (شاہ عبد القادر) مولانا تھانوی اس مفہوم کو اس طرح ادا کرتے ہیں''اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالی کے سلسلہ کو اس طور پر کہ باہم متفق بھی رہو'' (مولانا تھانوی)

حضرت شیخ الہندؒ نے آیت آل عمران کی تشریح کرتے ہوئے اس کا مطلب ہر پہلو سے واضح کیا،فرماتے ہیں:

> ''سب مل کر قرآن کو مضبوط تھامے رہو جو خدا کی مضبوط رسی ہے۔ یہ رسی ٹوٹ تو نہیں سکتی ہاں چھوٹ سکتی ہے۔اگر سب مل کر اس کو پوری قوت سے پکڑے رہو گے،کوئی شیطان شرانگیزی میں کامیاب نہ ہوسکے گا اور انفرادی زندگی کی طرح مسلم قوم کی اجتماعی قوت بھی غیر متزلزل اور ناقابل اختلال ہوجائیگی قرآن کریم سے تمسک کرنا ہی وہ چیز ہے جس سے بکھری ہوئی قوتیں جمع ہوتی ہیں اور ایک مردہ قوم حیات تازہ حاصل کرتی ہے لیکن تمسک بالقرآن کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن کو اپنی آراء واہوا کا تختۂ مشق بنالیا جائے، بلکہ قرآن کریم کا مطلب وہ معتبر ہوگا جو احادیث صحیحہ اور سلف صالحین کی متفقہ تصریحات کے خلاف نہ ہو۔ ☆



وسیلہ کی مختلف آیات میں شاہان دہلی کی اجتہادی تاویلات میں اختلاف

وسیلہ کے مسئلہ میں اہل علم کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ہے، وسیلہ کے دو تصور ہیں، ایک عملی وسیلہ دوسرا شخصی وسیلہ۔ وسیلۂ عملی (اطاعت خداوندی) میں اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ شخصی وسیلہ کے تصور میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور جمہور علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت امام شخصی وسیلہ کو شریعت کے خلاف قرار دیتے ہیں اور اس تصور کو اسلام کے خاص توحیدی عقیدہ سے متصادم کہتے ہیں۔ دوسرے علماء اس کے جواز کے قائل ہیں۔ قرآن کریم میں وسیلہ کے متعلق دو آیات ہیں ان دونوں آیتوں میں شخصی وسیلہ کی تائید کے لئے بعض احادیث بھی موجود ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ اپنے مجموعی مسلک کے لحاظ سے ابن تیمیہ کے نظریات سے متفق نہیں، لیکن وسیلۂ شخصی کے تصور میں آیات قرآنی سے استدلال شاہ صاحب کے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا اور اس پہلو سے شاہ صاحب جمہور علماء سے اختلاف رکھتے ہیں۔ جمہور علماء وسیلہ کے جواز کے لئے قرآن کریم سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ احادیث کا معاملہ الگ ہے، احادیث ظنی الثبوت ہیں، قرآن کریم قطعی الثبوت ہے۔ نص قرآنی میں اختلاف کی گنجائش نہیں، احادیث میں گنجائش ہے۔ شاہ صاحب نے متعلقہ آیات قرآنی کو شخصی وسیلہ کے عقیدے سے بے تعلق قرار دیدیا اور اس طرح اس عقیدہ کی اہمیت کم کر دی۔ حضرت شاہ صاحب کی بالغ نظری نے وسیلہ کے اختلافی مسئلہ میں نہایت محتاط اور معقول راستہ اختیار کیا۔

وسیلہ کی پہلی آیت

نزول کے اعتبار سے المائدہ (۳۵) وسیلہ سے متعلق دوسری آیت ہے، سورہ مائدہ چھ ہجری کے قریب نازل ہوئی موجودہ ترتیب میں المائدۃ (۳۵) پہلی آیت ہے، جو حسب ذیل ہے: یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ وجاھدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون۔ اس

آیت وسیلہ کا ترجمہ اہل تراجم نے کیا کیا ہے؟ اس پر غور کیجئے:

اے مسلمانان! بترسید از خدا بطلبید قرب بسوئے او جہاد کنید درراہ او تارستگار شوید (شاہ ولی اللہ) (۱) اے مسلمانو! خدا سے ڈرو اور خدا کی طرف قرب کی تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو تا کہ تم کامیاب ہو۔ (فارسی ترجمہ) (۲) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، ڈرو اللہ سے اور ڈھونڈو اس کی طرف وسیلہ اور محنت کرو بیچ راہ اس کی تا کہ تم فلاح پاؤ۔ (شاہ رفیع الدین) (۳) اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ سے اور ڈھونڈو اس تک وسیلہ اور لڑائی کرو اس کی راہ میں شاید تمہارا بھلا ہو۔ (شاہ عبد القادر صاحب) (۴) شاہی تراجم کے بعد جو ترجمہ سب سے زیادہ مستند اور قریب الی الصواب ہے وہ مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ ہے مولانا لکھتے ہیں:

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور خدا تعالیٰ کا قرب ڈھونڈو اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔

یہ چار بنیادی تراجم ہیں شاہ ولی اللہؒ نے اپنے فارسی ترجمہ میں وسیلہ کے لفظ کا ترجمہ ''قرب'' کیا ہے اور آپ کے دونوں صاحبزادوں نے وسیلہ کا ترجمہ اسی لفظ (وسیلہ) سے کیا ہے۔ البتہ مولانا تھانوی نے شاہ صاحب کی پیروی کی ہے اور وسیلہ کا ترجمہ قرب کے لفظ سے کیا ہے شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ نے وسیلہ کا لفظ کیوں چھوڑا؟ اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔

(۱) ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ فارسی اور اردو والے وسیلہ کے لفظ کو مطلق ذریعہ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، ذریعہ بھلائی کا ہو یا برائی کا، اہل زبان فارسی اور اہل زبان اردو اس لفظ کو ہر طرح بولتے ہیں، ان کے استعمال میں یہ لفظ عام ہے۔ حالانکہ عربی میں وسیلہ کا اطلاق خیر اور بھلائی کے ذریعہ پر ہوتا ہے شاہ صاحب فارسی زبان میں ترجمہ کر رہے تھے، اس لئے فارسی کے اس عام لفظ کو آپ نے چھوڑ دیا اور اس کی جگہ عربی کا لفظ قرب استعمال کیا۔ عربی میں وسیلہ کے ایک معنی قرب و عزت کے بھی اور ذریعہ کے بھی ہیں عربی اہل لغت نے لکھا ہے کہ وسل س سے اور وصل ص سے دونوں لفظ ہم معنی ہیں البتہ دونوں میں یہ فرق ہے کہ دو چیزوں کا آپس میں ملنا اور جڑنا شوق اور محبت کے ساتھ وسل کہلاتا ہے اور مطلق ملنے اور جڑنے کے لئے وصل بولا جاتا ہے۔ فعیلۃ کے وزن پر جو صیغہ آتا ہے وہ وصل سے وصیلہ آتا ہے اور اس کے معنی اس اونٹنی کے ہیں جو دس سال تک برابر بچے دے۔ ذریعہ کے معنی میں نہیں آتا۔ قرآن میں اونٹ اور اونٹنیوں کی چار قسموں میں سے ایک قسم وصیلہ ہے (مائدہ ۳۔۱)

(۲) دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاہ صاحب وسیلہ سے عملی وسیلہ مراد لیتے ہیں شخصی وسیلہ مراد نہیں لیتے اور

عملی وسیلہ خدا تعالیٰ کی اطاعت ہے۔امام قتادہ کہتے ہیں: تقربوا الیہ بطاعتہ والعمل بما یرید (ابن کثیر۔المائدۃ) ''خدا کا تقرب حاصل کرو، اس کی اطاعت اور اس کے پسندیدہ اعمال کے ذریعہ!''

عام طور پر ذریعہ اور مقصود دو الگ الگ چیزیں ہوتی ہیں، مال کے ذریعہ روٹی کپڑا حاصل کیا جاتا ہے اور مال اور روٹی کپڑا دونوں الگ الگ چیزیں ہیں لیکن ذات حق تعالیٰ کے تعلق سے جو چیز ذریعہ ہے وہی تقرب اور مقصود ہے، دونوں الگ الگ نہیں ہیں۔شاہ صاحب کی بالغ نظری یہ بتانا چاہ رہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی عبادت ہی اس کا قرب و تقرب ہے۔یہ جو کہا جاتا ہے کہ عبادت کے بعد قرب حق کی منزل حاصل ہوتی ہے، شاہ صاحب اس تصور کے خلاف ہیں اور یہ بتا رہے ہیں کہ جو بندہ اپنے خدا کی عبادت میں مشغول ہو جاتا ہے تو وہ قرب حق کی منزل میں داخل ہو جاتا ہے عبادت ہی قرب ہے۔

خدا کی عبادت گھر میں ہو یا مسجد و خانقاہ میں، حق تعالیٰ کا قرب وہیں حاصل ہو جاتا ہے خدا کا گھر خانہ کعبہ خدا کا گھر مسجد، یہ نسبت تشریفی ہے، وہ لا مکان ہے، بندہ کی رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے، وہ عبادت گذار بندہ کو دیکھتا ہے اور اس کی سنتا ہے۔نحن اقرب الیہ من حبل الورید (ق:۱۶) واذا سالک عبادی عنی فانی قریب (بقرہ۔۱۸۶) ان تعبد اللہ کانک تراہ (حدیث نبوی) یعنی ''ہم بندہ کی رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں'' ''اور جب میرے بارے میں سوال کریں تو اے نبی! آپ ان سے کہدیں کہ میں ان سے قریب ہوں''، حدیث میں آتا ہے کہ خدا کی عبادت اس طرح کرو کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔قرب خداوندی کے مقابلہ میں قرب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ جدا ہے۔قرب نبوی کی ایک صورت ظاہری بھی ہے اور وہ جسمانی قرب ہے، یہ قرب و نزدیکی رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک کافر و منافق کو بھی حاصل ہوتی ہے۔جب وہ اہل کفر و نفاق آپ سے ملتے آتے تھے تو حضور انہیں اپنے پاس بٹھاتے تھے، یہ ظاہری اور جسمانی قرب تھا۔خداوند کی ذات غیبی حقیقت ہے، کوئی ظاہری اور مادی وجود نہیں، اس لئے اس کا قرب روحانی اور باطنی ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحب کی انفرادی شان

شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی علیہ الرحمۃ نے اپنے ترجمے (موضح قرآن) میں وسیلہ کا عربی لفظ استعمال کیا اور اپنے والد صاحب کے ترجمے کی پیروی نہیں کی اور اسی کے ساتھ اپنے تفسیری حاشیہ میں تمام مفسرین (علماء و تابعین) سے الگ راہ اختیار کی اور وسیلہ سے اطاعت الٰہی کے بجائے اطاعت رسول مراد لی۔شاہ صاحب لکھتے ہیں:

یعنی رسول کی اطاعت میں جو نیکی کرو وہ قبول ہے اور بغیر اس کے عقل سے کرو سو قبول نہیں (ص:۴۵ مستند موضح) شاہ صاحب نے اس تفسیری حاشیہ میں دو باتیں، متقدمین اہل تفسیر سے مختلف تحریر کیں۔ایک یہ بات کہ اطاعت الٰہی کے بجائے وسیلہ کا مطلب اطاعت رسول لیا۔دوسری بات یہ کہ اس آیت سے مشرکین کے عقیدہ (مشرکانہ توسل) کی تردید کرنے کے بجائے عقل پرستی کی تردید کی۔حضرت شاہ صاحب نے اپنے تشریحی نوٹ میں جس بالغ نظری اور دور بینی سے کام لیا شاہ صاحب کے شارحین کرام مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب دہلوی کی نظر اس پر نہیں پڑی یا ان اہل علم نے اسے اہمیت نہیں دی۔

حضرت شاہ صاحب کی اس توجیہ کے مطابق آیت متعلقہ میں وسیلہ کا مطلب اطاعت رسول ہی موزوں معلوم ہوتا ہے حالانکہ امام قتادہ اور ان کی اتباع میں بعد والے تمام مفسرین وسیلہ تلاش کرو کا مطلب بیان کرر ہے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کرو یہی راہ خدا تعالیٰ تک پہنچنے کی کامیاب راہ ہے۔شاہ صاحب کے سامنے قرآن کریم اور حیات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ حقائق تھے کہ قرآن کریم نے تو ایک دفعہ جہاد کی اجازت دے دی۔اذن للذین یقاتلون الخ (الحج:۲۹) اس اجازت کے بعد جس قدر غزوات ہوئے ان میں ایک امیر و امام کی حیثیت سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اور امر جاری ہوا اور آپ ہی کی قیادت میں صحابہ کرام نے راہ حق میں جہاد کیا۔یہ بات صحیح ہے کہ رسول پاک کی اطاعت بھی خدا تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے اور رسول پاک کی نافرمانی خدا تعالیٰ ہی کی نافرمانی ہے پھر وسیلہ سے خدا تعالیٰ کی اطاعت مراد لینے میں کیا مضائقہ ہے؟ یہ صحیح ہے کہ اطاعت رسول اطاعت الٰہی ہے لیکن یہ بات حقیقت کے اعتبار سے ہے، حضرت شاہ صاحب نے ظاہری صورت کا اعتبار کیا ہے۔ظاہری اعتبار سے غزوات میں رسول پاک ہی کا حکم جاری ہوتا تھا ہر موقعہ پر خدا تعالیٰ کی وحی جلی (قرآن) نازل نہیں ہوتی تھی۔

عقل کی پیروی کی ندامت!

شاہ صاحب نے حکم نبوی کے مقابلے میں عقل کی پیروی کی مذمت کی اور عقل پرستی سے مسلمانوں کو روکا۔اس موقعہ پر شاہ صاحب نے عقل کی پیروی کی ممانعت کیوں کی؟ اس کی تشریح پر مولانا احمد سعید صاحب اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے توجہ کی اور پیروی عقل کی مذمت کا تعلق آیت متعلقہ کے حکم وجاھدوا فی سبیل اللہ الخ سے قائم کیا۔جس کا حاصل یہ ہے کہ پچھلی آیت مائدہ (۳۴) میں قرآن کریم نے فساد پھیلانے کی مذمت کی ہے: انما جزاء الذین یحاربون اللہ

ورسوله ویسعون فی الارض فسادا ''جولوگ خدا کی زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اس طرح خدا اور اس کے رسول کے ساتھ برسر پیکار ہونے کا جرم کرتے ہیں ان کی سزا یہ ہے'' الخ۔ فساد برپا کرنے کی مخالفت سے یہ خطرہ پیدا ہوسکتا تھا کہ لوگ جہاد وقتال فی سبیل اللہ کو بھی فساد و بربادی سمجھنے لگیں اور اپنی تن آسانی اور کم ہمتی کی وجہ سے اپنی عقل نارسا کے سہارے جہاد فی سبیل اللہ کو بربادی قرار دے کر اسے چھوڑ بیٹھیں۔ اس لئے قرآن نے وسیلہ کی تلاش کا حکم دینے کے بعد جہاد کا صراحۃ حکم دیا۔ یہ حکم ہجرت کے چھٹے سال میں دیا گیا جب کہ غزوات کا سلسلہ جاری ہوچکا تھا اور صلح حدیبیہ کے بعد خیبر اور خندق کے اہم غزوات درپیش تھے۔

عقل پرستی کے فتنہ سے آگاہ کیا!

حضرت شاہ صاحب کی اس توجیہ کا اگر گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ حضرت شاہ صاحب دراصل مختصر تشریحی فائدہ میں اس خطرہ سے آگاہ کررہے ہیں جو آنے والے عقلی دور میں پیش آنے والا تھا۔ شاہ صاحب کے والد محترم حضرت امام شاہ ولی اللہؒ نے آنے والے اسی خطرہ کے پیش نظر حکمت شرعی کے موضوع پر پوری توجہ دی اور اسلامی اصول وعبادات کے عقلی اسرار اور عقلی حکمتوں پر ایک مفصل اہم بنیادی کتاب (حجۃ اللہ البالغۃ) تصنیف کی اور اسلام کو مضبوط عقلی استدلال پر کھڑا کیا جو اس کا حقیقی مقام ہے اب شرعی دائرہ حکم سے باہر جو عقل پرست شرعی احکام میں اپنی ذاتی عقل لڑاتے ہیں وہ شریعت کا دامن چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

حضرت شاہ عبد القادر صاحبؒ اس توجیہ مذکورہ میں مسلمانوں کو توجہ دلا رہے ہیں کہ آنے والے دور میں شرک اور بزرگوں کے وسیلہ بنانے اور انہیں سفارشی خدا بنانے کے فتنہ کا اتنا زور نہیں ہوگا جتنا زور عقل وخرد کو خدا بنانے اور حکم الہیٰ کے مقابلہ میں عقل وخرد کی بے حقیقت خدائی کا ہوگا۔ حضرت شاہ صاحب کے سامنے یہ حقیقت بھی تھی کہ کہ عقل پرستی کے فتنہ کا حملہ قرآن کی محفوظ اور معقول اصولی تعلیمات کے مقابلہ میں احادیث رسول پر زیادہ ہوگا کیونکہ احادیث رسول کے اعتماد کو وضع حدیث کے فتنہ نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس لئے حضرت شاہ صاحب اطاعت رسول کے عنوان سے وسیلہ اور تقرب الی اللہ کی اہمیت بیان کررہے ہیں۔ ☆☆☆

افراد کی اہمیت

مولانا آزاد نے رسول محترم ﷺ کی مامور من اللہ او محترم من اللہ شخصیت کے حوالہ سے شخصیت پرستی کی بڑی مؤثر انداز میں تردید کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس عملی حقیقت کو بھی مولانا نے تسلیم کیا کہ فرد وافراد کی حیثیت اجتماعی زندگی کے نظام میں بالکل بے ضرورت و بے اثر نہیں ہے۔ بلکہ بہت اہم اور بنیادی ہے پرستش اور پوجا اصول و مقاصد سے بالاتر ہونے کا نام ہے۔ لیکن اصول و مقاصد کے تحت افراد کی اہمیت اجتماعی نظام کی اہم ضرورت ہے۔

چنانچہ مولانا ایک بحث میں افراد کی اہمیت پر لکھتے ہیں:

"قوموں میں جب زندگی آتی ہے تو ہزاروں افراد کے ذریعے نہیں بلکہ ہمیشہ سر چشمہ حیات ایک یا ایک سے زیادہ چند نفوس قلیلہ و عدیدہ ہی ہوتا ہے۔ اس عالم کی زندگی قوموں سے ہے۔ مگر قوموں کی زندگی صرف اشخاص کے دم سے وابستہ ہے۔

سرزمین انسانیت میں جب ایک عمدہ بیج بار آور ہو کر سر اٹھاتا ہے تو اس سے صدہا شاخیں پھوٹتی ہیں۔ اور ان میں ہزار و ترو تازہ پھل نکلنے لگتے ہیں۔

(صبح امید ۲۸۱)

نقد ابوالکلام کے مصنف (ڈاکٹر رضی الدین) کو مولانا کے ان دونوں نظریوں کے درمیان تضاد و تخالف نظر آیا اور انہوں نے اس تضاد کی توجیہ مولانا کے مزاج کی انا و انفرادیت سے کی۔ لکھتے ہیں:

"جمہوریت کو عقیدہ صحیح تسلیم کر لینے کے بعد بھی جب اقبال اور ابوالکلام دونوں عوام کو آخری فیصلہ کن قوت ماننے سے انکار کر دیتے ہیں تو دونوں کی جمہوریت پسندی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے یہ دونوں جب اس پر اصرار کرتے ہیں کہ قومی بہتری کا دارو مدار چند افراد خاص پر ہے اور عوام ان کے

تابع مہمل ہیں تو یہ جمہوریت کے بنیادی تصوری کا انکار ہے"

مصنف نے مولانا کے ایک ناقد (حسن عسکری) کے حوالے سے لکھا کہ فطری میلان اور معاشرتی جھکاؤ میں اقبال و آزاد کے ہاں جس طرح کی ذہنی کشمکش ملتی ہے وہ بڑی سخت آزمائش کی نوعیت رکھتی ہے۔

ان کی اصل مشکل ان کے فطری رجحان اور ان کے مذہبی میلان کے درمیان بعد کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے (نقد ابوالکلام)

نامکمل مطالعہ کے بعد مولانا کی تحریروں پر اس قسم کی تنقیدات شروع ہی سے جاری ہیں سیاسی کشمکش کے دور میں مولانا کے دینی عقائد کو مجروح کر کے مولانا کی مذہبی عظمت کو عوام کی نظروں سے گرانے کی حاسدانہ کوششوں کی ایک طویل داستان ہے۔

بہر حال مولانا نے اسلامی شورائیت اور اسلامی امیر کے درمیان تعلق کی نوعیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے اجتماعیت اور انفرادیت کے حدود پر بڑی جامع بحث کی ہے۔

اسلامی شوریٰ اور اسلامی امیر

اسلام نے اجتماعی نظام چلانے کے لئے شورائیت کا حکم دیا ہے اور باہمی مشورہ سے اجتماعی معاملات کو طے کرنے کی ہدایت کی ہے۔

اس مسئلہ کی ہدایت قرآن کریم نے اس الفاظ میں کی ہے و شاورھم فی الامیر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ، ان اللہ یحب المتوکلین (آل عمران ۱۵۹)

یہ خطاب رسول اکرم ﷺ کو کیا گیا ہے لیکن اس کی ہدایت ایک عام اور اصولی ہدایت ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی! تم اپنے خاص رفقاء سے حکومتی اور انتظامی معاملات (الامر) میں مشورہ کر لیا کرو، پھر جب تم عزم و ارادہ کر لو تو خدا کی ذات پر بھروسہ کر کے عمل پیرا ہو جاؤ، بے شک خدا تعالیٰ اعتماد کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اس قرآنی ہدایت میں مشورہ کے بعد عزم پر عمل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ یہاں اس کی تشریح میں اہل علم کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ہے بعض کی رائے ہے کہ شوری کے

فیصلہ (اتفاقی یا اکثریتی) کے بعد امیر کو اس کی پابندی کرنی ضروری ہے یا سورہ سے برابر اس سے اتفاق نہ ہو تو اس فیصلہ کے خلاف اپنی قائم کردہ رائے پر عمل کرنے کی امیر کو اجازت حاصل ہے ،یعنی امیر جماعت کو حق تنسیخ حاصل ہے یا نہیں؟

ہندوستان کے علماء میں مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ، اور مولانا ابوالکلام آزاد حق تنسیخ کے قائل ہیں اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مفتی کفایت اللہؒ تنسیخ اور استرداد کے قائل نہیں ہیں۔ شوریٰ کی بالادستی کے قائل ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کی حیات پاک میں حق تنسیخ استعمال کرنے کی کوئی مثال نہیں ملتی، آپ نے اجتماعی اور انتظامی معاملات میں پانچ اہم موقعوں پر حضرات صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا اور پھر اسی کے مطابق عمل کیا۔

البتہ آپ کے جانشین اول حضرت ابو بکر صدیقؓ نے مانعین زکوۃ (زکوۃ کی اجتماعی ادائیگی) کے خلاف اقدام کا فیصلہ اپنے ذاتی عزم وارادہ سے کیا، حالانکہ بڑے بڑے اکابر کی رائے ابتداء میں اقدام کے حق میں نہیں تھی۔

مولانا آزاد نے خلیفہ رسول اللہ ﷺ کے اسی عمل کو مثال میں پیش کر کے امیر کے حق تنسیخ کی تائید میں پیش کیا ہے۔

مولانا لکھتے ہیں:

”جب مانعین زکوۃ کے ساتھ جہاد کا سوال تھا تو تمام مجمع صحابہ کی رائے ایک طرف تھی اور حضرت ابو بکرؓ کی ایک طرف۔ یعنی سواد اعظم جہاد کے خلاف تھا۔ حضرت ابو بکر مجبور تھے، پھر کیا حکم لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت ابو بکر نے اتبعوا اسواد الاعظم کی مخالفت کی۔ حاشا وکلا (تذکرہ آزاد ص ۴۶)

مولانا نے اصول ومتاصد کی نوعیتوں کے درمیان فرق واضح کرتے ہوئے لکھا:

”دراصل ان تمام احکام (اکثریت کا اتباع) کا تعلق امامت کبریٰ سے ہے۔ یعنی خلافت اسلامیہ کے معاملے سے۔ نہ کہ عقائد وافکار سے“ (ص ۲۴)

مولانا آیت آل عمران (۱۵۹) کی تشریح میں لکھتے ہیں:

اس بارے میں دستور العمل یہ ہے کہ پہلے جماعت سے مشورہ کرو، پھر مشورہ کے بعد کسی ایک بات کا عزم کرلو اور جب عزم کرلیا تو اس پر مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ۔

شوریٰ اپنے محل اور وقت میں ضروری ہے۔ عزم اپنے محل اور وقت میں۔ جب تک مشورہ نہیں کیا ہے فیصلہ اور عزم کا سوال نہیں اٹھتا۔

لیکن جب مشورہ کے بعد عزم کرلیا گیا تو وہ عزم ہے۔ کوئی رائے کوئی نکتہ چینی، کوئی مخالفت اسے متزلزل نہیں کرسکتی (ترجمان القرآن اول ص ۳۱۷)

امیر اسلام پر شوریٰ کی بالادستی کے قائل علماء کا استدلال حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ایک مستند روایت ہے۔

فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ "ماالعزم یا رسول اللہ"؟ آیت آل عمران میں عزم سے کیا مراد ہے؟

آپؐ نے فرمایا:

مشاورۃ اھل الرائے ثم اتباعھم۔ اصحاب الرائے یعنی شوریٰ سے مشورہ کرنا اور پھر ان کے فیصلہ کا اتباع کرنا۔

یعنی عزم سے۔ عزم نفاذ۔ مراد ہے۔ شوریٰ کے فیصلہ کو نافذ کرنے کا عزم۔ نہ کہ اس فیصلہ کے خلاف اپنی ذاتی رائے پر عمل کرنے کا عزم۔

اس روایت کو محدث دیلمی نے روایت کیا ہے، صحاح ستہ کے محدثین نے نقل نہیں کیا۔ ہوسکتا ہے کہ اس روایت کو سند کے لحاظ سے کمزور ہونے کے سبب حق تنسیخ کے قائل علماء نے قابل استناد نہ سمجھا ہو۔

علامہ اقبال، اجتماعیت، انفرادیت

نقد ابوالکلام کے مصنف نے علامہ اقبال کے جس تصور کی طرف اشارہ کیا ہے وہ علامہ کی مشہور کتاب The Reconshru chion of Religions thonght in Islam the Principle of Movement in the Stochur of Islam کے چھٹے خطبہ میں ہے جو اجتہاد کے موضوع پر ہے۔

علامہ لکھتے ہیں!

مسلمانوں کے فکری جمود کی تیسری اور سب سے اہم وجہ تیرھویں صدی عیسوی میں بغداد کی تباہی ہے جو مشرق میں مسلمانوں کی علمی اور عقلی جدوجہد کا واحد مرکز تھا۔

اس سیاسی انحطاط کے پیش نظر علماء نے مسلمانوں کی سماجی زندگی کو انتشار سے بچانے کیلئے قانون اسلامی کی تجدید کاری روک دی اور فیصلہ کر دیا کہ ابتداء میں مسلم فقہاء نے جو اسلامی قانون مدون کر دیا ہے اس میں کسی تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس موقعہ پر اجتہاد کا مطلب مسلم معاشرہ کو فکری اور عملی انتشار میں مبتلا کرنا ہوگا۔

علامہ کو اس طرز فکر سے اتفاق نہیں ہے، انہوں نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھا کہ کسی قوم کی تقدیر کا فیصلہ تنظیم سے کہیں زیادہ افراد کی ذہنی قوت پر ہے اور علماء اسلام نے اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا کہ حد سے زیادہ منظم سماج میں افراد کی ذہنی صلاحیتیں کچل جاتی ہیں اور وہ اپنی ذہنی قوتوں کو استعمال کرنے کے بجائے مروجہ تصورات وافکار ہی پر اکتفاء کرتے ہیں اور بتدریج ماضی کا غیر ضروری احترام ان کے دل ودماغ پر مسلط ہو جاتا ہے جیسے کہ آج کل مسلمانوں کا ذہنی رویہ ہے۔

زوال میں مبتلا قوم کو اٹھانے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ زوال میں مبتلا قوم کی قوتِ فکریہ کو بے دار کیا جائے اور اس کے لئے ایسے افراد تیار کئے جائیں جو اپنے اندر اپنی ذہنی اور فکری قوت کا احساس رکھتے ہوں۔

اسی قسم کے افراد قوم کو بتاتے ہیں کہ بدلتے ہوئے حالات میں کیا فکری اور عملی راہ اختیار کی جائے۔

یہود پر خیانت کا الزام، علماء یہود کی تحریف

راقم سطور نے یہ مضمون مولانا ابوالکلام آزاد سیمینار خدابخش لائبریری پٹنہ میں پیش کیا یہ سیمینار ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب انصاری ڈائرکٹر لائبریری کی انتھک کوششوں کے بعد ۲۸۔۳۰/ جون ۲۰۰۳ء کو منعقد ہوا۔ اس سہ روزہ سیمینار میں ڈاکٹر صاحب ہندوستان کی مختلف بڑی یونیورسٹیوں کے پروفیسر صاحبان کو جمع کرنے میں کامیاب ہوئے۔

مضمون کا بنیادی مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور یہود کے واقعات میں ایک واقعہ مصر کی قبطی قوم کو یہود کی طرف سے دھوکہ دینے کا مذکورہ ہے، جسے موجودہ بائبل نے نقل کیا ہے اور بائبل سے قرآن کریم کی تفسیروں میں داخل کر دیا گیا ہے۔ اصولی طور پر یہ مسئلہ ایک مسلم اور مومن قوم کا ایک غیر مسلم قوم کے ساتھ خیانت کاری کرنے کا ہے۔ مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں ثابت کیا ہے کہ اپنے اسلاف یہود پر خیانت کاری کا الزام یہودی علماء کی تحریفات میں سے ہے ورنہ یہ بات غلط ہے کہ یہود نے مصری قوم سے دھوکہ دے کر زیورات حاصل کئے اور قرآن کریم واضح طور پر یہود کو اس الزام سے بری قرار دیتا ہے، مولانا آزاد نے اس سابق مذہب (توراۃ) کے اس قدیم مسئلہ کی تحقیق پر اس لئے توجہ دی کہ مولانا انسانی تکریم (قرآن) اور انسانی اخوت (حدیث) کے اصول کو تمام ادیان و مذاہب کا مشترک اصول قرار دیتے ہیں۔

مولانا مرحوم نے بنیادی حکم کا تصور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اہم ترین دعاء یعنی دعا کے موثر پیرایہ میں اہم اعلان سے حاصل کیا ہے جو امام ابوداؤد نے اپنی کتاب ابوداؤد شریف کتاب الصلاۃ ص ۲۱۱ میں حضرت زید ابن ارقم صحابی سے روایت کی ہے۔

اس دعا کی طرف میرے نزدیک مولانا آزاد کے وہبی ذوق (تکریم آدم) اور الہامی فہم نے توجہ مبذول کی ورنہ اس سے پہلے اس اہم ترین اور بلاغت کلام رسول کے اعلیٰ ترین نمونے کا نشان اردو لٹریچر میں کہیں نہیں ملتا۔ اس دعاء کا تیسرا فقرہ یہ ہے:

---

* کنزہ شیخ چاند۔ لال کنواں، دہلی

اللھم انا شھید ان الناس کلھم اخوۃ یعنی خداوندا میں اس بات پر گواہ ہوں کہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔اس دعاء پر تفصیلی روشنی علیحدہ مضمون میں ڈالی گئی ہے۔مولانا آزاد کے اس نظریہ کا یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ مولانا نے سابق شریعت (توراۃ) کے بارے میں بھی اگر علماء یہود کی تحریف کے ذریعہ داخل کی گئی کوئی بات اس بنیادی اصول کے خلاف دیکھی تو اس پر تنقیدی نظر ڈالی اور توراۃ کے احکام کو تحریف سے پاک کیا۔

انسانی اخوت، توراۃ اور قرآن دونوں میں!

انسانی حرمت اور اخوت کا تصور دنیا کی پہلی آسمانی شریعت (توراۃ) اور آخری شریعت (قرآن کریم) دونوں میں موجود ہے۔فرق یہ ہے کہ توراۃ میں اجمالی ہدایت ہے اور قرآن اس ہدایت کو دلیل کے ساتھ پیش کررہا ہے اور یہ بات قرآن کریم کی خصوصیت یعنی تکمیلی شان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تکریم یعنی انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا تصور تمام دینوں اور تمام آسمانی کتابوں کے اندر مشترک ہے اور یہ تصور اصول دین میں داخل ہے۔

قرآن کریم نے توراۃ کے اس عہد کو نقل کیا جو بنی اسرائیل سے خدا تعالیٰ نے لیا، فرمایا:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ (بقرہ ۸۳) ''اور وہ وقت قابل ذکر ہے جب ہم نے (خدا نے) بنی اسرائیل سے یہ عہد کیا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور عام لوگوں سے اچھی بات کرنا اور نماز قائم کرنا اور زکوۃ ادا کرنا۔پھر اے بنی اسرائیل! تم نے (تمہارے اسلاف نے) اس عہد سے منہ موڑ لیا چند افراد کے سوا اور تم روگردانی کرنے والے ہو، تمہاری یہ پرانی عادت ہے'' یہ عہد و میثاق یہود سے توراۃ کی مستقل شریعت نازل ہونے سے پہلے مصری زندگی میں کیا گیا اور یہ عہد و پیمان ان (۹) احکام میں داخل ہے جس کا تذکرہ قرآن کریم بنی اسرائیل (۱۰۱) میں کیا گیا ہے۔اسی عہد کے مطابق قرآن کریم نے اہل ایمان کو یہ حکم دیا:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـــًٔـا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۝ (سورہ نساء ۳۶)

''اے لوگو! خدائے واحد کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ احسان کرو اور رشتہ دار پڑوسی کے ساتھ اور اجنبی پڑوسی کے ساتھ اور اپنے ہم نشیں کے ساتھ بھی احسان کرو اچھا سلوک کرو، اور مسافروں کے ساتھ اور ان زر خرید غلاموں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو بے شک اللہ تعالیٰ گھمنڈ کرنے والوں اور بے جا فخر و غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا'' ابن کثیر کی تشریح کے مطابق بعض علمائے تفسیر کے نزدیک قول حسن سے امر بالمعروف مراد ہے اور بعض حضرات قول حسن کو خلق حسن (حسن سلوک) کے مفہوم میں لیتے ہیں اور اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں: کل خلق حسن رضیه الله تعالیٰ، یعنی اللہ تعالیٰ بہترین عادت اور بہترین سلوک کو پسند کرتا ہے۔

ان حضرات کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو صرف زبانی اچھائی پسند نہیں بلکہ زبانی کے ساتھ عملی اچھائی بھی ہو تب وہ عمل خدا کو پسند ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا: فالق اخاک بوجہ منطلق اپنے بھائی سے ہنس مکھ چہرہ کے ساتھ ملو، اس کا مطلب واضح ہے کہ صرف میٹھے بول کافی نہیں بلکہ ہنس مکھ چہرہ کا اظہار بھی ہونا چاہیے۔

اب اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ تو حسن سلوک کا حکم دیا اور عام لوگوں کے ساتھ صرف زبانی اچھائی کی ہدایت دی۔ اس کا جواب صحیح مسلم میں ابو عامر خراز کی توجیہہ کے ذریعہ یہ دیا گیا کہ اس ہدایت آسمانی میں رشتہ داروں اور عام لوگوں کے درمیان فرق کرنا مقصود نہیں بلکہ احسان عملی اور احسان قولی دونوں صورتوں کو جمع کرنا مقصود ہے کیونکہ رشتہ داروں کے ساتھ ضرورت مند لوگوں (یتامیٰ اور مساکین) کو شامل کیا گیا ہے اور ان دو طبقوں کو شامل کر کے عموم پیدا کیا گیا ہے، اب مطلب یہ ہوا کہ خلق خدا کے ساتھ حسن سلوک اختیار کیا جائے، وہ ماں باپ اور رشتہ دار ہوں یا عام محتاج و ضرورت مند ہوں۔

قرآن کریم کی ہدایت و صاحبہما فی الدنیا معروفا (لقمان ۱۵) کو اگر اس کے ساتھ ملا دیا جائے تو ماں باپ اور ضرورت مندوں کا مسلمان ہونا ضروری نہیں مسلم ہوں یا غیر مسلم ہوں، سب کے حقوق برابر ہیں۔ توراۃ کا مذہب قومی تھا تبلیغی مذہب نہیں تھا، اس لئے جو شخص بھی اسرائیل کی اولاد میں سے تھا وہ یہود سے تھا وہ یہودی اور دین موسیٰ میں شامل تھا خواہ عملی طور پر وہ کتنا ہی خراب ہوا۔ اسلام تبلیغی مذہب ہے، اشاعتی مذہب ہے اور اس کو ماننے والی امت آفاقی ہے، اس مذہب میں یہ صورت

پیدا ہوئی لازمی تھی کہ اولاد اسلام سے مشرف ہو جائے اور ماں باپ اور دیگر رشتہ دار مشرف باسلام نہ ہوں اس لئے قرآن نے حضرت لقمان کے حوالے سے اس امت کو مذکورہ ہدایت کی اور حکم دیا کہ اصحاب حقوق، ماں باپ وغیرہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم ہوں ان کے ساتھ عام دستور کے مطابق حسن سلوک اختیار کیا جائے۔

ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں اسد بن وداعہ اور عطا خراسانی (علماء تابعین) کا یہ واقعہ نقل کیا کہ یہ دونوں حضرات اپنے عیسائی اور یہودی ملاقاتیوں سے ملتے وقت اسلام علیکم کا کلمہ استعمال کرتے تھے اور جب لوگ ان سے سوال کرتے کہ آپ حضرات ان غیر مسلم لوگوں (اہل ذمہ) کو ابتدا بالسلام کیوں کرتے ہیں تو وہ جواب دیتے۔ان اللہ تعالیٰ یقول: وقولوا للناس حسنا ،وھو السلام علیکم ''اللہ تعالیٰ نے عام لوگوں سے اچھی بات کہنے کا حکم دیا ہے اور اس اچھی بات سے السلام علیکم مراد ہے(ابن کثیر جلد اول ص:۱۲۹)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک قول حسن سے خاص طور پر کلمہ خیر مقدم اور ملاقاتی کلام مراد ہے۔مولانا آزادؒ نے ابن ابی حاتم کے اثر کے مطابق قول حسن کا ترجمہ یہ کیا:''تمام انسانوں سے اچھی طرح ملنا''یعنی اچھی طرح ملاقات کرنا۔مولانا آزاد نے اس جگہ اپنے مقتدا شاہ ولی اللہ اور ان کے دونوں صاحبزادوں کی پیروی نہیں کی، شاہ ولی اللہ قولوا کا لفظی ترجمہ'' بگوئید سخنی نیک'' کرتے ہیں اور دوسرے تمام اہل تراجم قول کا ترجمہ'' کہنا''ہی کر رہے ہیں، مگر مولانا نے علماء تابعین کی تفسیر کو ترجیح دی جو ان کے اصول (تکریم آدم) کے مطابق ہے۔

علامہ ابن کثیر چونکہ ابتداء بالسلام (اہل ذمہ سے) کے قائل نہیں معلوم ہوتے اس لئے وہ مذکورہ اثر سے اتفاق نہیں کرتے لیکن اس کے باوجود امام محترم سورہ نساء کی ۱۱۰ ویں آیت کی تشریح میں یہ لکھ رہے ہیں۔فقامت ھذہ الامۃ من ذلک بمالم تقم بہ امۃ من الامم قبلھا''ان اعلیٰ اخلاق پر چلنے کی وجہ سے یہ خیر امت مقام عالی پر پہنچی جس پر کوئی پہلی امت نہیں پہنچ سکی۔''اس آیت میں جس خاص اخلاقی کردار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کو ماننے والا ہر اس انسان کو اپنا پڑوسی تصور کرتا ہے جو اس کے پاس تھوڑی دیر کے لئے بھی بیٹھتا اٹھتا ہے اور یہ اس کا عارضی پڑوسی ہے۔علامہ ایک طرف ایک ضعیف روایت کی وجہ سے اہل ذمہ کے ساتھ استقبال بالسلام کے قائل نہیں ہیں اور دوسری طرف اخلاق عام اختیار کرنے کی وجہ سے اس امت کی تعریف کر رہے ہیں۔

جواز بالسلام کے قائل صحابہ!

امام نووی نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ اہل کتاب کے ساتھ ابتداء بالسلام کے قائل صحابہ کرام میں حضرت ابن عباس اور حضرت ابوامامہ وغیرہ ہیں اور تابعین میں حضرت عکرمہ، امام نخعی اور امام اوزاعی ہیں (مسلم جلد ثانی ص:۲۱۴) مشہور فقیہ و محدث ہند مولانا رشید احمد گنگوہی نے لکھا ہے: ضرورت کے وقت غیر مسلموں کو السلام علیکم کہنا مباح ہے (فتاویٰ رشیدیہ جلد اول ص/۶۰) حضرت گنگوہی نے بھی اس روایت کی صحت کو تسلیم نہیں کیا۔ جس روایت حدیث میں اہل کتاب کے ساتھ ابتدا بالسلام کی ممانعت آئی ہے اس روایت کی صحت صحابہ کرام اور تابعین کی ایک بڑی جماعت تسلیم نہیں کرتی اور اس کی بنیادی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس ممانعت سے اہل معاہدہ غیر مسلموں کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے اور امن و قانون پسند غیر مسلموں (ذمیوں، معاہدوں) کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی اسلام کے قانون عدل پر پوری ذمہ داری عائد تھی اور اسلام نے اسے پورا کیا۔

تہذیبی اخوت و مساوات!

ایک آفاقی امت اور رنگ و نسل سے بالاتر ایک اصولی قوم نے اسلام کی بین الاقوامی اخلاقی اور سماجی قدروں کے مطابق زندگی اختیار کر کے عرب سے باہر ہر خطہ زمین پر دین توحید کی عظمت کے جھنڈے گاڑے، اور حدود توحید کے دائرہ میں رہ کر ہر ملک اور ہر قوم کے کلچر، زبان اور شادی اور موت کی فروعی رسموں کے ساتھ نفرت کا برتاؤ نہیں کیا کیونکہ ہر وہ عجمی قوم جس نے دین توحید قبول کیا وہ اپنے باپ دادا کی ریت رسم کو بالکل چھوڑ کر عرب کی سادہ اور تمدنی تکلفات سے پاک زندگی اختیار نہیں کر سکتی تھی۔ یہ فطرت انسانی کے خلاف ہے۔

اسلام اگر سماجی علحدگی پر زور دیتا تو اس کا اصولی پیغام توحید و نبوت پر ایمان اس طرح نہیں پھیل سکتا تھا، پھر ایسی علحدگی اور سماجی اچھوت والی زندگی کا حکم دینے والا اسلام عربوں کا قومی مذہب بن کر رہ جاتا۔ جو علماء من تشبہ بقوم کی حدیث کا دائرہ سماجی اور معاشرتی زندگی کے دائرہ تک وسیع کرتے ہیں وہ دراصل اسلام کو عربوں کا قومی مذہب تصور کرتے ہیں اور اس تصور کی پرزور تردید عصر حاضر اور دور جدید کے مجدد حضرت امام شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغۃ میں نہایت وضاحت کے ساتھ کی ہے۔

مصری قوم کے زیورات!

مولانا آزادؒ کے نزدیک انسانی جان و مال کے احترام کا اصول تمام ادیان اور تمام مذاہب

کے مشترکہ اصولوں میں داخل ہے۔ پہلی آسمانی شریعت (توراۃ) کے نزول سے پہلے جب خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اوران کی درخواست کے مطابق ان کے بڑے بھائی حضرت ہارون کو (بطور نائب معاون) نبی بنایا تو دین حق کے بنیادی احکام انہیں عطا کئے۔ انہی احکام کو قرآن نے تسع آیات (نو احکام) سے تعبیر کیا ہے اور ترمذی (کتاب التفسیر جلد۲ص:۱۵۹) کی روایت کے مطابق ان آیات سے دین حق کے بنیادی احکام مراد ہیں۔ البتہ ایک تفسیری قول میں تسع آیات سے نو معجزات مراد ہیں۔ ان احکام میں یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ لوگوں کا مال حرام طریقہ (سود وغیرہ) سے نہ کھانا یہ منفی انداز ہے، اس ہدایت کا مثبت انداز یہ ہے کہ ضرورت مندوں کی ضرورت بطور احسان پوری کرنا قرآن کریم بقرہ (۸۳) میں اسی ہدایت کا مثبت انداز اختیار کیا گیا ہے اور یہ حکم بیان کیا گیا ہے: قولوا للناس حسنا یعنی لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اختیار کرو سورہ بقرہ (۸۳) میں مذکور یہود کے ساتھ عہد و میثاق کی روشنی میں مولانا آزاد علیہ الرحمۃ نے بائبل کے حوالہ سے قرآن کریم کی قدیم وجدید تفسیروں میں یہ واقعہ دیکھا کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمراہی میں مصر سے نکلے تو ان کی عورتوں نے مصر کی قبطی بت پرست قوم کی عورتوں سے زیورات مستعار لے کر اپنے پاس رکھے اور انہیں ساتھ لے کر مصر سے نکل گئے۔

مولانا آزاد نے دو عظیم پیغمبروں (حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون) کی موجودگی میں اپنے شرعی حکم (حرام مال کھانے کی ممانعت) کے خلاف ورزی اور خیانت کاری کو مذاہب کے بنیادی اور مشترک حکم کے خلاف سمجھا اور اس واقعہ سے انکار کردیا۔ علماء تفسیر نے بائبل کے اس غلط واقعہ کی تاویلات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، کسی مفسر نے مصری قوم کے مال کو مشترک قوم کا مال ہونے کے سبب اسے مال غنیمت قرار دیا۔ لیکن دوسرے مفسرین نے اس تاویل کو مسترد کردیا کیونکہ مال غنیمت برسر جنگ قوم کے اس مال واسباب کو کہا جاتا ہے جو میدان جنگ میں ملے اور یہود بنی اسرائیل اور مصر کے قبطی عوام کے درمیان کوئی جنگ نہیں تھی جھگڑا صرف فرعونی حکومت کے ساتھ تھا اور دریائے نیل کے عذاب میں فرعون اور اس کا لشکر (جنود) غرق کیا گیا۔

چنانچہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے یہود بنی اسرائیل اور مصر کی بت پرست قبطی قوم کے درمیان عہد عملی کی صورت تجویز کی ہے اور حضرت موسیٰ کے ایک قبطی کو سہواً ہلاک کرنے کے واقعہ کو ایک معاہد قوم کے فرد کے ساتھ زیادتی کا واقعہ قرار دیا ہے اسی بنا پر حضرت موسیٰ نے اس قتل پر استغفار

کیا۔اسی نظریہ کے تحت حضرت تھانوی کے خلیفہ ارشد مفتی محمد شفیع صاحب (پاکستان) نے قبطی قوم کے مال (زیورات) کو مال غنیمت قرار دے کر اس عمل کی تاویل کو مسترد کردیا ہے۔صاحب معارف القرآن نے سامری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ سامری نے بنی اسرائیل سے کہا کہ یہ زیورات تم نے قبطی لوگوں سے مستعار لئے تھے اب وہ سب غرق ہو گئے اور وہ زیورات تمہارے پاس رہ گئے، یہ تمہارے لئے حلال نہیں کیونکہ کفار سے جنگ کے وقت حاصل شدہ مال غنیمت بھی اس زمانہ میں مسلمانوں کے لئے حلال نہیں تھے'' (معارف سورہ اعراف ۶۷)

اس قول کا مطلب یہ ہوا کہ سامری یہودیوں کو دھوکا دینا چاہتا تھا کہ جن لوگوں کے یہ زیورات ہیں وہ سب غرق ہو گئے (حالانکہ غرق ہونے والے فرعون اور اس کے لشکری تھے تمام مصری قبطی نہیں تھے) اس لئے تم اس مال کے جائز مالک ہو۔

مولانا آزاد کے دل میں جو تاویل و توجیہہ آئی وہ مولانا پر الہامی توجیہ کا القاء تھا مولانا کے کسی اور تحقیقی علم سے اس توجیہہ کا تعلق معلوم نہیں ہوتا۔مولانا نے بائبل کے واقعہ کی مکمل تردید کی اور قرآن کریم کے لفظ من زینۃ القوم (۸۷) کی تشریح کرتے ہوئے (ترجمان القرآن جلد دوم ۴۵۵) لکھا کہ زینت کے لفظ کی مصری قوم کی نسبت، ملکیت کی نسبت نہیں ہے بلکہ رواج و رسم ہونے کی نسبت ہے یعنی وہ زیورات مصری قوم (فرعونی قوم) کے مملوکہ نہیں تھے بلکہ ان کے قومی رواج میں داخل تھے جو یہود نے ان کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے اختیار کر لئے تھے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اپنی تفسیر میں اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہیں مگر اس واقعہ کی تفسیر میں مودودی صاحب کے سامنے مولانا آزاد کی پیروی کے سوا دوسری کوئی راہ نہیں تھی (تفہیم القرآن مختصر ص:۵۰۵) مودودی صاحب کی تفسیر مولانا آزاد کی تفسیر (ترجمان القرآن) سے پندرہ بیس سال کے بعد وجود میں آئی ہے۔(ترجمان القرآن ۱۹۳۱ء تفہیم القرآن ۱۹۵۱ء) اس ناچیز نے سابق تفسیروں کے مکمل حوالہ جات کے ساتھ مسئلہ کی تفصیل علاحدہ مضمون میں مرتب کی ہے۔ ☆☆☆

ایڈیٹر کے نام ترجمان دارالعلوم جدید

مراسلات

مکرمی!

راقم نے اپنے مضمون "یہود پر خیانت کا الزام" (شائع شدہ ترجمان دارالعلوم جدید ماہ جولائی ۲۰۰۳ء) میں زینۃ القوم کی توجیہ جو مولانا آزاد نے کی ہے اسے الہامی توجیہ سے تعبیر کیا ہے لیکن یہی واقعہ سورہ اعراف میں بھی بیان کیا گیا ہے اور اس میں یہ آیت مذکور ہے: واتخذ قوم موسی من بعدہ من حلیھم عجلا (اعراف: ۱۴۸)" اور موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیورات سے بچھڑا بنالیا۔" اس آیت میں حلیھم کی ضمیر ھم کا مرجع واضح طور پر قوم موسیٰ قرار پاتا ہے اور قوم فرعون سے مستعار لینے کے مفہوم کی تردید ہوتی ہے۔ یقیناً مولانا آزاد کی نظر سے یہ آیت گزری ہے اور اسی آیت کی روشنی میں مولانا نے زینۃ القوم (طٰہٰ۔۸۷) کی تشریح کی ہے۔ مولانا مرحوم اس آیت کا اپنی تشریح میں حوالہ دینا بھول گئے، اسی لئے راقم کو الہامی توجیہ کے الفاظ لکھنے پڑے۔ لیکن تعجب ہے کہ مفسرین نے اس واضح آیت کے باوجود مستعار لینے کی تشریح ایک من گھڑت اسرائیلی روایت کے مطابق کی ہے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کانوا استعاروا منھم امام ولی اللہ علیہ الرحمۃ نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے: "از زیور قبطیاں، حالانکہ شاہ صاحب، کے پیش رو فارسی مترجم سید شریف جرجانی نے لکھا: "از پیرایہائے خود" مولانا تھانوی صاحب نے مستعار اور استعارہ کے الفاظ سے تو احتراز کیا لیکن بیان القرآن کے قوسین میں مقبوضہ (قبضہ شدہ) کا لفظ لکھا، بات ایک ہی ہے، واضح مفہوم من حلیھم کا مملوکہ ہوتا ہے۔ دونوں شاہ صاحبان نے اپنے اردو تراجم میں "اپنے زیور" کے الفاظ تحریر کئے، اپنے والد محترم کی پیروی میں قبطیوں کے زیور کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مفسرین کرام یہودیوں سے اس قدر ناراض ہیں کہ ان کی طرف خیانت اور دھوکہ کی نسبت کرتے ہوئے ان حضرات کی نظر سے دو عظیم پیغمبروں کی عصمت کے مجروح ہونے کا پہلو مخفی رہا۔ واللہ اعلم بالصواب

(مولانا) اخلاق حسین قاسمی

مکرمی!

ترجمان دارالعلوم برابر مل رہا ہے اور ماشاء اللہ مضامین کا معیار خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہے۔
آپ کے اداریے بھی مثبت معنویت کے حامل ہیں۔ جولائی کے شمارے میں مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب نے مولانا زید ابوالحسن مجددی مرحوم کے مقدمہ کے جواب سے متعلق علماء سے استفسار کیا ہے، راقم سطور کے خیال میں یہ کار خیر مولانا

موصوف خود انجام دیں تو بہتر ہے۔ سر دست یہاں میرے پاس القول الجلی کا نسخہ نہیں ہے وہ مقدمہ کچھ یہاں وہاں سے سرسری نظر سے گزرا ہے۔ اصل مسئلہ اس مقدمہ کا ہی نہیں بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ کے علوم کی کامل تشریح و توضیح کا ہے، مولانا زید ابوالحسن کے جس فقرہ کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ شاہ ولی اللہ کو گروہ اسماعیلیہ وہابیہ، غیر مقلدین اور اہل حدیث نے تحریفات و تزویرات کر کے اپنے عوام کے سامنے پیش کیا ہے، مولانا زید نے وہابیہ، غیر مقلدین اور اہل حدیث کو تین فرقے بتایا ہے حالانکہ وہ ایک ہی فرقہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عالم عرب کے اکثر وہابیین امام احمد بن حنبلؒ کے متبع ہیں جن کے مذہب کی بنیاد احادیث رسول پر ہے۔ محمد بن عبدالوہاب بھی حنبلی المسلک ہیں وہ شاہ ولی اللہ کے ہم عصر تھے ہاں ان کی عمر کافی طویل رہی، دونوں نے توحید اور کتاب وسنت کی طرف رجوع کی دعوت دی لیکن علمی طور پر حضرت شاہ ولی اللہ کا دائرہ کار بہت وسیع وعریض ہے۔ بریلویوں کا المیہ یہ ہے کہ جو شخص یا گروہ ان کے فریم میں پوری طرح فٹ نہیں ہوتا فوراً اس پر وہابیت کا لیبل لگا دیتے ہیں، دوسرے مولانا زید ابوالحسن مجددی کو خالص بریلویت کا ترجمان سمجھنا بھی شاید صحیح نہیں، غالباً ان کا نسبی تعلق حضرت مجدد الف ثانی سے ہے اور حضرت مجدد صاحب شرک وبدعت کے صف اول کے قاطع وقامع رہے ہیں، انہوں نے لکھا ہے (ما را نصوص باید نہ فصوص) یعنی ہمیں قرآن وحدیث کے نصوص چاہییں شیخ ابن عربی کی فصوص الحکم نہیں۔ بہر حال شاہ صاحب "شرعی علوم وروایات کے ساتھ درایت اور روحانی علوم واقدار کے بھی حامل رہے ہیں اس لئے ان کے بارے میں کلام کرنے کے سبھی گوشوں کا جائزہ واحاطہ ضروری ہے۔ فیوض الحرمین، انفاس العارفین اور القول الجلی وغیرہ شاہ صاحب کی دوسرے درجہ کی تصانیف ہیں۔ القول الجلی میں ملفوظات ہیں جنہیں ان کے عزیز شاگرد شیخ عاشق پھلتی نے جمع کیا ہے ظاہر ہے ملفوظات عموماً مدارانہ کلام پر مشتمل نہیں ہوتے ہیں اور روایت کرنے میں بھی فرق واقع ہو سکتا ہے۔ شاہ صاحب کی اول درجہ کی تصانیف حجۃ اللہ البالغہ، التفہیمات الالہیہ، البدور البازغۃ، الانصاف فی اسباب الاختلاف، ازالۃ الخفاء وغیرہ ہیں۔ مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب کے سمینار کے مقالے شائع ہو جائیں تو شاید شاہ صاحب سے متعلق کچھ وقیع لٹریچر سامنے آئے ورنہ جس تحقیق وتدقیق سے افکار ولی اللہی کے مطالعہ وتجزیہ کی ضرورت ہے اس کا عشر عشیر بھی ابھی عمل میں نہیں آیا۔ کسی عظیم شخصیت کا مطالعہ کرتے وقت جہاں اس کے افکار وخیالات کی روح واساس تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے، وہاں یہ بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ عہد بہ عہد ان کے افکار میں کیا تبدیلی آئی اور آخری دور کی آراء کیا ہیں امام غزالی کے بارے میں محققین نے اسی کا لحاظ رکھا ہے۔ پہلے اور دوسرے درجہ کی تصانیف کی مثال یہ ہے کی امام بخاری نے اپنی صحیح میں روایات کی صحت کا جو معیار مقرر کیا ہے ان کی دیگر تصانیف میں اس معیار کا التزام نہیں ہے اسی طرح القول الجلی کے مندرجات وہ مرتبہ نہیں رکھتے جو حجۃ اللہ اور التفہیمات کے مضامین رکھتے ہیں بہر حال مولانا اخلاق حسین قاسمی خود اس موضوع پر خامہ فرسائی کریں تو بہتر ہے۔

(ڈاکٹر) خلیل الرحمٰن راز

دوحہ قطر

یہودیوں پر شرعی احکام کی سختی کا مسئلہ

شاہان دلی کی تحقیقی رائے

تفسیر و تاریخ کی کتابوں میں یہ بات بہت مشہور ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے یہودیوں کی نافرمانیوں کے سبب ان پر بعض سخت احکام نافذ کیے گئے۔ ان سخت احکام میں حسب ذیل باتیں نقل کی جاتی ہیں۔ مِن قتلِ النفس فی التوبة واخراج ربع المال فی الزکوة وقرض موضع النجاسة (جلالین: ص ۴۵) یہود پر گناہوں کی توبہ زبانی نہیں بلکہ اپنے آپ کو ہلاک کرنے کی صورت میں تھی اور ان پر زکوۃ میں چوتھائی مال ادا کرنا ضروری تھا اور جس جگہ نجاست لگ جائے اسے کاٹ کر پھینکنے کا حکم تھا۔

تفسیر کبیر اور روح المعانی میں (سوائے ابن کثیر کے) یہ تینوں باتیں سورہ بقرہ کی آخری آیات کی تفسیر میں بیان کی گئی ہیں۔ علامہ ابن کثیر نے بنی اسرائیل کا حوالہ دیے بغیر اجمال کے ساتھ یہ لکھا ہے۔ لا تکلفنا من الأعمال الشاقة وإن أطقناها کما شرعته للأمم الماضية یعنی اے خدا! ہمیں ان سخت اعمال کا مکلف نہ بنا جس طرح پچھلی امتوں کو بنایا گیا اور وہ ان اعمال کے طوق و سلاسل میں گرفتار ہوگئیں۔

اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کرنے سے پہلے اجمالی طور پر یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ، شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبد القادر صاحب (شاہان دلی) اس تفسیر سے متفق نظر نہیں آتے کہ خدا کی طرف سے کسی دور میں بھی لوگوں کو اعمال شاقہ اور عبادات شدیدہ میں ڈالا گیا۔ جہاں تک مذکورہ تین باتوں کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ یہ تینوں حکم نہ تو کسی صحیح حدیث سے منقول ہیں اور نہ عقل و فہم کے مطابق ہیں اور نہ توراۃ میں ان کا کوئی تذکرہ ملتا ہے۔ اس کے باوجود اس بات کی اتنی شہرت ہے کہ شاہ صاحبان کے بعد تمام اہل تراجم و تفاسیر نے (سوائے صاحب تفہیم القرآن کے) ان احکام شاقہ

کو تسلیم کیا ہے اور ان کے حوالہ سے یہودیوں کی نافرمانیوں پر روشنی ڈالی ہے۔

اس ناچیز کے سامنے یہ تفسیری مسئلہ اسلام آباد کے ایک خطیب مولانا راشد علی صاحب کے مکتوب پر آیا جس سے یہ معلوم ہوا کہ سعودی عرب کے بارے میں یہود و نصاریٰ کی مذمت سے متعلق آیات پر پابندی کی خبروں نے علماء پاکستان کے اندر بھی یہ موضوع کھڑا کر دیا ہے۔

خطیب صاحب کے خصوصی توجہ دلانے پر حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے تفسیری اجتہادات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اس خاکسار کو یہ مضمون تحریر کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔

سورہ بقرہ کی دعائیں!

یہ مسئلہ کہ خدا تعالیٰ نے یہودیوں کی مسلسل نافرمانیوں کی وجہ سے ان پر بعض سخت احکام نازل کئے، سورہ بقرہ کی حسب ذیل دعاؤں سے شروع ہوتا ہے: ربنا و لا تحمل علینا إصرا کما حملته علی الذین من قبلنا ربنا و لا تُحَمّلنا مالا طاقة لنا به و اعف عنا الخ (بقرہ ۲۸۶) اے پروردگار ما! منہ برسر ما بار گراں چنانکہ نہادی آں را بر کسانیکہ پیش از ما بودند، اے پروردگار ما یہ و منہ برسر ما آنچہ برداشت آں نیست مارا (ترجمہ اردو) اے ہمارے پروردگار! ہمارے سر پر بار گراں نہ رکھ جیسا کہ تو نے ان لوگوں پر رکھا جو ہم سے پہلے تھے اے ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر وہ (بوجھ) نہ ڈال جو ہماری طاقت سے باہر ہے۔

شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب دونوں حضرات نے پہلے فقرہ ''لاتحمل'' کا ترجمہ کیا ''اور نہ رکھ ہم پر بوجھ'' اور دوسرے فقرہ کا ترجمہ کیا ''نہ اٹھوا ہم سے وہ بوجھ۔'' بڑے شاہ صاحب نے اصر کا ترجمہ بار گراں کیا، یعنی مطلق رکھا، شرعی بوجھ مراد نہیں لیا، آپ کے صاحبزادگان نے بھی بار اور بوجھ کو مطلق رکھا البتہ دونوں کے درمیان ایک باریک فرق کر دیا۔ یعنی بوجھ نہ ڈال اور بوجھ نہ اٹھوا۔

یہ تعبیری فرق بتا رہا ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے دوسری دعاء کو پہلی دعا کی تاکید قرار دیا ہے۔

ان بنیادی تراجم کے بعد جتنے تراجم و تفاسیر اردو (سوائے تفہیم القرآن کے) وجود میں آئیں سب میں مشہور غیر مستند روایات کے مطابق ترجمہ و تشریح کی گئی۔ اور بار گراں اور بوجھ سے پہلے فقرہ میں تشریعی بوجھ (سخت احکام) مراد لیا گیا اور دوسرے فقرہ میں تکوینی اور تقدیری مشکلات کی طرف اشارہ کیا گیا۔

شاہ صاحب کے تراجم کے بعد پہلا اردو ترجمہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ہے، آپ نے اِصرا کا ترجمہ احکام سخت کیا اور پھر مولانا تھانوی نے اسے سخت حکم کر دیا۔ مولانا آزاد نے اجمال اختیار کیا

اور لکھا'' بندشوں اور گرفتاریوں کا بوجھ (ترجمان اول ۲۷۹)

مولانا ابوالاعلیٰ صاحب نے دونوں آیات میں الحمل ولاتحمل (فعل ثلاثی مجرد اور مزید فیہ) کے ترجمہ میں بوجھ اور بار کے مطلق الفاظ تحریر کئے ہیں اور تشریحی حواشی میں اسے واضح کر دیا ہے کہ اس بوجھ سے آزمائشوں اور مشکلات کا بوجھ مراد ہے، لکھتے ہیں:-

تیری راہ میں ہمارے پیش رووں کو جن آزمائشوں اور زبردست ابتلاؤں سے گزرنا پڑا ان سے ہمیں بچا، ہم پر مصائب کا اتنا ہی بوجھ ڈال جسے ہم سہار سکیں (۹۵)

شاہ عبدالقادر صاحب کی وسیع النظری:

دونوں بھائیوں کے تراجم میں جو باریک فرق نظر آرہا ہے اس میں اس ناچیز کی رائے یہ ہے کہ اصل اجتہاد شاہ عبدالقادر صاحب کا ہے شاہ رفیع الدین صاحب نے اپنے بھائی کی پیروی میں اپنے ترجمہ میں اسے اختیار کیا ہے کیونکہ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ پہلا ہے۔ اگرچہ دونوں بھائی فہم قرآن میں مہارت رکھتے ہیں لیکن پورے ترجمہ کے اندر جو وسیع النظری شاہ عبدالقادر صاحب کے ہاں ملتی ہے اس میں شاہ صاحب منفرد ہیں۔

شاہ عبدالقادر صاحب نے اس مسئلہ سے متعلق قرآن کریم کی دوسری آیات کو بھی سامنے رکھا ہے جیسا کہ شاہ صاحب کا عام معمول ہے، حضرت شاہ صاحب کسی مسئلہ سے متعلق تمام آیات کو پیش نظر رکھتے ہیں اور پھر ایک آیت کا مفہوم بیان کرتے ہیں۔

اب اس مسئلہ سے متعلق تمام آیات پر الگ الگ غور کیجئے اور یہ دیکھئے کہ اس مسئلہ سے متعلق تین آیات قرآن کریم میں واقع ہیں اور ان میں سے کسی آیت کی واضح دلالت اس نظریہ پر موجود نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہود پر احکام شاقہ نازل کر کے ان سے اپنی ناراضگی کا مظاہرہ کیا۔

آل عمران میں تحریم یعقوب علیہ السلام کا تذکرہ:

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِي إِسْرَآءِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآءِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰةُ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرٰةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ (آل عمران ۹۳) یہود علماء نے اعتراض کیا کہ اسلام نے کھانے پینے کی بعض ایسی چیزوں کو حلال کر دیا جو پچھلے رسولوں کے عہد میں حرام تھیں۔ قرآن کریم نے اس کا جواب اس آیت میں یہ دیا: یعنی کھانے پینے کی یہ ساری چیزیں جو شریعت اسلامی میں حلال ہیں وہ سب یہود بنی اسرائیل کے لئے حلال تھیں البتہ بعض چیزیں ایسی تھیں جنہیں

حضرت یعقوب علیہ السلام نے بطور نذر اپنے اوپر حرام کر لی تھیں تو راۃ سے پہلے پھر ان کی اولاد یہود نے بھی ان چیزوں کو اپنے لئے حرام قرار دے لیا۔

یہ حرمت یہود کی اپنی خود ساختہ تھی، تو راۃ کے اندر موجود نہیں ہے۔ اے یہود! تو راۃ اٹھا کر دیکھ لو، اگر تم سچے ہو، ان چیزوں میں اونٹ کا گوشت اور دودھ شامل تھا۔ تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تو اولاد یعقوب نے اپنے باپ کی نذر اور منت کی پیروی میں مذکورہ چیزوں کو عملی طور پر چھوڑا، پھر ان کے فقہاء نے ان چیزوں کی حرمت کو اعتقادی طور پر حرام قرار دینے کے لئے تو راۃ کے اندر تحریر کر دیا۔

اس صورت (تحریم یعقوب) کو تحریم خداوندی نہیں کہا جا سکتا، البتہ اس پہلو سے دیکھا جائے کہ خدا تعالیٰ نے تو راۃ میں یہود کے اس تصور اور طرز عمل کی تردید نہیں کی بلکہ سکوت اختیار کیا اور قرآن کریم میں اس کی تردید کی گئی۔ اس سکوت کے لحاظ سے اس تحریم کو تشریع الٰہی کہا جا سکتا ہے ورنہ نہیں۔

تحریم الٰہی کی آیات:

قرآن کریم میں یہود پر اعمال شدیدہ کے وجوب اور طیبات کی حرمت سے متعلق سورہ نساء (۱۶۰) میں اجمال کے ساتھ اور سورہ انعام (۱۴۷) میں تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔

سورہ نساء (۱۶۰) کی اجمالی آیت:

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۝ وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ یعنی ان یہود کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ پاک چیزیں حرام کر دیں جو پہلے ان کے لئے حلال تھیں، اور ان کی زیادتیاں یہ ہیں کہ یہ راہ حق سے لوگوں کو روکتے ہیں اور سود کھاتے ہیں، اور ناجائز طریقے سے لوگوں کا مال کھاتے ہیں۔

سورہ انعام کی تفصیلی آیت:

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَا اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَا اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (سورہ انعام) اس آیت میں ان پاک چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی طرف اشارہ سورہ نساء کی آیت (۱۶۰) میں کیا گیا ہے۔ یعنی اور ہم نے ان یہودیوں پر ہر ناخن والے جانور حرام کر دیے اور گائیں اور بکری کی چربی بھی سوائے اس چربی کے جو ان کی پیٹھ اور ان کی آنتوں میں ہوتی ہے یا ہڈی

کے ساتھ لگی ہوتی ہے وہ حلال رہی۔ یہ سزا تھی ان کی سرکشی کی اور ہم بالکل سچے ہیں۔

ظاہری مفہوم کے اعتبار سے یہ تحریم شرعی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے یہود پر پاکیزہ چیزیں حرام کیں، لیکن اسی کے ساتھ بطور سزا (بــغیـهـم) کی قید لگا کر تحریم کے مفہوم میں عارضی اور وقتی کا تصور پیدا کر دیا حقیقی تحریم دائمی ہوتی ہے۔ علماء کے ایک طبقہ (مولانا تھانوی) نے اسی عارضی تحریم کے مطابق ان آیات کی تشریح کی ہے یہ تحریم اگر دائمی اور فی نفسہ ہوتی تو آخری شریعت (قرآن کریم) میں بھی قائم رہتی۔

مولانا تھانوی کی تشریح یہ ہے:

سو ان چیزوں کی تحریم فی نفسہ مقصود نہ تھی بلکہ ان کی شرارت کے سبب ہم نے ان کو یہ سزا دی (بیان القرآن) مولانا عثمانی کے الفاظ یہ ہیں کہ وقتی مصلحت سے بعض چیزیں عارضی طور پر بعض اقوام پر حرام کی جا چکی ہیں (۱۹۶)

تکوینی تحریم کی رائے:

عارضی تحریم شرعی کے مذکورہ نظریہ کے مقابلہ میں علماء کے ایک طبقہ کی رائے یہ ہے کہ ان آیات میں جس تحریم کا ذکر کیا گیا ہے وہ تحریم تشریعی نہیں ہے بلکہ تحریم تکوینی اور تحریم تقدیری ہے۔ یہ رائے اس طبقہ کی ہے جس کے سامنے توراۃ کی یہ تاریخ ہے کہ ان جانوروں کی حرمت دوسری صدی عیسوی میں ہوئی، جب موجودہ یہودی شریعت کی تدوین یہودی عالم (ابی) کے ہاتھوں مکمل ہوئی اور توراۃ اپنے گمراہ فقہاء کے ہاتھوں تحریف کا شکار ہوئی۔

پھر اس صورت میں قرآن کریم نے اس مصنوعی حرمت کو اپنی طرف کیسے منسوب کیا؟ امام ابن کثیر (وفات ۷۷۴) نے اس تاویل کی وضاحت میں جو تقریر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مذکور اس رائے کی گنجائش سمجھتے ہیں، فرماتے ہیں:

وهذا التحريم قد يكون قدريا بمعنى انه تعالى قيضهم لان تأولوا فی كتابهم وحرفوا وبدلوا أشياء كانت حلالا لهم فحرموها على انفسهم تشديدا منهم على انفسهم و تضييقا وتنطعا (ابن کثیر جزء اول ۵۸۴) یہ تحریم تقدیری اور تکوینی ہے اس معنی میں کہ اللہ تعالیٰ نے ان یہود پر ایسے لوگ (علماء یہود) مسلط کر دیے جو ان کی کتاب (توراۃ) میں تحریفات کریں اور حلال چیزوں کو ان کے لیے حرام قرار دیدیں۔

پس ان علماء یہود نے اپنے اوپر اور اپنی قوم کے اوپر سختی کی اور تنگی کی اور اپنے حق میں غلو و تشدد کیا۔ یہاں تک کہ خدا کی آخری کتاب قرآن حکیم نے علماء یہود کی اس تحریف اور اپنے اوپر اس دینی تشدد کو دور کیا اور رسول آخر الزماںؐ کے بارے میں فرمایا:

ویحل لهم الطیبات ویحرم علیهم الخبائث ویضع عنهم اصرهم والأغلال التی کانت علیهم (اعراف ۱۵۷) یہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم اے اہل کتاب تمہارے لئے یہ تمام پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور ناپاک چیزوں کی حرمت کا اعلان کرتا ہے اور تم نے اپنے اوپر جو سخت احکام کا بوجھ لاد رکھا ہے اسے دور کرتا ہے اور تمہارے گلوں کے طوق گراں تمہاری گردنوں سے نکالتا ہے۔

علامہ ابن کثیر نے پہلی قسم کی حرمت (حضرت یعقوب کی نذر والی چیزوں کی حرمت کو) تشریعی حرمت سے تعبیر کیا ہے، اس معنی میں کہ اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں اس خود ساختہ حرمت کو ختم نہیں کیا۔ توراۃ سے پہلے بنی اسرائیل میں کوئی باقاعدہ شریعت نہیں تھی، حضرت ابراہیم کی اولاد کی اس شاخ (بنی اسحاق) کے اندر بھی ملت ابراہیمی جاری تھی، توراۃ کی شریعت اولاد ابراہیم کی اس شاخ میں پہلی مکمل شریعت تھی۔

دوسری نسلی شاخ (اولاد اسماعیل) میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ شریعت اسلام اور قرآن نازل ہوا، جو توراۃ اور پھر انجیل کے کئی سو سال کے بعد نازل ہوا۔ قرآن خدا کی مستقل اور دائمی شریعت ہے، اس شریعت میں حرام و حلال کا دائمی قانون نازل کیا گیا اور یہودیوں میں جاری حرمت کی تردید کی گئی۔

اس تردید پر یہود نے اعتراض کیا کہ قرآن ملت ابراہیمی سے تعلق کا دعویٰ کرتا ہے مگر جو جانور حضرت ابراہیم سے حرام چلے آرہے ہیں ان کے حلال ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔ قرآن کو یہود کی اس غلط فہمی کی تردید کرنی ضروری تھی، اس تردید میں حضرت یعقوب کی نذر اور منت والی تحریم زیر بحث آئی اور قرآن نے یہود کو اس حرمت سے نکلنے اور حلال و طیب چیزوں کے کھانے کی دعوت دی اور قرآن پر ایمان لانے کے لئے انہیں بلایا۔

مودودی صاحب نے خدا کی طرف سے یہود کو اس خود ساختہ تحریم پر چھوڑے رکھنے کی مصلحت ان الفاظ میں بیان کی کہ اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر انہیں اس غلط فہمی میں مبتلا رہنے دیا (مختصر تفہیم ۲۴۵) یہ تکوینی تحریم کی ایک تعبیر ہے۔

شریعت آسانی، طاقت کے مطابق:

خدا تعالیٰ نے جس طرح آخری شریعت الٰہی کی کتاب قرآن کریم کو ہدایت اور رحمت کے اوصاف سے متصف کیا ہے اسی طرح دنیا کی پہلی شریعت اور پہلی قانونی کتاب توراۃ کو بھی ہدایت اور رحمت کے اوصاف سے یاد کیا ہے۔ وفی نسختہا ھدی و رحمۃ (اعراف ۱۵۴) اور توراۃ کی تحریروں میں ہدایت اور رحمت تھی۔ اس رحمت کو زحمت میں بدلنے کا جرم یہودی علماء نے کیا قرآن کریم نے احکام الٰہی کے بارے میں یہ واضح اصول عام بیان کیا۔ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا (بقرہ) اللہ تعالیٰ کسی شخص پر اس کی مقدار طاقت سے زیادہ کوئی حکم واجب نہیں کرتا (شاہ ولی اللہ) اور اللہ تعالیٰ کسی انسان کو تکلیف (شرعی) نہیں دیتا مگر اس کی گنجائش کے مطابق (شاہ عبدالقادر صاحب) مگر اس کی طاقت اور اختیار کے مطابق (مولانا تھانوی) اللہ تعالیٰ کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا۔ (مولانا آزاد) یہ اصول عام قرآن کریم میں بقرہ کے علاوہ انعام (۱۵۲) میں اور اعراف (۴۲) میں نساء (۸۴) اور المومنون (۶۲) میں بھی بیان کیا ہے۔ اسی اصول عام کی روشنی میں قرآن کریم میں امت مسلمہ کو شریعت اسلام کے آسان اور سہل ہونے کا یقین دلایا۔

روزہ کے بارے میں کہا گیا: یرید اللہ ان یخفف عنکم (نساء ۲۸) یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (بقرہ ۱۸۵) اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے دشواری نہیں چاہتا۔ اہل وعیال کے نان ونفقہ کے بارے میں کہا گیا ہے لا یکلف اللہ نفسا الا ما اتاھا (طلاق ۷) اللہ تعالیٰ کسی نفس پر نان ونفقہ کی اتنی ہی ذمہ داری عائد کرتا ہے جتنا مال اس نے دیا ہے۔

جہاد کے بارے میں خلیفۃ المسلمین (بواسطہ رسول پاک) سے کہا گیا فقاتل فی سبیل اللہ لا تکلف الا نفسک وحرض المومنین (نساء ۸۴) اے نبی آپ راہ حق میں جہاد کریں اور آپ صرف اپنی ذات کے ذمہ دار ہیں ہاں مسلمانوں کو ترغیب دیں جہاد کی۔

غیر تحقیقی موازنہ:

بعض عوامی تفسیروں (روح البیان) میں شریعت اسلامی اور شریعت توراۃ کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے نہایت غلط باتیں بیان کی گئی ہیں۔ جیسے تفسیر روح البیان کے مصنف نے لکھا ہے شریعت اسلامی کے مقابلے میں توراۃ کے اندر جو سخت احکام ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) پانی کے بغیر پاک نہ ہونا۔ یعنی تیمم کرنے کی اجازت نہ تھی۔

(۲) دن رات میں پچاس نمازیں۔

(۳) مسجد کے علاوہ نماز کی کسی جگہ ادائیگی کی اجازت کا نہ ہونا۔

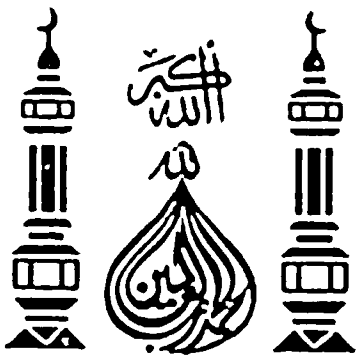
(۴) سونے کے بعد روزہ دار کے لئے کھانے پینے کی ممانعت۔

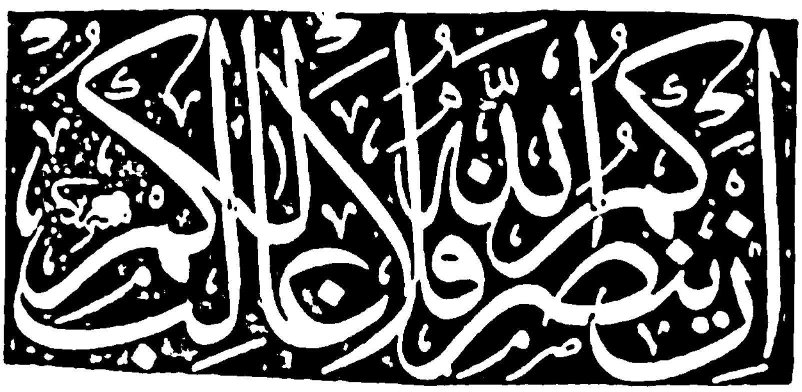
(۵) بعض پاک چیزوں کی حرمت۔

(۶) دروازہ پر گناہ گار کے گناہ کا تحریر ہونا۔

اس مصنف کو اس بات کا شعور نہیں کہ شریعت اسلامی اور قرآن حکیم خدا تعالیٰ کی آخری شریعت ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری رسول ہیں۔ اسی لئے اسلامی ہدایات و احکام پوری قوم انسانی کی رہنمائی کا ابدی نظام ہے جس میں حالات کے تقاضوں کے مطابق مکمل آسانیاں ہیں، سہولتیں ہیں، رخصتیں ہیں، یقیناً یہ فضیلت ہے اسلام کی لیکن یہ آسانیاں شریعت موسیٰ کے لئے ضروری نہیں تھیں تو راۃ کی شریعت ایک وقتی اور قومی (اسرائیلی) شریعت تھی اور اس میں اپنے حالات کے مطابق آسانی رہنمائی کا ضروری سامان موجود تھا۔

آج کی آسانیاں آج کی ضرورت ہے، وہ کل کی ضرورت نہیں تھی اس لئے ان آسانیوں سے سابق شریعت کا خالی ہونا اس کا نقص شمار نہیں ہوتا۔ ☆☆☆





نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف استغفار کی نسبت اور متقدمین علماء تفسیر کی توجیہات

رسول معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف استغفار کی نسبت کا مسئلہ تفسیر قرآن کریم کا اہم مسئلہ ہے، اسلام کا عقیدہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام گناہوں سے محفوظ ہیں۔ پھر قرآن کریم میں ان حضرات کو استغفار کرنے کی ہدایت کا کیا مطلب ہے ؟ پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مسئلہ کو لیجئے: قرآن کریم میں ایک جگہ سورہ محمد (۱۹) میں خدا تعالیٰ نے حضور کو اپنے گناہ کے لئے استغفار کرنے کا حکم دیا ہے اور ایک جگہ سورہ فتح (۱) میں حضور کے اگلے پچھلے گناہوں کی معافی کا اعلان کیا گیا ہے۔ سورہ نصر (۳) میں بغیر ذنب کے استغفار کا حکم دیا گیا ہے:

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا "اے نبی پروردگار کی حمد وثنا کیجئے اور استغفار کیجئے۔ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔ سورہ نساء (۱۰۶) میں بشیر ابن ابیرق کی چوری کے واقعہ میں آپکو ہدایت کی گئی: وَاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُورًا رحيما "اے نبی! آپ استغفار کیجئے بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔'' اس میں بھی ''ذنب'' کا لفظ نہیں ہے اس واقعہ میں آپ سے بشیر کے حق میں چوری سے براءت پر سرسری تاثرات ظاہر ہو گئے تھے اس لغزش سے استغفار کا حکم دیا گیا۔ سورہ محمد اور سورہ فتح میں استغفار کا لفظ بھی ہے۔ اور ذنب کا لفظ بھی ہے حضرات مفسرین نے ان آیات میں استغفار ذنب کی مختلف تاویلیں کی ہیں اور ان آیات کو اشکال سے بچایا ہے۔

اصحاب تراجم نے خواہ فارسی والے ہوں یا اردو والے ان دونوں لفظوں کا لفظی ترجمہ کیا ہے اور مفسرین کی تاویلات کے مطابق تاویلی ترجمہ کرنے سے احتراز کیا ہے، البتہ تاویلی ترجمہ

کرنے میں بریلی کے مشہور عالم مولانا احمد رضا خانصاحب منفرد ہیں، تفصیلی بحث آگے آرہی ہے۔

وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اصحاب تراجم حضرات ثلثہ (شاہ صاحبان) قرآن کریم کے عام اسلوب کا احترام قائم رکھنا چاہتے ہیں اور قرآن کریم کے وجوہ اعجاز میں اس کے بلیغ اسلوب کلام کی بڑی اہمیت ہے، اردو مفسرین میں مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ترجمان القرآن میں قرآنی اسلوب کی اہمیت پر خصوصیت کے ساتھ بحث کی ہے اور آیات الٰہی کی تشریح میں اسلوب کلام کی بڑی رعایت کی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اہم آیات کی تفسیر میں اسلوب کلام کے مقابلہ میں مفسرین قدماء کی بعض تاویلات کو نظر انداز کر دیا ہے اور اسی وجہ سے ہمارے قدیم علماء مدارس کو مولانا کی تفسیر ترجمان القرآن سے شکایت پیدا ہوگئی ہے۔ یعنی قرآن کریم نے ان دونوں لفظوں کو شروع سے آخر تک ان کے لغوی معانی میں استعمال کیا ہے اور لفظ مغفرت واستغفار گناہ کی معافی طلب کرنے اور لفظ ذنب گناہ وخطاء کے معانی میں استعمال کیے گئے ہیں۔

اکابر ثلثہ نے اس التزام کو ان آیات میں باقی رکھا ہے یہ اکابر ثلثہ جس بات پر متفق نظر آتے ہیں اسے قرآن فہمی کے معاملات میں سند کا درجہ حاصل ہوتا ہے ان حضرات کے تراجم حسب ذیل ہیں ـــــ وآمرزش طلب کن برائے گناہان خود ودرحق مردان مسلمان وزنانِ مسلمان (شاہ ولی اللہ)

اور بخشش مانگ واسطے گناہ اپنے کے اور واسطے ایمان والوں کے اور ایمان والیوں کے (شاہ رفیع الدین)

اور معافی مانگ اپنے گناہ کے واسطے، (شاہ عبدالقادر) ڈپٹی نذیر احمد نے معافی مانگنے اور اپنے گناہوں کے الفاظ تحریر کیے، مولانا تھانوی نے اپنی خطاء کی معافی لکھا اور مودودی صاحب نے اپنے قصور کی معافی تحریر کیا۔ فارسی کے پہلے مترجم علامہ جرجانی نے گناہ کی جگہ عربی لفظ زلت استعمال کیا اور لکھا: ''آمرزش خود برائے زلت خود'' زلت کا لفظ قرآن کریم نے حضرت آدم وحوا کے بارے میں استعمال کیا فازلهما الشیطان عنها (البقرۃ)

اسی جگہ زلت کا ترجمہ بلغزانید کیا، جرجانی نے بھی اور شاہ ولی اللہ نے بھی، بلغزانید کا ترجمہ اردو میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر صاحب نے ڈگایا (ڈگمگایا) لکھا، اور مولانا نذیر احمد

نے لکھا، انکو وہاں سے (بہلا پھسلا کر) اکھاڑ دیا (یعنی جنت سے نکلوا دیا) مولانا تھانوی نے لکھا، پھر لغزش دیدی شیطان نے آدم وحواء کو اس عیش سے جس میں وہ تھے"

زلت کا لفظ لا کر قرآن کریم نے یہ بتایا کہ آدم وحواء نے قصداً کوئی خطا نہیں کی بلکہ شیطان نے انہیں ڈگمگا دیا۔ ہندی میں ڈگ کے معنی قدم کے ہیں، ڈگ مگ کے معنی ہیں: لڑکھڑا دیا، جگہ سے بے جگہ کر دیا اصلی جگہ سے سرکا دیا۔" مولانا آزاد نے لکھا، شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیے اور مودودی صاحب نے لکھا: "ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا۔"

حاصل یہ کہ ذنب (گناہ وخطاء) سے زلت (ڈگمگانا) کا لفظ ہلکا ہے اور اسمیں مضبوط ارادہ خطاء نہیں ہے بلکہ بھول اور چوک ہے، اور حضرات انبیاء معصومین سے بشری تقاضے کے مطابق بھول چوک کا صادر ہونا ممکن ہے بلکہ یہ بھول چوک فطرت انسانی کا حسن وجمال ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ نبی ورسول کی لغزش کا تعلق نفسانی خواہشات اور سفلی جذبات سے نہیں ہوتا بلکہ ذہنی اور فکری لغزش سے ہوتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت کے پھل کی خواہش نے لغزش میں مبتلا نہیں کیا بلکہ شجرۃ الخلد (جنت کی دائمی زندگی) کی آرزو نے آمادہ کیا اور شیطان نے دوام وبقاء کی آرزو آدم کے اندر پیدا کی: هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ (۱۲۰) "اے آدم! کیا میں تمہیں وہ پھل نہ بتاؤں جو تمہیں موجودہ قرب حق کی حالت میں ہمیشہ قائم رکھے اور تمہیں یہاں سے نکالا نہ جائے جسکا اندیشہ ہے اور تمہیں تمہاری دائمی شان وشوکت ہمیشہ حاصل رہے ابلیس جانتا تھا کہ نبی ورسول کی بشریت پر ملکیت اور جسمانیت پر روحانیت کا غلبہ ہوتا ہے، اس لیے نبی ورسول کی نفسانی خواہشات کو بھڑکانا ممکن نہیں حضرات انبیاء علیہ السلام کی زندگیوں میں لغزش وڈگمگاہٹ کے جو واقعات ملتے ہیں ان میں نفسانی اور سفلی خواہشات کے غلبہ کا کوئی واقعہ منقول نہیں ابلیس نے حضرت آدم کے اندر یہ وسوسہ ڈالا کہ خداتعالی تمہیں اس مقام راحت سے ایک نہ ایک دن نکالے گا اور تمہیں زمین کی تکلیف بھری زندگی میں پہنچا دے گا، حضرت آدم کی زلت کا مفہوم قرآن کریم نے سورہ طٰہٰ (۱۱۵) میں واضح کرتے ہوئے کہا: وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا "اور ہم نے آدم کو تاکید کر دی تھی کہ جنت کے اس پھل سے دور رہنا مگر آدم سے بھول ہوگئی اور ہم نے آدم کے اندر گناہ اور نافرمانی کا پختہ ارادہ نہیں پایا۔" یہ قصد اور

ارادہ کی کمزوری انسانی فطرت ہے، حضرت شاہ صاحب نے اس فقرہ کا ترجمہ خوب کیا یعنی: ''ہم نے اس میں کچھ ہمت نہ پائی۔''

یعنی آدم ہماری ہدایت پر ہمت اور حوصلہ کے ساتھ قائم نہ رہ سکا۔ اور آدم مستقل مزاجی کا ثبوت نہ دے سکا، جلد بازی کر گیا اور ابلیس کے بہکانے میں آ گیا اور یہ جلد بازی اور مستقل مزاجی سے محرومی اس کی فطرت ہے۔ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُوْلًا (اسراء، ۱۵) انسان جلد باز ہے، جلد کار ہے، اُتاولا ہے اور یہ جلد بازی اس کے خمیر میں شامل ہے۔'' بہر حال زلت کا لفظ علامہ جرجانی نے استعمال کیا ہے مگر حضرات شاہانِ دہلی کے تراجم میں گناہ ہی کا لفظ ملتا ہے۔

''شاہانِ دہلی'' کا مسلک و مذاق!

حضرات دہلی نے ان آیات استغفار کو مشہور اشکال (عصمت نبوت پر حرف) سے بچانے کی غالباً ضرورت اس لیے نہیں سمجھی کہ قرآن کریم نے مطلق دعا کو عبادت قرار دیا ہے، خواہ وہ دعاء رزق وروزی کی ہو یا معافی گناہ کی، معافی گناہ ایک بندہ گناہ گار کی طرف سے ہو یا ایک بندہ معصوم عن الخطاء کی طرف سے۔ بے قصور اگر قصور وار بن کر سوال کرم کرتا ہے تو اس کی یہ عبادت بڑا درجہ رکھتی ہے، قصور وار بندہ کی دعاء کرم کے مقابلہ میں۔

دعا ضرورت بھی، عبادت بھی

سورہ مومن (۶۰) میں فرمایا گیا: قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ ''لوگو! تمہارے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ مجھے پکارو، مجھ سے مانگو کہ میں تمہاری پکار پر پہنچوں اور تمہاری دعاء کو قبول کروں، بے شک جو لوگ میری عبادت (دعاء) سے تکبر کرتے ہیں وہ بہت جلدی دوزخ میں ذلیل وخوار ہو کر داخل ہوں گے۔'' اس آیت کریمہ میں دعاء کو عبادت قرار دیا گیا ہے اور تکبر کی مذمت کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ اپنے مالک غنی سے ایک محتاج وفقیر بندہ کا سوال کرنے سے اعراض کرنا، اسے عار سمجھنا بدترین قسم کا غرور وتکبر ہے جس کی سزا عذاب دوزخ ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے. ''الدعاء هو العبادة'' ثم قرأ هذه الآية دعا عبادت ہے، خدا کی بندگی ہے پھر آپ نے مذکورہ آیت کی تلاوت کی۔

قرآن کریم نے اعلان کیا: یَاأَیُّھَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ (فاطر ۱۵) ''اے لوگو! تم تمام کے تمام خدا کے محتاج ہو اور اللہ تعالی ہی غنی اور قابل حمد وثنا ہے بندہ گناہ گار کی دعاء ان کی ضرورت بھی ہے اور عبادت بھی اور رسول معصوم کی دعاء ان کی ضرورت نہیں بلکہ خالص عبادت ہے اس لیے بندہ عاصی کی دعاء وعبادت سے بندہ معصوم کی دعاء وعبادت (استغفار) کا درجہ بہت بڑا ہے۔

پیغمبر گناہوں سے معصوم ہوتا ہے لیکن پیغمبر کی بشریت خدا کی الوہیت کے مقابل میں خود ایک کمزوری اور احتیاج ہے اور پیغمبر اس سے محفوظ رہنے اور ہر حال میں خدا کے فضل وکرم سے بہرہ مند ہونے کی دعاء کرتا ہے، یہی استغفار ہے۔ دوسرے الفاظ میں خدا نے انسان کو اپنی صفات جمال وجلال کے ظہور کے لیے پیدا کیا ہے، انسان سے قصور ہوتا ہے اور وہ قصوروار خدا سے معافی کی درخواست کرتا ہے پھر اس کے جواب میں خدا کی صفات غفاری اور ستاری کا اس بندہ کی ذات پر ظہور ہوتا ہے۔ معصوم پیغمبر اگر گناہ گار کی طرح گناہ گاری کے تصوارت کے ساتھ خدا سے عفو وکرم کی درخواست نہ کرے تو اس کی ذات خدا کی صفات غفاری اور ستاری (پردہ پوشی) کے ظہور سے محروم رہے۔

بندہ معصوم جب تواضع وعاجزی کا اظہار کرتا ہے تو اس کے جواب میں خدا کی صفت کبریائی اس پر ظہور کرتی ہے اور اس کے درجات بلند ہوتے ہیں اس حدیث کا یہی مطلب ہے۔ من تواضع للہ رفعہ اللہ جو شخص عاجزی اختیار کرتا ہے اللہ کے لیے تو اللہ تعالی اس کے درجات بلند کرتا ہے۔ یہ صفت کبریائی کا ظہور ہے۔ بہر حال استغفار مغفرت طلبی ہے، رحمت طلبی ہے، اس لحاظ سے استغفار معصوم اس کی عبدیت کے جذبہ کی غذاء ہے۔ حضور ﷺ دعا کرتے تھے: اللھم اجعلنی فی عینی صغیرا و فی اعین الناس کبیرا (حدیث) ''خداوندا مجھے اپنی یعنی میری نظروں میں چھوٹا بنائے رکھ اور عوام کی نظروں میں میری بڑائی قائم رکھ۔ کیونکہ میں تیرا رسول ونمائندہ ہوں، مجھے تیرا پیغام لوگوں کے دلوں میں اتارنا ہے، یہ کام میرے اثر ورسوخ سے ہوگا۔

مفسرین سلف کی توجیہات

امام فخرالدین رازی (وفات ۶۰۶ ھ) نے اپنی تفسیر میں اس مسئلہ پر توجہ کی اور اس

اشکال کو دور کرنے کے لئے مختلف تاویلات نقل کیں۔ ان کے بعد علامہ ابن حزم اندلسی (۶۵۴) نے اپنی کتاب الملل والنحل میں اور قاضی عیاض مالکی نے اپنی مشہور کتاب سیرت (شفاء) میں اس اشکال کو دور کیا۔ ملا دوست محمد کابلی کی تحفۃ الاخلاء اسی موضوع (عصمت انبیاء) پر ایک خاص کتاب ہے۔

ان تاویلات کا خلاصہ یہ ہے: (۱) ذنب سے مراد ترک اولیٰ اور ترک افضل ہے اور مشہور قول ہے کہ حسنات الابرار سیآت المقربین یعنی اہل تقرب کی لغزشیں اہل تقوی کی نیکیوں کے برابر ہیں۔ اس تاویل کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ نبی معصوم کا ذنب کوئی اخلاقی یا مذہبی گناہ نہیں بلکہ نبی معصوم کا قصور ان کی شان اطہر کے مطابق سعادت کے مقام اعلیٰ اور مرتبہ ارفع کے مقابلہ میں مقام عالی اور مرتبہ رفیع پر ٹھیرتا ہے اور یہ وقوف فطری بات ہے۔

راہ سعادت وتقرب میں ارتقاء وعروج بتدریج ہوتا ہے عالی سے اعلیٰ اور رفیع سے ارفع کی طرف پیش قدمی ہوتی ہے۔ اس پیش قدمی میں نبی معصوم کو استغفار کرنے کی ہدایت دے کر اس طرف توجہ دلائی جاتی ہے کہ ہر گزری ہوئی منزل کو پستی تصور کر کے اس اگلی منزل کی بلندی کی طرف عروج حاصل کرنے کی جدوجہد جاری رہنی چاہیے یہ تصور حضرات انبیاء کے اندر عاجزی اور تواضع کے احساسات پیدا کرتا ہے، عروج وارتقاء کی راہ میں غرور وتکبر کا ادنی احساس بھی نقصان دہ اور راہ ارتقاء میں رکاوٹ بنتا ہے۔ شیخ سعدی نے اس توجیہہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

عاصیاں از گناہ توبہ کنند

عارفاں از عبادت استغفار

(۲) ذنب سے آپ کی امت کے گناہ مراد ہیں، ماتقدم (اگلے) سے آپ کے ماں باپ آدم وحواء کے گناہ مراد ہیں اور ماتاخر (پچھلے) سے اہل ایمان کے گناہ مراد ہیں۔ یہ تاویل بعض نامعلوم متقدمین کے حوالے سے۔

(۳) ذنب سے صغیرہ گناہ مراد ہیں جنکا صدور حضرات انبیاء علیہم السلام سے ممکن ہے۔

(۴) غفر کے معنی چھپانے اور پردہ ڈالنے کے ہیں، بمعنی ستر۔

مطلب اس جگہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ آپکو خطاؤں سے محفوظ رکھے گا، آپ کے اور گناہوں کے درمیان پردہ حائل ہو جائے گا۔ آپ اس کی دعاء کیجئے۔ حضرات مفسرین نے پہلی

تین تاویلوں پر زیادہ زور دیا ہے حالانکہ چوتھی تاویل (غفر بمعنی ستر) زیادہ واضح اور آسان ہے۔ غفر چھپانے کے مفہوم میں قرآن کریم اور احادیث نبوی میں نظر نہیں آتا مگر اہل زبان کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔

غفر الشیب: اس نے رنگ و خضاب سے سفید بالوں کو چھپایا

غفر الجلب السوق: باہر کے مال نے بازار کو ڈھانک لیا، مال بھر گیا

غفر: کپڑے کے رئیں جو کپڑے کی سطح کو چھپا لیتے ہیں

غفرۃ: برتن کا ڈھکنا

غِفار: جمع غفائر: فوجی کا خود جو اس کے سر کو چھپاتا ہے۔ مِغفر بھی کہا جاتا ہے غَفّارہ، بڑی چادر جو جسم کو چھپالیتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ چھپانے کے مفہوم میں اس لفظ کا کثیر الاستعمال ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس لفظ کا حقیقی مفہوم یہی ہے۔ مجازی طور پر اس کے دوسرے معنی گناہوں کی معافی کے آتے ہیں کیونکہ معافی اور درگزر سے گناہ چھپ جاتے ہیں، مٹ جاتے ہیں۔

سورہ فتح میں ذنب کا مفہوم!

شاہ عبدالقادر صاحب نے سورہ فتح میں ذنب کے لفظ کا ترجمہ تو گناہ ہی کیا ہے لیکن اپنے مختصر تشریحی حاشیہ میں ذنب کا اشارہ اجتماعی جدوجہد میں واقع ہونے والی رائے کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی طرف کیا ہے۔ اسکی وضاحت راقم نے علحدہ مضمون میں کی ہے، جو فروری کے ''اذان بلال'' میں شائع ہوئی ہے۔

سب سے کمزور تاویل

مسلک بریلوی کے اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب نے اپنے ترجمہ میں (جو تاویلی ترجمہ ہے) ذنوب سے امت کے خواص و عوام کے گناہوں والی تاویل اختیار کی ہے۔

یہ تاویل علامہ بغوی (وفات ۵۱۰ھ) نے اپنی تفسیر میں بعض غیر معروف (قال بعض ماتقدم) متقدمین کے حوالہ سے نقل کی ہے اور ان کے انداز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف علام کے نزدیک یہ نہایت کمزور تاویل ہے۔ علامہ نسفی بغوی کے علاوہ مستند مفسرین امام رازی، علامہ بغدادی اور امام ابن کثیر نے یہ تاویل نقل نہیں کی۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی میں سورہ النصر کی تفسیر کرتے ہوئے اس تاویل کو اس انداز سے واضح کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے لیے استغفار آخرت میں امت مسلمہ کے کام آئے گا اور خدا تعالی شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم کی مغفرت کو گناہ گاران امت کے نامہ اعمال میں ڈالنے کا حکم دے گا اور یہ بھی شفاعت کبری کی ایک صورت ہوگی۔ ایک شاعر نے کتنے خصوبصورت پیرایے میں یہ حقیقت بیان کی ہے۔

آزردہ غیر سے ہیں لیتا ہوں میں بلائیں
روٹھے ہیں وہ کسی سے کوئی منا رہا ہے

اس روحانی تاویل کے باوجود حضرت شاہ صاحب نے آیات متعلقہ کے ترجمہ میں اپنے والد محترم شاہ ولی اللہ کے فتح الرحمٰن کی پیروی کی ہے، ترجمہ میں تاویل کو داخل نہیں کیا، کیونکہ تاویلات بعیدہ اختیار کرنے سے قرآن کریم میں تحریفات کا دروازہ کھل جانے کا خطرہ ہے اور اسکی مثال قادیانی فرقہ کی گمراہانہ تاویلات ہیں۔ اقبال مرحوم نے اسی قسم کی تاویلات کے بارے میں کہا ہے:

تاویل بڑھ کے اقرب للکفر ہوگئی
کچھ بھی نہیں ہے شیخ تیرے علم و فن سے دور

کنزالایمان کا علمی تجزیہ

مولانا بریلوی کے ترجمہ کنزالایمان پر اس ناچیز نے ایک تنقیدی کتاب ''کنزالایمان کا علمی تجزیہ'' نام سے شائع کی تھی اور یہ اس وقت (۱۹۸۳ء) کی بات ہے جب کہ رابطہ عالم اسلامی نے اس بریلوی ترجمہ پر پابندی لگائی تھی اور رضا خانی علماء نے اس کے خلاف آسمان سر پر اٹھالیا تھا اس ناچیز نے اس پابندی کے جواز پر اعلی حضرت کے ترجمہ قرآن کی لسانی اور اعتقادی غلطیوں کی نشان دہی کی تھی۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ پاکستان کے بعض رضا خانی علماء کی طرف سے اعلیٰ حضرت کے اس تاویلی ترجمہ کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ چنانچہ ابھی حال میں ایک استفتاء دلی کے ایک بریلوی عالم کے پاس اسی مسئلہ کے بارے میں آیا ہے جو میری نظر سے گزرا۔ اعلیٰ حضرت کی طرف منسوب

اختلافی عقائد پر نظر ثانی کی تحریک بھاول پور یونیورسٹی پاکستان کے پروفیسر مولانا مفتی غلام سرور قادری رضوی صاحب کی طرف سے جاری ہوئی ہے اور اس تحریک کے سلسلہ میں مفتی صاحب نے کئی کتابیں شائع کی ہیں۔ جن میں سے ایک کتاب خالص الاعتقاد ہے۔ جسمیں علم غیب، بشریت اور استغفار کے اختلافی مسائل میں اعلیٰ حضرت کے تاویلی فتاویٰ شائع کئے گئے ہیں اور مرحوم نے ان تاویلات میں جمہور علماء (بشمول علماء دیوبند) کے نظریات سے اصولی طور پر اتفاق کیا ہے اور اپنے فتویٰ کفر سے رجوع کیا ہے۔

پاکستان کے تعلیم یافتہ رضا خانی علماء کی اس تحریک کے پیش نظر ہی اس ناچیز کی رائے بنی ہے کہ ہماری طرف سے بھی اعلیٰ حضرت کے بارے میں تشدد اور تعصب کے رویہ میں نرمی پیدا ہونی چاہیے اور ہندوستان کے شرک وکفر زدہ ماحول کے سیاسی حالات کا یہی تقاضا ہے۔

ابھی حال میں دیوبند کے اجلاس مدارس میں تقریر کرتے ہوئے مولانا ولی رحمانی صاحب مہتمم جامعہ رحمانیہ مونگیر نے علماء سے یہی اپیل کی کہ دینی مدارس کے بچاؤ کی خاطر دیوبندی اور بریلوی اختلافات کو بھلا دینا چاہیے۔ نہ معلوم علماء مدارس دیوبند کے اس مشورہ کے بارے میں کیا تاثرات ہیں؟



رسول معصوم علیہ السلام کی طرف توبہ کی نسبت؟

خدا تعالی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء کرام کو مصائب کی شدت کے دور میں ایمان واسلام پر استقامت اختیار کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ ۝ (ھود ۱۱۲، ۱۱۳)

''اے نبی! تم، جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے، دین حق پر ثابت قدم رہو اور وہ لوگ بھی ثابت قدم رہیں جو شرک سے توبہ کر کے تمہاری رفاقت میں ہیں اور تمہارے ساتھ ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرنا، بے شک خدا تعالی تمہارے اعمال کو جانتا ہے اور دیکھ رہا ہے اور تم لوگ ظلم وزیادتی کرنے والوں کی طرف بالکل نہ جھکنا ورنہ تمہیں آگ کا عذاب پکڑے گا اور اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں پھر اس کے مقابلہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرے گا۔''

استغفار اور توبہ کا حاصل ایک ہی ہے، سورہ نصر (۳) میں واستغفرہ کی ہدایت دے کر اسکی قبولیت کا اعلان انہ کان توابا کے فقرہ سے کیا گیا یعنی خدا تعالی سے استغفار کرو، خدا تعالی قبول کرنے والا تواب ہے۔

مذکورہ آیت پر اشکال!

اس آیت کریمہ میں ومن تاب معک کے فقرہ کا ترجمہ بڑا پیچیدہ ہے اور مترجم حضرات کو اس فقرے کے ترجمہ میں بڑی مشکل پیش آئی ہے کیونکہ لفظی ترجمہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی توبہ کر کے ایمان کی طرف لوٹنے والوں میں شامل تھے۔

اوپر کا تاویلی ترجمہ اس اشکال سے بچ کر کیا گیا ہے۔عربی مفسر صاحب جلالین (علامہ

محلی شافعی) نے اس فقرہ کو اشکال سے بچانے کے لیے ''تاب'' کے لفظ کی تفسیر ''آمن'' کے لفظ سے کی ہے، لیکن خدا تعالی کی مراد اگر آمن ہوتی تو قرآن کریم کے لئے تاب کے لفظ کی جگہ آمن کا لفظ استعمال کرنا کیا مشکل تھا؟

دوسرا اشکال اس تفسیر پر یہ واقع ہوتا ہے کہ رسول پاک علیہ السلام کو اپنے اہل ایمان صحابہ سے ایمان میں اولیت حاصل تھی نہ زمانی اشتراک تھا نہ حقیقی اشتراک تھا۔

خدا کی توحید پر ایمان آپکو شروع سے حاصل تھا، دین ابراہیمی میں ایمان بالتوحید ایک بنیادی عقیدہ تھا، سورہ شوری (۵۲) میں جو یہ کہا گیا: ما کنت تدری مالکتاب ولا الایمان آپکو علم نہیں تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان و کتاب کا وہ مکمل اور مفصل تصور جسمیں خود حضور کی رسالت (رسالت محمدی) اور حضور پر نازل شدہ کتاب (قرآن کریم) پر ایمان لانا بھی شامل ہے وہ حضور کو اپنی رسالت کے اعلان اور قرآن حکیم کے نزول کے بعد حاصل ہوا اور آپ غار حراء سے ایمان بالتوحید اور ایمان بالرسالت والکتاب کی مکمل دولت لیکر اپنی قوم میں آئے۔ اعلان رسالت محمدی اور نزول قرآن سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان کی یہ حالت نہیں تھی۔

قرآن کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان واسلام کی اولیت کا اعلان حضور کی زبان مبارک سے ان واضح الفاظ میں کرایا: وامرت لان اکون اول المسلمین (زمر:۱۲)

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمام ایمان واسلام والوں میں سب سے پہلا مسلمان بنوں''
یعنی میں نے اس حکم الہی کی تعمیل کی اور میں خدا تعالی کا پہلا فرماں بردار ہوں۔ عربی مفسرین میں علامہ ابن کثیر نے آیت مذکورہ کی تشریح کرتے ہوئے صرف استقامت کی تاکید پر زور دیا ہے اور من تاب کی تفسیر کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، کیونکہ اس کی تشریح بہت پیچیدہ تھی لکھتے ہیں:

یامر تعالی رسوله وعباده المؤمنین بالثبات والدوام علی الاستقامة وذلك من اکبر العون علی النصر علی الاعداء۔ ونهی عن الطغیان (ابن کثیر ۲ ص ۴۶۱ مصری)

اللہ نے اپنے رسول اور اپنے اہل ایمان بندوں کو استقامت پر دائم وقائم رہنے کا حکم دیا ہے کیونکہ یہ کردار دشمنوں پر خدا تعالی کی نصرت حاصل کرنے کا سب سے بڑا معاون ومحرک عمل ہے

اور حد سے تجاوز کرنے کی ممانعت کی ہے، وجہ اس کی یہ ہے۔

وھو البغی فانہ مصرعۃ حتی ولو کان علی شرك حد سے تجاوز کرنا سرکشی کرنا ہے اور یہ زیادتی سخت مہلک ہے یہاں تک کہ اگر یہ زیادتی مشرک کے خلاف ہو تب ہلاکت انگیز ہے۔

مختلف تراجم

دونوں فارسی اور دونوں ابتدائی اردو تراجم میں من تاب کا ترجمہ لفظی کیا گیا ہے جس پر مذکورہ اشکال وارد ہوتا ہے: توبہ کرد باتو (جرجانی) توبہ کردہ اند ہمراہ تو (شاہ ولی اللہ) توبہ کی ساتھ تیرے (شاہ رفیع الدین) اور جس نے توبہ کی تیرے ساتھ (شاہ عبدالقادر)

ان بنیادی تراجم میں مذکورہ اشکال کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ان تراجم کے بعد پہلا بامحاورہ ترجمہ مولانا ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ہے آپ نے آیت مذکورہ کو اس اشکال سے بچانے کی کوشش کی اور یہ ترجمہ کیا: ''اور جو لوگ کفر و شرک سے توبہ کر کے تمہارے ساتھ ہو لیے ہیں۔'' اس ترجمہ میں مترجم مرحوم کی عربی قابلیت اور استادانہ مہارت کا پورا مظاہرہ ہو رہا ہے البتہ اردو محاوروں میں کمزوری نظر آ رہی ہے۔ علم نحو کا یہ قاعدہ ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت ہوتی ہے، اس قاعدے کے مطابق پہلے فقرہ میں واقع استقامت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے درمیان مشترک ہے لیکن دوسرے فقرہ کی توبہ میں اشتراک نہیں ہے۔ دونوں فقروں کے درمیان یہ فرق قائم رکھتے ہوئے اس آیت کا ترجمہ اشکال سے خالی ہو سکتا ہے اور مولانا نذیر احمد صاحب نے اسی ترکیب نحوی کے لحاظ سے مذکورہ ترجمہ کیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمے (۱۹۲۴ء) کے بعد مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ کا ترجمہ وجود میں آیا اس ترجمہ (بیان القرآن) کا سن تالیف (۱۹۳۱ء) ہے۔ مولانا نے شاہان دہلی (شاہ صاحبان) (بقول مرحوم) کے تراجم ثلثہ کو نظر انداز کر کے مولانا نذیر احمد صاحب کا ترجمہ اختیار کیا البتہ اس ترجمہ میں محاوروں کے کمزور ہونے کا جو پہلو تھا اسے دور کر دیا۔

مولانا کا ترجمہ یہ ہے ''تو آپ جس طرح آپ کو حکم ہوا دین پر مستقیم رہیے اور وہ لوگ بھی مستقیم رہیں جو کفر سے توبہ کر کے آپ کی ہمراہی میں ہیں۔ ڈپٹی صاحب کے ترجمے میں اردو محاوروں کے لحاظ سے یہ کمزوری تھی کہ ساتھ ہو لیے ہیں کا محاورہ ساتھ چلنے والوں کی کمزوری کی طرف اشارہ

کررہا ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کچھ لوگ محض دیکھا دیکھی چلنے والے کے ساتھ چل پڑتے ہیں ان کا پختہ ارادہ چلنے کا نہیں ہوتا۔ اس محاورہ سے حضرات صحابہ کرام کی اتباع کا وزن گر جاتا ہے۔ مولانا تھانوی نے اپنے ترجمہ (ہمراہی) میں اس کمزوری کو دور کردیا تعجب ہے کہ مولانا آزاد جیسا عربی اور اردو دونوں زبانوں کا ماہر ڈپٹی صاحب کے محاورے کی کمزوری سے نظر بچا گیا اور اپنی ترجمانی (۱۹۳۱ء) میں بعینہ ڈپٹی صاحب کے الفاظ رکھدیئے۔

مولانا آزاد کی ترجمانی کے الفاظ یہ ہیں ''پس چاہیے کہ جس طرح تمہیں حکم دیا گیا تم اور وہ سب جو توبہ کرکے تمہارے ساتھ ہولیے ہیں اپنی راہ میں استوار ہوجاؤ (ترجمان القرآن دوم ۲۰۷) مولانا مودودیؒ نے ڈپٹی صاحب کا تاویلی مفہوم اختیار کیا مگر اپنی تفہیم القرآن (۱۹۵۱) کے اسلوب عبارت میں اپنا الگ ادبی رنگ دکھایا ہے۔

تفہیم کے الفاظ یہ ہیں: ''پس اے نبی! تم اور تمہارے وہ ساتھی جو کفر و بغاوت سے ایمان وطاعت کی طرف پلٹ آئے ہیں ٹھیک ٹھیک ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے۔'' مولانا احمد سعید صاحب دہلوی کا ترجمہ (۱۹۵۷ء) تفہیم کے قریب قریب ہے: ''اور آپ کے وہ ساتھی بھی قائم رہیں جو کفر سے توبہ کرچکے ہیں۔''

سن طباعت کی ترتیب سے تفہیم القرآن مقدم ہے اور کشف الرحمٰن موخر اور بعد کی ہے۔

مولانا فتح محمد جالندھری صاحب کا دعویٰ ہے کہ میں نے ڈپٹی صاحب کے کمزور محاوروں سے اپنے ترجمہ کو محفوظ رکھا ہے لیکن انہوں نے اس آیت کے ترجمے میں ڈپٹی صاحب کو چھوڑ کر ٹھوکر کھائی اور سابق تراجم (شاہان دہلی) کی پیروی کرکے اپنے ترجمہ کو اشکال کے حوالہ کردیا، جالندھری کا ترجمہ یہ ہے: ''سو اے پیغمبر! جیسا تم کو حکم ہوتا ہے اس پر تم اور جو لوگ تمہارے ساتھ تائب ہوتے ہیں قائم رہو۔'' (۲۷۹)

شاہان دہلی کے ترجمہ کی پہلی وجہ

حضرات شاہان دہلی، شاہ ولی اللہ، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر رحمہم اللہ نے استغفار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آیات میں اور زیر بحث آیت توبہ میں تاویلی ترجمہ کرنے سے احتراز کیا ہے اور استغفار اور توبہ کے لفظی ترجمہ پر اصرار کیا ہے۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ حضرات ثلثہ

قرآن کریم کے عام اسلوب کا احترام قائم رکھنا چاہتے ہیں اور قرآن کریم نے ان لفظوں کو شروع سے آخر تک ان کے عام لغوی معانی میں استعمال کیا ہے۔ رہی اشکال کی بات تو اس اشکال (عصمت نبوت) کا جواب ان حضرات کے ہاں قرآن کریم اور احادیث نبوی کی روشنی میں بہت واضح ہے۔ اس کی تفصیل راقم نے نبی معصوم کی طرف استغفار کی نسبت والے مقالے (ترجمان دارالعلوم اکتوبر ۲۰۰۲ء) میں کی ہے، اسے دیکھا جائے۔

دوسری وجہ کیا ہے؟

زیر بحث آیت میں اہل تراجم سلف کرام نے تاویلی ترجمہ سے اس لئے بھی احتراز کیا کہ ڈپٹی نذیر صاحب اور مولانا تھانوی وغیرہ کے تاویلی تراجم میں معك (مع) سابق لفظ سے بالکل بے تعلق ہو جاتا ہے اور قرآن کریم اور عرب استعمالات میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ان اللہ معنا، اتخذت مع الرسول، مع الراكعين وغیرہ قرآن میں بے شمار آیات ہیں جنمیں ''مع'' لفظ استعمال ہوا ہے اور سابق عبارت سے متعلق ہے۔

اور توبہ کر کے آپ کے ہمراہی اور صحابی ہو گئے میں ''معك'' لفظ فعل ''تاب'' سے بالکل بے تعلق ہو جاتا ہے۔ ان کا بر ثلثہ نے اسے تاویل بعید سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ ☆☆☆



نبی معصوم علیہ السلام اور شیطان سے تعوذ کی تحقیق

توبہ اور استغفار کی بحث میں ایک مسئلہ یہ بھی قابل غور ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے شیطان کی اغواء کاری سے پناہ طلب کرنے کا حکم کیوں دیا؟

کیا شیطان کی اغواء کاری کا حضرات انبیاء علیہم السلام پر اثر پڑتا ہے؟ اس بحث میں پہلی بات تو یہ کہ شیطان کو قدرت نے صرف وسوسہ اندازی یعنی انسان کے دل میں برے خیالات ڈالنے کی طاقت دی ہے اور یہ برے خیالات وہ اپنی قوۃ خیالیہ کے ذریعہ ڈالتا ہے۔

ایک گمراہ انسان جو شیطان کا ایجنٹ ہوتا ہے وہ اپنی گمراہانہ باتوں سے لوگوں کو بہکاتا ہے۔ قرآن کریم نے کہا: مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ○الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ○ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ○ (الناس:٦) اے نبی تم خدا تعالیٰ سے حفاظت کی دعاء کیا کرو وسوسہ ڈالنے والے اور چھپ جانے اور پیچھے ہٹ جانے والے کی شرارت اور برائی سے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے ہو۔''

خناس (خنس) بمعنی چھپ جانا، پیچھے ہٹ جانا، خِنَّیس، دھوکہ باز، اَخْنَس، شیر جو جنگل میں شکار کے لئے چھپا رہتا ہے۔ خُنَّس پانچ مشہور سیارے، فَلَآ اُقْسِمُ بالخنس الجوار الکنس (تکویر:١٦) ''قسم ہے، ان سیاروں (زحل، مشتری، مریخ، زہرہ، عطارد) کی جو کبھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں، کبھی سیدھے چلتے ہیں اور کبھی دبک جاتے ہیں۔'' گمراہ انسان بھی اپنی باتوں سے بہکا کر کھسک جانے کی کوشش کرتا ہے سامنا نہیں کر سکتا، آنکھیں ملا کر بات نہیں کر سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطان کی صفت خناس کی تشریح کرتے ہوئے بطور تمثیل فرمایا:

الشيطان جاثم على قلب ابن آدم فاذا ذكر العبد ربه خنس واذا غفل وسوس (حدیث) شیطان انسان سے اتنا قریب ہوتا ہے جیسے کہ وہ انسان کے دل پر اوندھے منہ پڑا رہتا ہے انسان جب اللہ کا ذکر کرتا ہے تو وہ بھاگ جاتا ہے اور جب اس پر غفلت طاری ہوتی ہے تو وہ وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ غلط آرزوئیں پیدا کرتا ہے!

ابلیس نے راندہ درگاہ ہو کر آسمانوں سے نکلتے وقت یہ اعلان کیا تھا:

وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ۝ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ (نساء: ۱۲۰) ''وہ بولا اے خدا میں تیرے بندوں میں اپنا ایک مقرر حصہ لے لوں گا اور اسے اپنا لوں گا پھر انہیں بہکاؤں گا اور انہیں طرح طرح کی غلط امیدیں دلاؤں گا اور انہیں سکھاؤں گا کہ وہ جانوروں کے کان چیریں اور انہیں سکھاؤں گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بناوٹ کو بگاڑیں'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا کہ: ومن يتخذ الشيطان وليا من دون الله فقد خسر خسرانا مبينا (النساء: ۱۱۹) یہ غلط آرزوئیں اور بری تمنائیں ان پانچ فطری شہوات وخواہشات کے ذریعہ انسان کے اندر پیدا کی جاتی ہیں جو خواہشات خدا کی طرف سے فطرت میں ڈالی گئی ہیں۔ آل عمران (۱۴) کی مشہور آیت ہے:

زين للناس حب الشهوات (۱) من النساء، عورتیں (۲) والبنين، بیٹے، اولاد (۳) القناطير المقنطرة، مال دولت کے ڈھیر (۴) والخيل المسومة، عمدہ سواریاں (۵) والانعام والحرث کھیتی باڑی، باغات۔

یہ ہے متاع الدنیا کا حاصل، شیطان اس فطری خواہش کے ساز وسامان کی فطری محبت کو اکساتا ہے، بھڑکاتا ہے، اعتدال سے ہٹا کر بے اعتدالی میں گرفتار کرتا ہے، لیکن یہ اغوا کاری حضرات انبیاء علیہم السلام پر نہیں چلتی، عوام اس حملہ کا شکار ہوتے ہیں: حضرات انبیاء کرام اپنے

پروردگار کے اس یقین دہانی پر قائم ہوتے ہیں: قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (نساء ۷۷) ''یہ ساز وسامان دنیا کتنا ہی زیادہ ہو مگر وہ قلیل ہے، ہر لحاظ سے مدت اور عمر کے لحاظ سے بھی اور قدر کے لحاظ سے بھی، یعنی کیت میں بھی اور کیفیت میں بھی اور آخرت کا عیش وآرام دائمی ہے اور وہ عیش دائمی ان کے لئے ہے جو پرہیز گاری (تقوی) اختیار کرتے ہیں نیکیاں (دواء) بھی کرتے ہیں اور برائیوں سے پرہیز بھی کرتے ہیں اور اے لوگو! آخرت میں تم پر دھاگے برابر زیادتی نہیں ہوگی ذکر الٰہی، شہاب ثاقب ہے!

اہل ایمان کی زبان ذکر الٰہی سے تر رہتی ہے اور ان کا دل خدا کی یاد سے آباد رہتا ہے یہ ذکر الٰہی شیطان کے حق میں ایک شعلۂ نار (شہاب ثاقب) ہے جسکے خوف سے شیطان بھاگتا ہے، فاتبعه شهاب ثاقب (صافات:۱۰) نبی ورسول کا دل خدا کی یاد سے ہر وقت معمور رہتا ہے، اس لئے شیطان حضرات انبیاء علیہم السلام پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

یہی یاد الٰہی اور ذکر اللہ ایک مومن کو شیطانی اثر سے چونکا دیتا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (اعراف:۲۰۱) پرہیز گار بندوں پر جب شیطان کا گزر ہوتا ہے اور شیطان اپنی وسوسہ اندازی کے ذریعہ انہیں بہکانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اہل تقوی فوراً چونک پڑتے ہیں اور ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور شیطانی اثر سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ البتہ جو لوگ خدا کی یاد سے غافل ہو کر شیطان کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ اور شیطان کے بھائی بندوں میں شامل ہو جاتے ہیں، انہیں شیطان خواہشات نفسانی کی دلدل میں گھسیٹے پھرتا ہے: وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ۝ (اعراف ۲۰۲) یہ مسلمانوں کے گمراہ طبقہ کا حال ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تعوذ کا حکم!

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تعوذ واستعاذہ کا حکم قرآن کریم نے مختلف موقعوں پر سات جگہ دیا ہے ان میں سے دو جگہ شیطانی فعل وسوسہ کو نزع سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور یہ دونوں

موقعے وہ ہیں جہاں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنوں کے ساتھ عفو وکرم اور برائی کے بدلہ بھلائی کرنے کا حکم دے کر آپ کو اپنے اخلاقی مشن پر قائم رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ پہلی ہدایت سورہ اعراف میں! خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ٥وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ٥(اعراف ۲۰)''اے نبی! معاف کرنے اور درگذر کرنے کا رویہ اور روش اختیار کرو اور نیک کاموں کی دعوت دیتے رہو اور نادانوں کی باتوں کو نظر انداز کرتے رہو اور اگر شیطان تمہیں اس کے خلاف وسوسہ میں ڈالے اور تمہیں ابھارے تو خدا تعالی سے پناہ طلب کیا کرو، بے شک وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔''

اس آیت میں تمام مترجم حضرات نزغ کا ترجمہ وسوسہ کر رہے ہیں اور شاہ عبد القادرؒ عربی مفہوم کی رعایت سے ابھارنا ترجمہ کر رہے ہیں لغت عربی میں نزغ کے معنی اکسانے کے آتے ہیں۔ وسوسہ ڈالنا اکسانے کا حاصل ہے اور قرآن کریم نے شیطانی فعل کو وسوسہ سے تعبیر کیا ہے اور کہا ہے، فوسوس لهما الشيطان (اعراف۔۱۹)

دوسری ہدایت سورہ فُصِّلَتْ میں ہے:

وَلَا تَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ٥وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ٥(فصلت ۳۶)

''اے نبی! بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں ہیں، دونوں کے اثرات وثمرات الگ الگ ہیں۔ لہذا تم برائی کے بدلہ اس سے زیادہ بھلائی سے پیش آیا کرو، اس کے نتیجہ میں تمہارے دشمن تمہارے دوست ہو جائیں گے اور یہ اخلاقی مقام تمہیں صبر وتحمل سے حاصل ہوگا اور بڑے ہی اقبال مند ہیں وہ لوگ جنہیں یہ مرتبہ بلند حاصل ہوتا ہے اور اگر تمہیں شیطان اکسائے یعنی تمہارے اندر برائی کے بدلہ برائی کرنے کا خیال ووسوسہ ڈالے تو تم خدا تعالی سے پناہ طلب کرو بے شک وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔''

اس آیت میں فارسی مترجم اور مولانا تھانوی نے نزغ کا ترجمہ حسب سابق قرآنی لفظ کے مطابق وسوسہ ہی کیا ہے لیکن دونوں اردو مترجم بھائی ہندی لفظ استعمال کررہے ہیں شاہ رفیع الدین لکھتے ہیں: ''اور اگر چوک دے تجھکو شیطان کی طرف سے کوئی چوک دینے والا'' شاہ عبد القادر لکھتے ہیں'' اور کبھی چوک لگے تجھکو شیطان کے چوکنے سے'' شاہ رفیع الدین صاحب عام طور پر اپنے والد کی پیروی کرتے ہیں لیکن اس موقعہ پر انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی شاہ عبد القادر صاحب کی پیروی کی۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ شاہ رفیع الدین کا تحت اللفظ ترجمہ شاہ عبد القادر کے بامحاورہ ترجمہ سے پہلے وجود میں آیا اور یہ غلط فہمی ان حضرات کو حسن طباعت سے پیدا ہوئی، راقم نے محاسن موضح قرآن میں اس کا جواب دیا ہے کہ یہ اندازہ صحیح نہیں ہے، پہلا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب ہی کا ہے۔

اس ناچیز کے خیال میں اس بات کا ایک ثبوت یہ بھی ہے جو اس آیت کے ترجمہ میں نظر آرہا ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب نے ایک خاص مقصد یعنی اپنے ہندی زبان کے ماحول میں قرآن کریم کی اشاعت کے پیش نظر اپنے ترجمہ میں ہندی کے الفاظ استعمال کئے ہیں یہ مقصد شاہ رفیع الدین صاحب کے سامنے نہیں تھا، اس لئے اس آیت میں شاہ رفیع الدین نے اپنے چھوٹے بھائی کے ہندی لفظ کو نزغ کا بہترین مفہوم سمجھ کر استعمال کیا حالانکہ اس آیت سے پہلے سورہ اعراف (۲۰۰) میں شاہ رفیع الدین نے اپنے معمول کے مطابق اپنے والد کی پیروی کی اور نزغ کا ترجمہ وسوسہ کیا۔

شاہ عبد القادر صاحب کے پاس بھی ابھارنے (اکسانے) کا لفظ موجود تھا۔ شاہ صاحب نے سورہ مریم (۸۳) میں تؤزھم ازاً کے اندر مفعول مطلق ازاً کا ترجمہ ابھارنا کیا ہے مگر اس آیت میں ہندی لفظ چوک کو پسند کیا۔ چوک کا لفظ ہندی کچوکنا سے بنا ہے، کچوکنا کہا جاتا ہے جب چاقو چھری کی نوک سے پھلوں میں ہلکے ہلکے چھید کئے جاتے ہیں اور پھلوں کا اچار ڈالنے کے لئے انہیں نرم کیا جاتا ہے، حلوائی پیٹھے کی مٹھائی بناتے وقت پیٹھے کو کچوکتے ہیں۔

یہ ہلکے ہلکے زخم کچوکا، کچوکے کہلاتے ہیں، اردو والے دل خراش طعنوں کو مجازی مفہوم

میں کچوکنا اور کچو کے کہتے ہیں۔ ہندی لغت میں چوک کا لفظ نہیں ملتا، یہ لفظ شاہ صاحب نے کچوکنا مصدر سے چوک (واو مجہول) حاصل مصدر کے طور پر خود وضع کیا ہے اور شاہ صاحب کے ترجمہ میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ شاہ صاحب نے ضرورت کے وقت مناسب الفاظ وضع کیے اور واضع لغت کا فرض ادا کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ایک تحقیقی مکتوب (مکاتیب آزاد) میں شاہ صاحب کے بارے میں یہ تحریر کیا ہے۔ انہوں نے اس وقت قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا جب یہ زبان بالکل طفولیت کی حالت میں تھی اور نثر نویسی بھی پوری طرح شروع نہیں ہوئی تھی، ایسا کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو زبان کے ڈھالنے والے ہوتے ہیں۔'' اس ناچیز نے مستند موضح قرآن کے حاشیہ میں اس لفظ کو چوک (واو معروف) سمجھ کر اس کی تشریح کی ہے، حالانکہ یہ لفظ واو مجہول کے ساتھ ہے۔

بہر حال شاہ صاحب نے نزغ کا ترجمہ چوک کر کے یہ اشارہ کیا کہ شیطانی وسوسہ بڑا روح خراش اور دل خراش ہوتا ہے، عام مفہوم میں صرف اکسانا اور ابھارنا نہیں شیطان کے وسوسہ سے انسان کی فطرت سلیمہ پر اور اس کے دل پر ہلکا سا زخم لگ جاتا ہے۔ روح کے وجود پر کھرونچ آجاتی ہے۔ خراش پڑ جاتی ہے۔ انسان اگر ذکر الٰہی کے مرہم سے ان زخموں کا علاج کر لیتا ہے تو وہ بھر جاتے ہیں ورنہ آہستہ آہستہ وہ زخم ناسور بن جاتے ہیں۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس ہندی لفظ کی وضاحت نہیں کی۔ البتہ مولانا احمد سعید نے (کشف الرحمٰن) کے حاشیہ پر لکھا، اگر کبھی شیطان کا کچوکنا آپ کو کچو کے۔ الخ نزغ کا لفظی ترجمہ کچوکنا ہے (۲۷۷)

حدیث میں شیطانی وسوسہ کو سیاہ نقطہ سے تعبیر کیا، یہ سیاہ نقطہ وہی چوک ہے جسکی طرف شاہ صاحب اپنے ترجمہ میں اشارہ فرما رہے ہیں۔ مولانا آزادؒ نے اس آیت کے ترجمہ میں حضرت شاہ صاحب کی بہترین ترجمانی کی ہے۔ مولانا اپنی بلیغ اردو میں لکھتے ہیں: ''اور اگر ایسا ہو کہ شیطان کی طرف سے وسوسہ کی کوئی خلش محسوس ہو تو اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ (ترجمان القرآن دوم ۵۰)''

فارسی میں خلش کے معنی چبھن کے ہیں، پھانس کی چبھن، سوئی کی نوک کی چبھن، ناگوار

بات کی چبھن، استاد داغ کہتے ہیں:

کبھی چبھتی ہوئی سنا دینا
سن کے تعریف مسکرا دینا

وحشت کہتے ہیں:

وہ چشم آبلہ بھی دید کے قابل ہے اے وحشت
نظر میں جسکی پہلے چبھ گیا کانٹا بیاباں کا

ظالم تری نگاہ نے کیا کام ہے تمام
نشتر چبھوتے ہیں تو رگِ جاں کو چھوڑ کر

ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا بے محل محاورہ!

ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے شاہ صاحب کے مقابلہ میں اپنی محاورہ دانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اردو کا ایک بے محل محاورہ استعمال کیا ہے، لکھتے ہیں: ''اور اگر شیطان کے گدگدانے سے (انتقام وغیرہ کی) گدگدی تمہارے دل میں پیدا ہو تو خدا سے پناہ مانگ لیا کرو۔'' یہ محاورہ دونوں آیتوں میں استعمال کیا ہے اور دونوں جگہ حضور علیہ السلام کو عفو و درگزر اور اخلاق کریمانہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس لئے ڈپٹی صاحب نے بریکٹ میں انتقام کا لفظ تحریر کیا ہے۔

ہندی میں گدگدانے کے معنی کسی کو ہنسانے کے لئے اور شوق پیدا کرنے کے لئے چھیڑنا، یہ چھیڑ چھاڑ ہاتھ سے کی جاتی ہے، اس میں محبت کا جذبہ ہوتا ہے، غصہ اور انتقام کا جذبہ نہیں ہوتا اور شیطان کے اندر اولاد آدم کے لئے عداوت کا جذبہ ہے، محبت کا جذبہ نہیں ہے۔ ان الشیطان للانسان عدو مبین (یوسف ۵) بے شک شیطان انسان کا دشمن ہے، قرآن کریم نے شیطان کی اغوا کاری کو خود اس کے الفاظ میں حملہ کرنے سے تعبیر کیا ہے: قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِي لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ o ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ (اعراف:۱۶)'' قیامت تک زندہ رہنے کی مہلت حاصل کرنے کے بعد ابلیس نے اعلان کیا اور خدا تعالیٰ کو چیلنج کیا کہ اے خدا! تو نے مجھے راہ سے بے راہ کیا تو میں بھی اب ایسا کروں گا کہ تیری سیدھی راہ سے بھٹکانے کے لئے اولاد آدم کی تاک میں بیٹھوں اور سامنے سے، پیچھے سے داہنے سے اور بائیں سے ان پر حملہ کروں

اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائے گا۔

لاقعدنّ (قعود) کے ساتھ تاک کا لفظ شاہ صاحب ہی نے بڑھایا ہے جسے آپ کے بعد ڈپٹی صاحب اور مولانا آزاد دونوں نے استعمال کیا ہے، تاک اور گھات حملہ کرنے کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مودودی صاحب نے تاک کی جگہ گھات میں لگا رہوں گا، تحریر کیا، شیطان کے بہکانے کے لئے حملہ کرنے اور اولاد آدم سے انتقام لینے کا جو تصور قرآن کریم نے دیا ہے اس کے لحاظ سے گدگدی کرنے کا محاورہ بالکل بے محل معلوم ہوتا ہے۔ اردو شاعر نے گدگدی کرنے کا محاورہ کس موقعہ پر استعمال کیا ہے؟ دیکھئے داغ کہتے ہیں:

کچھ طبیعت تو گدگداتی تھی　　پر کسی سے نہ میل کھاتی تھی

ایک دوسرا شعر ہے:

جو میرے دل میں ہے کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے　　گدگدالوں تو کہوں پاؤں دبالوں تو کہوں

مولانا بریلوی کا ترجمہ!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے ترجمہ میں مولانا احمد رضا خاں نے شاہ صاحب کے مقابلہ میں ایک مختلف ہندی لفظ لانے کی کوشش کی ہے جو مفہوم کے اعتبار سے شاہ صاحب کے لفظ کا ہم معنی ہے لکھتے ہیں: ''اگر شیطان کوئی کونچا دے تو'' (اعراف) اگر شیطان سے کوئی کونچا پہنچے تو (فصلت) یہ لفظ کونچا دینا اصل میں ہندی لفظ کھونچ لگنے سے بنا ہے کپڑا کسی چیز میں الجھ کر تھوڑا سا پھٹ جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ کھونچ لگ گئی اس کا دوسرا تلفظ کھرونچ لگنا ہے۔ کونچا دینا یا کونچا پہنچنا، ہلکے زخم لگنے کے معنی میں ہے یہ لفظ پورب کی طرف رائج تھا، دلی اور یوپی کے مغربی اضلاع میں کھونچ لگنا بولتے ہیں۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مولانا بریلوی کی ہندی زبان پر بھی نظر تھی، مولانا نے اپنی بعض نعتوں میں بھی ہندی کے الفاظ تحریر کئے ہیں۔

قانونِ الٰہی

غیر اسلامی قانون سے رجوع اور اس کا سنگین جرم

سورہ مائدہ آیات ۴۴ تا ۴۷ میں یہود ونصاریٰ کی نافرمانیوں کے تذکرہ میں تین دفعہ اس تہدیدی فقرہ کو دوہرایا گیا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔

یعنی جو لوگ قانونِ الٰہی کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہ لوگ کافر ہیں، وہ لوگ ظالم ہیں اور وہ لوگ فاسق ہیں۔

ان آیات میں پہلی دو آیات یہود سے متعلق ہیں، علماء یہود شادی شدہ لوگوں کی بدکاری اور زنا کے جرم میں توراۃ کے اصلی حکم سنگساری کو دولت مندوں اور بڑے لوگوں سے حقیر دنیوی مفاد حاصل کر کے چھپاتے تھے اور اصل حکم کی جگہ صرف کوڑے مارنے کی سزا جاری کرتے تھے اور غریب طبقہ پر سنگساری کا اصل حکم جاری کرتے تھے۔

علماء یہود کا یہ فعل دین فروشی کرتا تھا، دین فروشی بذاتِ خود توہین ہے۔ خدا تعالیٰ کے مقدس اور بیش قیمت احکام کو دنیا کے حقیر مفاد کے بدلے بدلنا، کفر و انکار سے زیادہ بدترین فعل ہے۔ توہینِ احکامِ الٰہی کے علاوہ اس فعل میں امیر و غریب کے درمیان امتیاز قائم کرنا تھا۔

ان گناہوں کی شدت کا اظہار کرنے کے لئے قرآن کریم نے یہود پر کافر و منکر

ہونے کے ساتھ ظالم ہونے کا بھی حکم لگایا۔

تیسرا فقرہ نصاریٰ کے بارے میں ہے، ان کے علماء حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں انجیل کی واضح پیشین گوئیوں کو چھپاتے تھے، ان میں تاویلات کر کے یہ ثابت کرتے تھے کہ ان کا مصداق نبی آخر الزماں نہیں ہیں۔

قرآن نے انھیں فاسق قرار دیا، شرعی اصطلاح میں فاسق ایک نام گنہگار کو کہا جاتا ہے یہ لفظ شرعاً کافر کے لیے نہیں آتا۔ لیکن نصاریٰ کا یہ فعل کفر ہے، اس لیے یہ کہا جائے گا کہ اس مقام پر مضمون کی مناسبت سے یہ لفظ لغوی مفہوم (نکلنا، خارج ہونا) میں لایا گیا ہے اور اس سے مراد دین سے نکلنا ہے جو کفر کے ہم معنیٰ ہے۔ قرآن نے لفظی تنوع کے طور پر اور یہود کی گمراہی کی نوعیت سے جدا نوعیت کے اظہار کے طور پر اس تیسرے لفظ کو استعمال کیا ہے۔

تاویلی اختلافات!

ان آیات کی تشریح میں حضرات صحابہؓ اور تابعینؒ کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ایک جماعت ان تہدیدی فقروں کو شان نزول کے مطابق یہود و نصاریٰ کے ساتھ خاص قرار دیتی ہے۔ ایک جماعت ان میں عموم کی قائل ہے اور اہل ایمان کے ان افراد کو ان میں شامل کرتی ہے جو اس فعل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ سلف کے اسی اختلاف کی وجہ سے فقہاء کے اندر بھی اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں۔

ایک صحیح روایت میں حضرت ابن عباس کا یہ قول مذکور ہے ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون قال لیس بالکفر الذی تذھبون الیہ ـــ یعنی اس آیت میں کفر سے وہ کفر مراد نہیں ہے جس کی طرف تمہارا خیال جا رہا ہے۔

ابن طاؤس نے اس کی تشریح کی ـــ ولیس کمن یکفر باللہ وبہ لائکتہ

یعنی بنیادی عقائد کا انکار جیسا یہ انکار نہیں ہے۔
ابن جریج کہتے ہیں ـــــ کفر دون کفر وظلم دون ظلم وفسق دون فسق ـــــ یعنی کفر، ظلم اور فسق کے بھی مختلف درجات ہیں۔
یہ اشارہ کر رہے ہیں کہ اصول دین کا کفر وانکار سب سے شدید درجہ کا ہے اور حقیقی کفر ہے اور تحکیم لغیر اللہ کا کفر، ظلم اور فسق اس درجہ کا نہیں ہے۔
صاحب درمختار لکھتے ہیں ـــــ لا یفتی بکفر مسلم ـــــ اس فعل پر کسی مسلمان کے کافر ہونے کا فتویٰ نہیں لگایا جائے گا کیونکہ اہل علم کا اس میں اختلاف ہے۔ جب تک اس مسلمان کے قول وفعل میں تاویل کی گنجائش ہو ـــــ البتہ ـــــ انہ لازم علی المسلم الاتقاء من الحکم بما ھو خلاف ما انزل اللہ تعالیٰ لاجل خوف الکفر ـــــ یعنی مسلمان پر لازم ہے کہ اللہ کے نازل کردہ احکام کے خلاف فیصلہ دینے سے بچے کیونکہ اس میں کفر کا اندیشہ ہے۔ (حاشیہ مشکوٰۃ ـ ۱۰۱)

موجودہ دور کے مشہور فقیہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے بیان القرآن میں شان نزول کی تخصیص کو تسلیم نہیں کیا بلکہ عموم کو ترجیح دی۔ مولانا کی تشریح کا خلاصہ صاحب معارف القرآن نے حسب ذیل الفاظ میں نقل کیا ہے۔
تیسرا حکم ان آیات سے یہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے احکام کے خلاف حکم دینا بعض صورتوں میں کفر ہے جب کہ اعتقاد میں بھی اس کو حق نہ جانتا ہو اور بعض صورتوں میں ظلم اور فسق ہے جب کہ عقیدہ کی رو سے تو ان احکام کو حق مانتا ہو مگر عملاً اس کے خلاف کرتا ہو۔ (معارف سوم ـ ۱۶۵)
لفظ "یحکم" کے معنی فیصلہ کرنا ہے اور اس سے حاکم اور جج یعنی فیصلہ کرنے والے مراد ہیں مگر جو شخص غیر اسلامی قانون سے فیصلہ کرانے کے لیئے اس کی طرف رجوع کرے تو وہ بھی اس میں داخل ہے۔
فقہاء اسلام نے اس مسئلہ میں جو نرمی اور رخصت کے پہلو کو سامنے رکھا ہے

ظاہر ہے کہ یہ نرمی اور گنجائش اہل ایمان کی مجبوریوں سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی ان لوگوں کے بارے میں جو اصول دین و عقائد صادقہ پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور لین دین کے جھگڑوں، فوجداری معاملات، نان نفقہ کے مقدمات میں مختلف قسم کی مجبوریاں انھیں پیش آتی ہیں۔ ان مجبوریوں میں ایک مسلمان ملکی حالات اور ذاتی اعذار میں واقعی طور پر کتنا بے بس ہے اور کتنا خواہش نفسانی کی غلامی میں مبتلا ہے؟ اس مخفی حالت کا علم اللہ تعالیٰ کو پوری طرح ہے، وہی ہماری باطنی حالت کا عالم ہے۔ اپنے علم کے مطابق وہ ہر انسان سے معاملہ کرے گا۔

اہل فتویٰ ظاہری حالات پر حکم لگاتے ہیں، یہ قانون ہے ـــــ اصول دین اور اسلام وایمان کے بارے میں بھی قرآن کریم نے عزیمت اور رخصت کے دو دائرے رکھے ہیں کیونکہ مجبوری کبھی جان جانے کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔

من كفر بالله من بعد ايمانه الا من اكره وقلبه مطمئن بالايمان ولكن من شرح بالكفر صدرا فعليهم غضب من الله ولهم عذاب عظيم ۔ (نحل ۱۰۶)

یعنی جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرے، اگر وہ مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو تب تو خیر لیکن جس شخص نے دل کی رضامندی سے کفر اختیار کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے۔ اور ایسے لوگوں کے لیے بہت بڑا عذاب ہے ـــــ شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

اگر ظالم زبردستی سے منہ سے کفر کا لفظ کہلوا دے اور دل میں ایمان برقرار ہے تو اس کو گناہ نہیں ـــــ لیکن اگر مزا قبول کرے اور لفظ بھی منہ سے نہ کہے تو شہید اکبر ہے۔

طاغوت پرستی کیا ہے؟

احیاء اسلامی کی تحریکات کے ابتدائی دور میں طاغوت پرستی کی اصطلاح جا و بے جا کثرت سے استعمال کی گئی ـــــ لیکن اس تحریک کے سب سے بڑے داعی مولانا

ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس نازک مسئلہ میں جوش وجذبات کی بے اعتدالی سے بچ کر اپنی تفسیر میں (مضامین کی بات الگ ہے) جو حقیقت پسندانہ تشریح کی وہ حسب ذیل ہے :

"ممکن نہیں ہے کہ جہاں وہ انحراف (قانونِ الٰہی سے) موجود ہو، یہ تینوں (کفر، ظلم فسق) موجود نہ ہوں۔ البتہ جس طرح انحراف کے درجات ومراتب میں فرق ہے اسی طرح ان تینوں چیزوں کے مراتب میں بھی فرق ہے۔ جو شخص حکم الٰہی کے خلاف اس بنا پر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کو غلط اور اپنے یا کسی دوسرے انسان کے حکم کو صحیح سمجھتا ہے وہ مکمل کافر، ظالم اور فاسق ہے اور جو اعتقاداً حکم الٰہی کو برحق سمجھتا ہے مگر عملاً اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ اگرچہ خارج از ملت تو نہیں ہے مگر اپنے ایمان کو کفر، ظلم اور فسق سے مخلوط کر رہا ہے۔ اسی طرح جس نے تمام معاملات میں حکم الٰہی سے انحراف اختیار کر لیا ہے وہ تمام معاملات میں کافر، ظالم اور فاسق ہے۔ اور جو بعض معاملات میں مطیع اور بعض میں منحرف ہے اس کی زندگی میں ایمان واسلام اور کفر ظلم اور فسق کی آمیزش ٹھیک اسی تناسب کے ساتھ ہے جس تناسب کے ساتھ اس نے اطاعت وانحراف کو ملا رکھا ہے۔ بعض اہل تفسیر نے ان آیات کو اہل کتاب کے ساتھ مخصوص قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر کلام الٰہی کے الفاظ میں اس تاویل کے لیے کوئی گنجائش موجود نہیں۔ اس تاویل کا بہترین جواب وہ ہے جو حضرت حذیفہؓ نے دیا ہے۔ ان سے کسی نے کہا کہ یہ تینوں آیتیں تو بنی اسرائیل کے حق میں ہیں۔ اس پر حضرت حذیفہؓ نے فرمایا۔ کتنے اچھے بھائی ہیں یہ تمہارے لیے بنی اسرائیل، کہ کڑوا کڑوا سب ان کے لیے ہے اور میٹھا میٹھا سب تمہارے لیے ! ہرگز نہیں ! خدا کی قسم تم انہی کے طریقہ پر قدم بقدم چلو گے۔"

(مختصر تفہیم ص ۱۹۶

شرعی تکالیف کا سقوط اور شاہ ولی اللہؒ کا مسلک اعتدال

حیدرآباد کے ایک علاقہ میں بعض صوفی حلقوں کی طرف سے حضرت شاہ ولی اللہ کے حوالہ سے یہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ اولیاء اللہ کو عرفان کامل کا مقام حاصل ہونے کے بعد نماز و روزہ کی عبادات ان سے ساقط ہوجاتی ہیں اور یہ لوگ آیت کریمہ سورہ حجر (۹۹) کا یہ مطلب بیان کررہے ہیں: واعبد ربك حتى يأتيك اليقين ''اے نبی تم خدا کی عبادت کرو یہاں تک کہ تمہیں عین الیقین کا درجہ حاصل ہوجائے۔ میں نے کراچی پاکستان میں بھی ایک شہرت یافتہ وارثی صوفی کو اس گمراہی کا مرتکب پایا وہ حاجی وارث علی شاہ کے اس طرز عمل کو پھیلاتا تھا کہ حاجی صاحب مکہ شریف میں نماز ادا کرتے تھے حالانکہ صوفی وارث علی شاہ ایک مغلوب الحال انسان تھے۔

تصوف کے راستہ سے یہ گمراہی قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہے چنانچہ آٹھویں صدی میں حدیث وتفسیر کے امام، علامہ ابن کثیر دمشقی ﴿وفات: ۷۷۴ء﴾ نے اپنی تفسیر میں احادیث صحیحہ سے استدلال کرکے تحریر کیا ہے کہ آیت مذکورہ میں یقین سے موت مراد ہے اور عربی میں موت کا ایک نام یقین بھی ہے۔

اس کے بعد علامہ نے شرعی عبادات کی فرضیت ساقط ہونے کے تصور کو بے دینوں اور ملحدوں کا تصور قرار دے کر اس کی تردید کی ہے، لکھتے ہیں: ينظر الملاحدة الى ان المراد باليقين المعرفة فمتى وصل احدهم الى المعرفة سقط التكليف عندهم وهذا كفر وضلال و جهل ﴿جلد ۲، ص: ۵۵۹﴾ ''بے دین لوگوں کا یہ نظریہ ہے کہ اس آیت میں یقین سے مراد معرفت حق ہے پس جب کوئی انسان خدا کی معرفت حاصل کرلیتا ہے تو اس سے شرعی عبادات ساقط ہوجاتی ہیں یہ نظریہ گمراہی وضلالت ہے۔''

اس گمراہ نظریہ کی تردید نہ صرف محدثین کی طرف سے کی گئی بلکہ اکابر صوفیاء نے بھی اس تصور ملحدانہ کی تردید میں بڑی وضاحت سے کلام کیا۔

ہمارے حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ کی عجیب شان ہے، آپ خود فرماتے ہیں کہ میرے اندر جو جامعیت ہے اس کی وجہ سے میرے خیالات میں تضاد پیدا ہوگیا ہے۔ شاہ صاحب نے اپنی مشہور کتاب فیوض الحرمین میں تصوف وروحانیت کے بارے میں کچھ باتیں ایسی ہی تحریر کردی ہیں کہ ان سے عام لوگوں میں غلط فہمی راہ پالیتی ہے۔

چنانچہ غلط تصوف پر تنقید کرنے والے علماء کو فیوض الحرمین جیسی روحانی کتابوں پر تنقید کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس قسم کی کتابوں میں انفاس العارفین اور القول الجلی مشہور کتابیں ہیں القول الجلی کے اردو ترجمہ کا مقدمہ تحریر کرتے ہوئے دلی کے مشہور صوفی عالم مولانا ابوالحسن زید فاروقی مجددی نے تو اہل حق علماء کے بارے میں یہاں تک علم وعقل سے دور بات لکھ دی کہ وہابی حلقوں نے اب تک شاہ ولی اللہ کی تصوفی کتابوں کو چھپا کے رکھا اب یہ اہل سنت (بریلوی) علماء ان تصوفی اور روحانی کتابوں کو منظر عام پر لارہے ہیں۔ راقم سطور نے ایک الگ مضمون میں حضرت فاروقی صاحب مرحوم کے اس الزام کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے شاہ ولی اللہ کے صحیح مسلک کی بنیادی کتاب حجۃ اللہ البالغہ ہے۔

شاہ صاحب کے ہاں تناقض کی وجہ؟

حضرت شاہ صاحب نے اپنے بارے میں یہ بات اس موقعہ پر تحریر کی ہے جہاں آپ نے فضیلت شیخین کے مقابلے میں فضیلت حضرت علی کے نظریہ کا اظہار کیا ہے۔ شاہ صاحب نے ازالۃ الخفاء میں فضیلت شیخین ابوبکر وعمر کے بارے میں اپنی تحقیق بیان کرتے ہوئے لکھا:

تقریری کنند کہ خلافت ایشاں مطلقا بہ نص جلی نیست بلکہ امر اجتہادی ست کہ اہل عصر بنا بر اجتہاد بر آں اتفاق نمودند۔" کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ (حضرات خلفاء) کی خلافت کسی نص سے ثابت ہی نہیں ہے، یا نص صریح واضح سے ثابت نہیں ہے بلکہ ایک اجتہادی بات ہے۔ اس زمانہ کے لوگ اپنے اجتہاد اور غور وفکر سے ان لوگوں کی خلافت پر متفق ہوگئے۔

اشاعرہ کا یہ خیال شاہ صاحب کے نزدیک درست نہیں بلکہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ازاں علم شریف نصا واشارۃ خبر دادند تا ایں کہ تکلیف عباد باستخلاف ایں بزرگواراں عملا واعتقادا متحقق شد و پردہ از روی کار برانداختہ گشت۔" بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقدس علمی نظریہ کی واضح ہدایت اور اشارۃ النص ہر طریقہ سے خبر دی ہے، حتی کہ اسی بنیاد پر اللہ کے بندے اس بات کے مکلف ہوئے کہ ان بزرگوں کو خلیفہ مقرر کریں اور عملا واعتقادا یہی بات واجب ہوئی۔

مگر اسی ازالۃ الخفاء کے مصنف نے فیوض الحرمین میں جو یہ لکھا ہے کہ:

ان طبیعتی وفکرتی اذا ترکتا وانفسهما فضلتا علیا کرم الله وجهه واحبتاه اشد محبة. ''میری طبیعت اور میری فکر کو جب اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو دونوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فضیلت دیں اور دونوں کو حضرت سے شدید محبت ہے۔''

تو کیا آپ کی طبیعت وفکر کا یہ رنگ اسی تصوف کا نتیجہ نہیں ہے جس کے آپ اوپر سے وارث چلے آرہے تھے وہ تو غنیمت ہوا کہ دربار رسالت سے جیسا وہ خود لکھتے ہیں ''الوصاءة بتفضيل الشيخين''یعنی شیخین حضرت ابوبکر وعمر کو افضلیت دینے کی وصیت ہوئی اس لئے فرماتے ہیں کہ یہ تفضیل شیخین کا اعتقاد ایک ایسا تصور ہے جو میری ذاتی خواہش کے خلاف مجھے اس کے ماننے کے لئے خدا کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں: هذه المناقضات عنی بان الجامعية هی التی او عتنی فی ذالك۔ یہ متناقض اور متضاد باتیں ہیں اور مجھے اس حال میں میری اس جامعیت نے پہنچادیا ہے جو میرے اندر موجود ہے، (فیوض الحرمین ۶۵) مدیر الفرقان مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ نے شاہ ولی اللہ نمبر میں شاہ صاحب کے اس تصور کی تاویل کرتے ہوئے حاشیہ پر لکھا:

''شاہ صاحب کی طبیعت کا یہ میلان اسی قسم کا تھا جیسا کہ عموماً لوگوں کو اپنے روحانی بزرگوں کے اعزہ واقارب خصوصاً ان کی اولاد کی طرف ہوتا ہے جو صرف ''طبیعت'' ہی کا اقتضاء ہوتا ہے اور امور دین میں ''طبیعت'' کے اس اقتضاء کا کوئی دخل نہیں پہنچا۔''

تقلید اور عدم تقلید!

حضرت شاہ صاحب کی جامعیت سے پیدا شدہ تضاد بیان اور تضاد فکر ونظر کی دوسری مثال یہ ہے کہ شاہ صاحب کی آزاد فکری اور تحقیقی ذوق ایک طرف فقہی تقلید سے انکار کرتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی تقلید ائمہ اربعہ کے بارے میں نبوت کی طرف سے آپ کو جو الہامی اشارے کئے گئے اس کا اظہار بھی آپ کی طرف سے کیا جاتا ہے شاہ صاحب فیوض الحرمین میں فرماتے ہیں: وحلتی تابی التقليد وتانف منه (فیوض الحرمین) ''میری فطرت وجبلت تقلید سے انکار کرتی ہے اور تقلید سے بے زاری ظاہر کرتی ہے۔'' دوسری طرف شاہ صاحب خود اس کا اظہار کرتے ہیں کہ دربار نبوت سے براہ راست یہ وصیت کی گئی کہ میں چار فقہی مسالک کے دائرہ سے قدم باہر نہ نکالوں اور جہاں تک ہو سکے اختلاف میں تطبیق کی کوشش کروں۔

والتقليد بهذه المذاهب الاربعة: لا اخراج منها والتوفيق ما استطعت ولكن

طلب منی التعدية بخلاف نفسی. اس ہدایت کے باوجود میری طبیعت اس سے باہر نکلنا چاہتی ہے۔ پھر فرماتے ہیں: وھھنا نکتة طویت ذکرھا وقد تفطنت بحمد الله بسر الجبلة وھذا الوصاة (فیوض ص: ۶۵) یہ شریعت حقہ کا ایک ایسا راز ہے جسے میں بیان نہیں کر سکتا اور اپنی طبیعت کے میلان اور حضور علیہ السلام کی مخفی ہدایت دونوں کو میں نے سمجھ لیا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کی تنقید

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی مرحوم نے اپنی اہم کتاب تزکیہ نفس میں حضرات صوفیاء کے بعض تصورات و معمولات پر تنقید کی ہے اور تصوف کے اس مسئلہ پر خاص طور پر مصنف کی تنقید کا انداز بیان بہت سخت ہو گیا ہے کہ بعض صوفیاء کے نزدیک سالک جب کمال معرفت کے عروج پر پہنچتا ہے تو اس سے شرعی تکالیف ساقط ہو جاتی ہیں۔ مولانا اصلاحی نے اس تنقیدی بحث میں حضرت امام شاہ ولی اللہ کی مشہور کتاب فیوض الحرمین کی ایک عبارت کا بھی حوالہ دیا ہے اور اس اجمالی تذکرہ کے ساتھ کہ قارئین کے اندر یہ خیال بیٹھ جاتا ہے کہ یہ نظریہ شاہ ولی اللہ کا بھی ہے۔

سن ۵۵ء کا واقعہ ہے کہ میں نے تزکیہ نفس کی یہ بحث پڑھی اور مجھے شاہ صاحب کی فیوض الحرمین کے براہ راست مطالعہ کی ضرورت پیش آئی۔ دہلی کے مشہور مفسر قرآن مولانا محمد یوسف صاحب فقیر دہلوی (محلہ چوڑی والاان دہلی) سے میں نے تذکرہ کیا، مولانا مرحوم نے بتایا کہ یہ کتاب دلی کے مشہور روحانی بزرگ حضرت حاجی محمد اسماعیل صاحب جاپان والے کے کتب خانہ میں موجود ہے، وہاں آ کر اسے دیکھ لو۔ اس وقت مولانا فقیر دہلوی حاجی صاحب مرحوم کے دولت خانہ میں بیٹھ کر امام عبد الوہاب شعرانی کی کتاب الیواقیت والجواہر عربی کا اردو میں ترجمہ کر رہے تھے۔

حاجی صاحب مرحوم مولانا اشرف علی صاحب تھانوی علیہ الرحمۃ کے خلیفہ مجاز تھے اور تصوف کی اس کتاب کے اردو ترجمہ کے بارے میں حضرت تھانوی کی خواہش اور تائید انہیں حاصل تھی۔ حاجی صاحب کا دولت خانہ حویلی حسام الدین حیدر بلی ماران میں واقع تھا۔ میں نے حاجی صاحب کے دولت خانہ ہی میں فیوض الحرمین کا مطالعہ کیا اور اس کی جس عبارت پر تنقید کی گئی تھی اسے پورا پڑھا اور شیخ ابن عربی کے شارح امام شعرانی کی کتاب الیواقت (تالیف ۹۵۵ھ) بھی وہیں دیکھی جس میں تصوف کے اس مسئلہ کی وضاحت کی گئی ہے۔ مولانا محمد یوسف صاحب دہلوی نے اس سلسلہ میں میری رہنمائی کی کیونکہ اس کتاب کا ترجمہ کرتے وقت مولانا کی نظر سے یہ مسئلہ گزرا تھا۔ افسوس ہے کہ الیواقیت کا وہ

بہترین ترجمہ حاجی صاحب کے کتب خانہ کے ساتھ لا پتہ ہوگیا اور حاجی صاحب کی عمر نے وفانہ کی اور حاجی صاحب ترجمہ کو طبع نہ کرا سکے اس وقت اس ناچیز نے اس مسئلہ کے بارے میں ایک مختصر مضمون مرتب کر کے ماہنامہ دارالعلوم (ماہ اکتوبر ۵۱) میں شائع کرایا: پیش نظر اس اہم مسئلہ کی تفصیل ہے جو سکندر آباد کے ایک عالم عبدالرشید صاحب باقوی ندوی کی تحریک پر ترجمان دارالعلوم جدید میں شائع کیا جا رہا ہے:

تحقیق شریف

شاہ صاحب نے فیوض الحرمین میں اس مسئلہ کی تحقیق و تاویل کے مضمون پر تحقیق شریف کا عنوان قائم کیا ہے مضمون حسب ذیل ہے:

ان الاولیاء کثیرا ما یلهمون بان الله تعالیٰ اسقط عنهم التکلیف وانه خیرهم فی الطاعات ان شاؤا فعلوها وان لم یشاؤا لم یفعلوها. حکی لی سیدی الوالد رضی الله عنه عن نفسه انه الهم بهذا وانه دعا الله تعالیٰ ان یقیم علیه التکلیف وما اختار الا التنمس ولم یکن من مذهبه سقوط التکلیف عن احد من خلق الله ما دام عاقلا بالغا فرأیته یری الالهام حقا ویری من مذهبه حقا و تحیر فی التطبیق.

واخبرت عن سیدی العم قدس سره انه کان یخبر عن نفسه انه الهم بسقوط التکلیف وقیل له ان عبدت خوفا من النار فانا قد اجرنا ک عن النار وان عبدت طمعا فی الجنة فانا وعدناك ان ندخلك ایاها وان عبدت طلبا لرضانا فقد رضینا عنك رضا لا سخط بعده فقال: ربی انما اعبدك لا شئی دونك.

وکان قدس سره یمیل الی ان الکمل یسقط عنهم التکلیف والله سبحانه هو الذی یقیم علیهم النوامیس من غیر اختیارهم. هکذا روی عن کثیر من اولیاء الله تعالیٰ والسر فی ذلك عندی ان الانسان اذا انتقل عن الایمان بالغیب بهذا النوامیس الی الایمان بها علی بنیة ووجد هذه العبادات والنوامیس فی نفسه مثل الجوع والعطش مما لا یقدر علی ترکه فلا معنی لتعلق التکلیف بها لانها من الجبلة التی جبل علیها سواء هذا السر واضحا منشرحا او مجملا ترشح من ذلك علی باطنه خطاب من الحق انما مشارة هذه الحالة الاجمالیة والتفصیلیة ان الله تعالیٰ اسقط عنه التکلیف بعد ذالك التنمس من اختیار وقصد (مطبع احمدی ص:۲۳و۲۴)

شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کی اس تحقیق شریف کا حاصل یہ ہے: اولیاء پر خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے کہ ان سے نماز و روزہ کی تکالیف ساقط کر دی گئیں انہیں اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کی اطاعت کریں اور چاہیں تو اطاعت نہ کریں۔ میرے والد (شاہ عبدالرحیم صاحب) نے مجھے بتایا کہ مجھ پر بھی خدا کی طرف سے یہ الہام ہوا مگر میں نے خدا تعالیٰ سے دعاء کی کہ وہ مجھے اپنی اطاعت گزاری پر قائم رکھے، میرے والد نے خدا تعالیٰ کی طرف سے روحانی اور غیبی قوتوں کے نزول کو اختیار کیا عبادات کے سقوط کو اختیار نہیں کیا۔ کیونکہ میرے والد کا یہ مسلک تھا کہ عبادات کسی بندہ سے ساقط نہیں ہوتیں جب تک وہ عاقل و بالغ ہو۔ میں نے دیکھا کہ میرے والد اس طرح کے الہام کو بھی حق سمجھتے تھے اور ان کا اپنا مذہب بھی ان کے نزدیک حق تھا۔

اب انہیں ان دونوں باتوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے میں بڑی حیرانی ہوئی۔ میرے محترم چچا (شاہ ابوالرضا محمد) نے بھی مجھے بتایا کہ مجھ پر بھی اس قسم کا الہام ہوا تھا۔ ان کا میلان بھی اس طرف تھا کہ اصحاب کمال اولیاء سے شرعی عبادات کی تکلیف ساقط کر دی جاتی ہے۔ اور خدا تعالیٰ کی طرف سے ان پر روحانی انوار نازل ہوتے ہیں ان کے اختیار کے بغیر۔ یہی مسلک اکثر اولیاء اللہ سے منقول ہے اس باریک بات کا حل میرے نزدیک یہ ہے کہ انسان جب ایمان بالغیب سے ایمان بالشہادۃ اور عین الیقین کے مرتبہ پر غیبی انوار کے ذریعہ پہنچتا ہے تو اس وقت احکام شریعت کی اطاعت فطری خواہشات جیسے بھوک پیاس کی مانند ہو جاتی ہے اور اسے عبادت سے کوئی زحمت و تکلیف نہیں ہوتی۔'' یہ مطلب ہے تکالیف کے ساقط ہونے کا، شاہ ولی اللہ کے چچا شاہ ابوالرضا محمد کا مقبرہ بستی نظام الدین کے پرانے قبرستان میں واقع تھا جب ہوٹل او برائے تعمیر ہوا تو اس مقبرہ اور گنبد کو منہدم کر دیا گیا۔ اس وقت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب دلی وقف بورڈ کے چیرمین تھے، مولانا اس تاریخی مقبرہ کو گرائے جانے کی خبر سنکر فوراً موقعہ پر پہنچے، اس وقت کارروائی روک دی گئی لیکن بعد میں راتوں رات اس گنبد پر کدال چلا کر اسے ختم کر دیا گیا۔ شاہ عبدالرحیم پر علم حدیث و تفسیر کا غلبہ تھا، اس لئے انہیں مہندیان میں دفن کیا گیا، جہاں آج تک بھی گنبد نہیں، موجودہ چھت بھی ۷۴ء کے بعد بنائی گئی۔

امام الصوفیہ شیخ اکبر کی تشریحات

امام عبدالوہاب شعرانی نے اپنی مشہور کتاب ''کتاب الیواقیت والجواھر'' میں اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی ہے اور صوفیہ کے اس حال کی وضاحت کی ہے۔ امام موصوف نے یہ کتاب اہل نظر

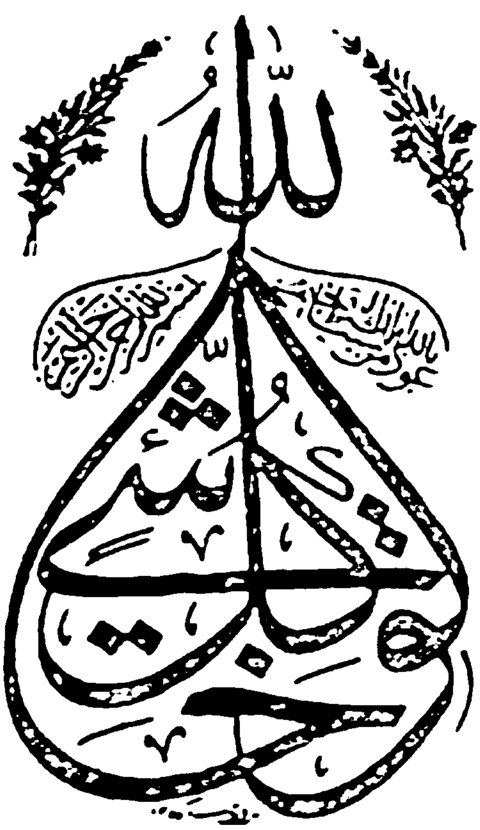
واستدلال اور اہل کشف واعیان کے عقائد میں تطبیق دینے کی غرض سے ۹۵۵ھ میں تالیف فرمائی اور اس میں صوفیاء کے ترجمان کی حیثیت سے محی الدین ابن عربی قدس سرہ کی کتاب "فتوحات مکیہ" کو سامنے رکھا ہے اور اسی کتاب کے اقتباسات جگہ جگہ نقل کئے ہیں وجہ اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابن عربی کا کلام بعض حضرات کے نزدیک درجۂ اعتبار سے گرا ہوا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے شیخ کے اشاراتی اور دقیق کلام کو ان کی تصریحات سے الگ کر کے دیکھا ہے۔

امام موصوف نے 'یواقیت' میں بنیادی اور اہم عقائد سے متعلق شیخ کی تمام تصریحات فتوحات سے نکال کر سامنے رکھ دی ہیں اور ان کی روشنی میں ان کے کلام کا مطلب واضح کیا ہے، امام صاحب کتاب کے چھبیسویں مبحث کو اس طرح شروع کرتے ہیں۔ یہ بات ناممکن ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے کسی صاحب عقل سے شرعی تکالیف کا سقوط ہو، اگر یہ بات مسلم نہ ہوتی تو ہر شخص جس سے حجاب مرتفع ہو جاتا وہ شرعی تکالیف سے بری کر دیا جاتا، کیونکہ وہ اس حالت میں حق تعالیٰ کے سوا کسی کو 'فاعل' نہ دیکھتا۔ حالانکہ اہل سنت والجماعت میں سے کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں ہے۔ بعض عارفین یہ کہتے ہیں کہ: سالک ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے کہ اس سے تکالیف مرتفع ہو جاتی ہے ان السالك يصل الى مقام يرتفع عنه التكليف مراد بدفع التكليف ذهاب كلفة العبادة تو اس قول سے مراد یہ ہے کہ عبادت کی تکلیف وزحمت دور ہو جاتی ہے سالک شرعی پابندیوں سے ملول اور دل برداشتہ نہیں ہوتا بلکہ ہر پابندی اور ہر ریاضت سے اس کو لذت وسرور حاصل ہونے لگتا ہے۔

اکابر صوفیاء کیا کہتے ہیں؟

جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ جو امام الصوفیہ اور شیخ العارفین اور بقول سلطان العارفین بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ صوفیہ میں ایسے ہیں جیسے فرشتوں میں حضرت جبرئیل علیہ السلام۔ ان سے پوچھا گیا: بعض لوگ کہتے ہیں کہ تکالیف شرعی ساقط ہو جاتی ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ تکالیف شرعی تو وسیلہ ہیں وصول وقرب کا۔ انہوں نے جواب دیا: صدقوا فی الوصول ولكن الى سقر والذی يزنی ويسرق خير ممن يعتقد هذا، ولو اننی بقيت الف عام ما نقصت من اورادی شيئا إلا بعذر شرعی. " تصدیق کرو ان کے پہنچنے کی لیکن جہنم میں (پہنچنے کی) اور وہ شخص جو زنا اور چوری کرتا ہے اس شخص سے بہتر ہے جو اس قسم کا اعتقاد رکھے اور میں اگر ایک ہزار سال بھی زندہ رہوں گا تو اپنے مشاغل ذکر میں کوئی کمی نہیں آنے دوں گا۔ ہاں شرعی مجبوری کی بات الگ ہے۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ کچھ گمراہ لوگوں نے ''سقوط'' کا مطلب یہی لینا شروع کر دیا تھا کہ تابعداری سے مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے، اور ان لوگوں کو جنید بغدادی قدس سرہ ''داخل جہنم'' (دوزخی) فرما رہے ہیں۔ خطاب شرعی کے بارے میں شیخ اکبر دوسروں کے مقابلہ میں بہت متشدد معلوم ہوتے ہیں، الزام تو صوفیوں پر اس بات کا ہے کہ یہ لوگ ظاہر شریعت کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے مگر امام صوفیہ اس بارے میں جو رائے رکھتے ہیں وہ ملاحظہ ہو شیخ فتوحات مکیہ میں نماز نفل پر کلام کرتے ہوئے کہتے ہیں: اقول بہ ان من غلب علیہ حال او کان مجنونا او صبیا فہو تحت خطاب الشرع خلافا لبعضہم. مغلوب الحال صوفی، مجنون اور بچہ یہ بھی خطاب شرع کے ماتحت ہیں بعض کا اس میں اختلاف ہے: وجہ اس کی یہ ہے کہ کوئی حالت مکلف کی ایسی نہیں ہے جس میں وہ بالکلیہ حکم شریعت سے خارج ہو جائے۔ دیکھو..... بچے اور مجنون کو ان بعض چیزوں میں تصرف کی اجازت ہے جس میں دوسروں کو نہیں..... لیکن یہ اجازت کس نے دی؟ شریعت ہی نے تو دی ہے پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ حکم شرع سے یہ لوگ نکل گئے۔'' بڑا عجیب نکتہ ہے جو شیخ نے بیان کیا ہے۔ (یواقیت ۱۳۹، ۱۴۰)



حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور مولانا آزادؒ

انگریزی دور میں حکومت برطانیہ کی حکمت عملی کے تحت مختلف مذاہب کے علماء، پنڈت اور پادری اپنے اپنے مذہب کی سچائی پر مناظرہ اور مباحثہ کرتے تھے۔ اس میدان میں ایک پادری (فنڈر) کی بڑی شہرت تھی، پادری فنڈر مسلمان علماء سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت وافضلیت کے موضوع پر بحث کرتا تھا۔ اس موضوع پر اس کا مطالعہ بڑا وسیع تھا، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور مولانا شرف الحق دہلوی جیسے جید علماء سے اس کا مقابلہ رہا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں حضرت عیسی علیہ السلام کی افضلیت پر فنڈر کا ایک مناظرہ ہوا۔ یہ مناظرہ کس مسلمان عالم سے ہوا؟ اس کی تفصیل معلوم نہیں ہوسکی۔ اسی مناظرہ میں فنڈر نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائشی معصومیت پر قرآن کریم سے استدلال کرتے ہوئے قرآن کریم کی یہ آیت پیش کی:

اِنِّي اُعِيذُهَا بِكَ وذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْم فَتَقَبَّلَهَا رَبُّها بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ (آل عمران ۳۷) ''حضرت مریم کی ماں نے دعاء کی کہ اے خدا! میں اس لڑکی اور اس کی اولاد کو شیطان لعین سے تیری پناہ اور تیری حفاظت میں دیتی ہوں، خدا تعالیٰ نے اس کی دعاء اچھی طرح قبول کی۔'' قرآن کریم کی یہ آیت حضرت عیسیٰ اور ان کی ماں مریم کو پیدائشی معصوم ثابت کررہی ہے اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ الَّذِيْ اَنقَضَ ظَهْرَكَ (سورہ انشراح ۲)

فنڈر نے اس آیت کا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی کے موضح قرآن کے حوالہ سے حسب ذیل پیش کیا:

''ہم نے تجھ سے تیرے گناہوں کا بوجھ دور کر دیا'' اس آیت سے فنڈر نے ثابت کیا کہ رسول پاک پہلے گناہوں میں آلودہ تھے خدا تعالی نے بعد میں آپ کو اس بوجھ سے ہلکا کیا۔

اس مباحثہ میں مد مقابل مسلم مناظر نے کیا جواب دیا، اس کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی البتہ مولانا آزاد کے ایک مکتوب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد یا تو اس مناظرہ میں شریک تھے یا کسی آدمی نے انہیں اس مناظرہ کی اور فنڈر کے استدلال کی روداد سنائی اور وہ مولانا کے ذہن میں محفوظ رہی۔

چنانچہ لاہور کے مشہور صاحب علم خواجہ عبدالوحید لاہوری نے مولانا آزاد کی خدمت میں ایک مضمون قرآن کے تراجم کے بارے میں ارسال کیا۔ جس میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ موضح قرآن سے متعلق بھی سوالات کے گئے۔

خواجہ عبدالوحید حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے مقربین میں سے تھے اور مولانا لاہوری شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے خاندانی علوم کے بہترین شارح کے طور پر مشہور اور مسلم تھے، ہوسکتا ہے کہ خواجہ عبدالوحید نے مولانا لاہوری کے مشورہ سے یہ مضمون مولانا آزاد کو بھیجا ہو تا کہ شاہ عبدالقادر صاحب کے اردو ترجمہ و تفسیری حواشی کے بارے میں ان کی رائے معلوم ہو، مولانا آزاد نے ۱۲/۱۰/۱۹۳۴ء کو اس مضمون کے بارے میں اپنا جوابی مکتوب ارسال کیا جو مکاتیب ابوالکلام آزاد شائع شدہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی میں شامل ہے۔

مولانا آزاد کے یہ مکاتیب کراچی کے مشہور صاحب قلم مولانا ابوسلمان شاہ جہانپوری نے مرتب کیے ہیں۔ راقم السطور نے جب مولانا آزاد کے ان مکاتیب کے مجموعہ میں متعلقہ مکتوب کو پڑھا تو اس نے غور کیا کہ مولانا آزاد شاہ عبدالقادر صاحب کے اردو کے ترجمہ کے بارے میں کوئی بات تحقیق کے بغیر تحریر نہیں کر سکتے تھے، ضرور مولانا کے سامنے موضح قرآن کا کوئی ایڈیشن ایسا موجود رہا ہوگا جس میں شاہ صاحب کے نام سے مذکورہ ترجمہ کیا گیا ہے کیونکہ شاہ صاحب کے فوائد میں اہل باطل کی طرف سے تصرفات اور الحاقات کی کوششیں ابتدا ہی سے جاری ہیں۔

سید عبداللہ لاہوری کا ایڈیشن جو کلکتہ میں اردو ٹائپ کے اندر چھپا ہے وہ پہلا ایڈیشن ہے اس کا جو نسخہ میرے پاس ہے اس میں شاہ صاحب کے فوائد و حواشی میں تصرف والحاق کی تین

مثالیں میرے سامنے تھیں۔ایک مثال یہ کہ سورہ الطارق میں وَاِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ (آیت ۸) کے فائدہ میں دنیا کے لفظ کا اضافہ کیا گیا یعنی اللہ تعالی انسان کو موت کے بعد دنیا میں واپس لانے پر قادر ہے۔ظاہر ہے کہ یہ اضافہ آریہ سماج کی طرف سے کیا گیا اور انہوں نے قرآن سے آواگمن اور تناسخ ثابت کرنے کی کوشش کی۔

حالانکہ موضح قرآن کے کسی دوسرے مستند نسخہ میں ''دنیا'' کا لفظ موجود نہیں ہے۔دوسری مثال یہ ہے کہ سورہ الحاقہ (پارہ تبارک) کے حاشیہ پر دونوں طرف کاغذ چسپاں کیا گیا اور اس میں اہل بیت نبوی کی تعریف وتوصیف میں شیعی نظریات کو داخل کیا گیا اور یہ لکھا گیا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنا وصی بنایا اور آپکو یعسوب المومنین کا خطاب دیا۔غور کرنے سے صاف صاف نظر آرہا ہے کہ دونوں طرف اوپر سے کاغذ چسپاں کئے گئے ہیں۔اسی طرح سورہ عبس کے حاشیہ پر ایک فائدہ میں آخرت کے دن کا طول بیان کیا گیا ہے اور اسے ان الفاظ میں حضرت علی کرم اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے''حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے مروی ہے۔''

حالانکہ موضح قرآن کے کسی نسخہ میں یہ فائدہ موجود نہیں، یہ صاف صاف الحاق ہے ان تصرفات کے پیش نظر مجھے یہ شبہ ہوا کہ شاید سورہ الم نشرح کے ترجمہ میں بھی کوئی تصرف کیا گیا ہو مگر جب میں نے اپنے مرتب کردہ مستند موضح قرآن میں (جو میں نے ۱۸ مختلف ایڈیشنوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے) اس آیت کا ترجمہ دیکھا اور پھر مزید اطمینان کے لئے مکاتیب کے مرتب مولانا شاہ جہانپوری سے کراچی میں (۸۲ء) ملاقات کر کے اصلی مسودات کو غور سے پڑھا۔تب مجھے معلوم ہوا کہ مولانا آزاد نے اپنے اس مکتوب میں غیر تحقیقی باتیں تحریر کی ہیں۔اس وقت (۸۲ء) میں نے اس مکتوب آزاد کی وضاحت میں مختصر مضمون تحریر کر کے اپنی کتاب محاسن موضح قرآن میں شامل کر دیا کیونکہ یہ کتاب طباعت کے لئے جا رہی تھی لیکن میں نے مولانا ابوسلمان صاحب شاہ جہانپوری سے وعدہ کیا تھا کہ اس پر تفصیلی مضمون تحریر کروں گا۔چنانچہ حسب ذیل مضمون اسی وعدہ کا ایفاء ہے۔

مولانا آزاد کا جوابی مکتوب

مولانا آزاد خواجہ عبد الوحید کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں: آپ نے قرآن کا جو اعلان مطبوعہ بھیجا ہے اس میں چند باتیں تصحیح طلب معلوم ہوتی ہیں، خیال ہوا کہ آپ لوگوں کو لکھ دوں،

ممکن ہے کہ کام آئے۔

(۱) یہ واقعہ کہ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ قدسی کے مصرعہ میں تصرف کر کے کہا کرتے تھے:

من نیز حاضری شوم تفسیر قراں در بغل

محل نظر ہے اور ممکن ہے کہ التباس ہوا ہو، دراصل جو واقعہ منقول ہے وہ شاہ عبدالعزیز صاحب" کا ہے ان کے ملفوظات میں ہے کہ انتقال سے پہلے ربیع الاول کی مجلس وعظ میں قدسی کا مندرجہ صدر شعر بہ تصرف پڑھا اور اپنی تفسیر کی طرف اشارہ کیا۔

(۲) یہ جو مشہور ہے کہ شاہ صاحب نے اپنا ترجمہ چالیس برس میں پورا کیا، صحیح نہیں معلوم ہوتا، بھلا چالیس برس کی اس میں کیا بات تھی؟

صحیح بات یہ ہے کہ شاہ صاحب نے یہ ترجمہ سید احمد بریلوی کی فرمائش پر کیا۔ شاہ صاحب زینت المساجد (دریا گنج) کے ایک حجرہ میں رہا کرتے تھے وہیں یہ ترجمہ کیا۔

(۴) شاہ صاحب کے بعض حواشی نے منکرین اسلام کو اعتراض کا موقع دیا مثلاً سورہ الم نشرح میں وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْ کا یہ ترجمہ کرنا "ہم نے گناہوں کا بوجھ دور کر دیا ہے" پادری فنڈر نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خلاف اس سے تثبت (استدلال) کیا تھا۔

(۵) شاہ صاحب نے اپنے حواشی میں ضعیف قصوں اور اسرائیلی روایات سے بھی اجتناب نہیں کیا، مثلاً ہاروت و ماروت کی کہانی اور طالوت کا اس طرح منتخب ہونا کہ ایک لکڑی کے گز کے پیمانے سے ٹھیک اترے حالانکہ قرآن کہتا ہے: بسطة فی العلم والجسم وغیر ذالک.

(٦) باقی رہا مطالب قرآن اور اس کی مبہمات کا معاملہ تو اہل نظر سے مخفی نہیں کہ اس باب میں ان کے سامنے عام سطح سے کوئی بلند تر مقام موجود نہیں تھا، انہوں نے کہیں بھی جلالین اور بیضاوی سے آگے قدم نہیں بڑھایا اس لئے وہ کمزوریاں ان کے تفسیری اختیارات میں موجود ہیں جو عام طور پر متداول تفاسیر میں پائی جاتی ہیں۔

مکتوب الیہ خواجہ عبدالوحید صاحب نے اس مکتوب آزاد کی تعریف کرتے ہوئے لکھا شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ اور تفسیر کے متعلق یہ پہلی بے لاگ رائے ہے جو علم میں آئی ورنہ ہر کسی نے اس کی مدح وستائش ہی کی ہے۔"

مولانا آزاد کا یہ مکتوب مولنا احمد علی صاحب لاہوری کے علم میں آیا یا نہیں؟ کیونکہ خواجہ صاحب کا تعلق اسی مولانا لاہوری کی انجمن خدام الدین سے تھا اگر مولانا کے علم میں آتا تو مولانا ضرور اس کا جواب تحریر فرماتے۔

مولانا آزاد کی تنقیدات کے جوابات!

مولانا آزاد کی علمی شخصیت اور مولنا کا قرآن کریم کے علوم سے خاص تعلق اظہر من الشمس ہے لیکن مولانا علیہ الرحمۃ کی مذکورہ تنقیدات سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ اب تک مولنا کا یہ مکتوب گرامی کسی صاحب کی نظر سے کیوں نہیں گزرا اس پر تعجب کرنے کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے۔

(۱) قدسی کے مشہور فارسی کے متعلق مولنا نے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے اس شعر کی نسبت شاہ عبد القادر کی طرف درست نہیں ہے۔

(۲) شاہ صاحب نے سید احمد بریلوی صاحب کی خواہش پر ترجمہ کیا تاریخی طور پر یہ بات درست نہیں ہے۔ سید احمد صاحب کی تاریخ پیدائش ۶/صفر ۱۲۰۱ھ ہے اور حضرت شاہ صاحب کا ترجمہ ۱۲۰۵ھ کو مکمل ہو چکا تھا جیسا کہ موضح قرآن کے اعداد سے ظاہر ہے، یہ نام شاہ صاحب نے تاریخی رکھا ہے۔

سید صاحب شاہ صاحب کی خدمت میں اس وقت پہنچے جب آپ کی عمر کم و بیش اٹھارہ برس کی تھی۔ مولانا آزاد کو تعجب ہے کہ شاہ صاحب نے ترجمہ قرآن میں چالیس سال کیسے لگا دیے؟

''بھلا چالیس برس کی اس میں کیا بات تھی؟''

چالیس برس کا قول علماء دیوبند میں مشہور ہے، ''امیر الروایات'' مشہور کتاب اس قول کا ماخذ ہے۔

مولانا آزاد نے اپنے اسی مکتوب میں شاہ صاحب کے ترجمہ کے بارے میں تعریف کے جو فقرے تحریر کیے ہیں ان فقروں میں مولانا کے استعجاب کا جذبہ موجود ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

شاہ صاحب کی سب سے بڑی خدمت جسمیں اردو زبان ہمیشہ ان کی احسان مند رہے گی کہ انہوں نے اس وقت قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا جب یہ زبان بالکل طفولیت کی حالت میں تھی اور نثر نویسی بھی پوری طرح شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس کام کو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو زبان کے

ڈھالنے والے ہوتے ہیں ؎:

اس کے علاوہ شاہ صاحب ترجمہ کا کام اپنی تعلیمی اور تدریسی خدمات کے ساتھ انجام دیتے تھے، یہ مطلب نہیں کہ دن رات ترجمہ نویسی میں مشغول رہتے تھے۔

شاہ صاحب نے جس تحریک و ترغیب پر موضح قرآن ترتیب دیا وہ ان کے والد شاہ ولی اللہ کی تحریک جہاد بالقرآن، رجوع الی القرآن اور اشاعت قرآن تھی جسکا اشارہ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ نے اپنے فارسی ترجمہ فتح الرحمٰن کے مقدمہ میں کیا ہے۔

اسی تحریک پر شاہ ولی اللہ کے تین صاحبزادے اس کی تکمیل پر متوجہ ہوئے۔شاہ عبد العزیز صاحبؒ نے فارسی میں ایک عظیم تفسیر شروع کی اور شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر صاحبان نے بالترتیب قرآن کا تحت لفظ ترجمہ اور بامحاورہ اردو ترجمہ تحریر کیا۔البتہ شاہ صاحب کے ترجمہ کی طباعت کے سلسلہ میں یہ بات ضرور سامنے آتی ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن اس طرح طبع ہوا کہ حضرت سید صاحب کے بھانجے مولانا سید احمد علی صاحب کے پاس شاہ صاحب کے ترجمہ کا مسودہ تھا اور حضرت سید احمد بریلوی کے مشہور سفر حج میں یہ شریک تھے۔

سید صاحب کے ایک مرید سید عبد اللہ لاہوری بھی اس جماعت مجاہدین کے ساتھ سفر حج میں شامل تھے، انہوں نے اس سفر میں اس مسودہ کو نقل کیا اور حج سے واپس آکر اسے کلکتہ کے مطبع احمدی، میں ٹائپ کے حروف کے اندر چھپوایا، اس وقت اردو کی طباعت کا یہی انتظام تھا۔

عین ممکن ہے کہ اس طباعت کے لئے حضرت سید احمد صاحب کی ترغیب محرک رہی ہو۔

(۳) شاہ صاحب نے زینت المساجد (دریا گنج) کے حجرہ میں موضح قرآن ترتیب نہیں دیا بلکہ اپنے قائم کردہ مدرسہ واقع مسجد اکبر آبادی (موجود چوراہا دریا گنج) میں ترتیب دیا۔

شاہ صاحب نے اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ (کلاں محل) سے الگ ہو کر مذکورہ (بیگم شاہ جہاں کی مسجد) کو آباد کیا۔

(۴) مولانا آزاد کے خیال میں موضح قرآن کے مطالب قرآنی اور مبہمات تفسیری کی سطح جلالین اور بیضاوی سے بلند نہیں۔اس سلسلہ میں مولنا آزاد کی اس رائے پر مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کی رائے کو ترجیح حاصل ہے۔

مولانا کشمیریؒ جملہ علوم اسلامی ،تفسیر، حدیث، فقہ اور کلام کے ماہر عالم تھے، آپ کی رائے شاہ صاحب کے تفسیری مطالب کے بارے میں یہ تھی ''عربی کی بیسیوں تفسیروں کے مطالعہ سے قرآن کریم کی جو مشکل بات سمجھ میں نہیں آتی وہ شاہ عبدالقادر کی موضح قرآن سے حل ہو جاتی ہے مگر شاہ صاحب کے ہاں اجمال اور اختصار بہت ہے''

(۵) موضح قرآن کے حواشی میں اسرائیلی روایات کی کثرت کا جو اعتراض مولانا آزاد نے اس مکتوب میں کیا ہے وہ درست ہے، شاہ صاحب نے تفسیری روایات کے نقل کرنے میں تحقیق و تنقید سے کام نہیں لیا بلکہ اپنے بڑے بھائی اور استاد حضرت حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی توسع پسندی سے کام لیا اور اس توسع پسندی اور بعض اسرائیلی روایات کی شہرت کے سبب ان کی مقبولیت کا اثر بڑے شاہ صاحبؒ کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے اندر بھی نظر آتا ہے جیسا کہ اس ناچیز نے اسرائیلی روایات سے متعلق اپنے تحقیقی مضمون میں واضح کیا ہے۔

(٦) مولانا آزاد نے پادری فنڈر کے حوالہ سے شاہ صاحب کے جس ترجمہ پر اعتراض کیا ہے افسوس ہے کہ مولانا نے شاہ صاحب کا ترجمہ براہ راست دیکھنے کے بجائے محض سنی سنائی بات پر اعتماد کر کے اسے بیان کر دیا۔ میرے سامنے شاہ صاحب کے ترجمہ کو ایڈٹ کرتے وقت پچھلے ڈیڑھ دو سال کے ۱۷ ایڈیشن موجود رہے مگر کسی ایڈیشن میں وہ ترجمہ موجود نہیں ہے جسے پادری فنڈر نے شاہ صاحب کی طرف منسوب کیا، غور کرو۔ شاہ صاحب کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

''اور اتار رکھا تجھ سے بوجھ تیرا جس نے کڑکائی پیٹھ تیری'' اس تفسیر پر حاشیہ شاہ صاحب نے یہ تحریر کیا ہے: ''وحی کا اترنا اول مشکل تھا، پھر آسان ہو گیا'' شاہ صاحب نے سورہ مزمل کی اس آیت کو سامنے رکھا ہے: إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۔''ہم آپ پر ایک بھاری بھرکم کلام نازل کریں گے۔'' اسی کلام ثقیل اور قول ثقیل کو سورہ الم نشرح میں ''وزر'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں ''وزر'' ''أوزار'' کے الفاظ لغوی مفہوم (بوجھ) میں بھی استعمال کئے گئے ہیں اور ان الفاظ کو مجازی طور پر گناہ (ذنب) کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے: وَلَـٰكِنَّا حُمِّلْنَا أَوْزَارًا مِّن زِينَةِ الْقَوْمِ (طٰہ ۸۷) حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ذٰلِكَ (محمد ۴)'' ہم پر قوم کے زیورات کے بوجھ لدے ہوئے تھے، ہم نے انہیں اتار پھینکا'' ۔یہ بنی اسرائیل کا قول

نقل کیا گیا ہے۔

''یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیاروں کا بوجھ رکھدے،'' اس وقت تک دشمنوں کا مقابلہ جاری رہنا چاہیے۔ یہ جہاد کے احکام میں سے ہے۔ مولانا آزاد نے غبار خاطر (ص:۱۱۵) میں یورپین صلیبی مبلغ (لابرتیاں) کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بڑا چالاک شخص تھا۔ لوگوں کا ذوق واستعجاب حاصل کرنے کے لئے من گھڑت باتیں چھوڑا کرتا تھا۔ فنڈر بھی اسی قسم کا صلیبی مبلغ تھا جسے برطانوی حکومت نے ہندوستان بھیجا تھا جس نے شاہ عبدالقادر کی طرف غلط ترجمہ منسوب کردیا اور حیرت ہے کہ مولانا آزاد جیسا دانش ور محقق اس کے پروپیگنڈہ کا شکار ہوگیا۔

پادری فنڈر کے استدلال کی بنیاد؟

پادری فنڈر نے اپنے دعوے کے ثبوت میں شاہ عبدالقادر صاحب کے غلط ترجمہ سے استدلال کیا، لیکن پادری فنڈر نے جو مفہوم اس آیت کا پیش کیا۔ اسکی بنیاد تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے۔ تفسیر کی کتابوں میں قرآن کریم کے لفظ (وزر) کو گناہ کے معنی میں لیا گیا ہے فنڈر کی نظر سے تفسیر کی وہ تاویلی بحث گزری ہے، تب اس نے شاہ صاحب کے نام پر فتنہ انگیزی کرنے کی جرأت کی۔

درمنثور کے ضعیف آثار!

درمنثور علامہ جلال الدین سیوطی (۸۴۹ھ) کی مشہور تفسیر ہے اور اس کے بارے میں محققین کی رائے یہ ہے کہ علامہ سیوطی نے اس تفسیر میں صحت وتحقیق کا التزام نہیں کیا یہ کتاب صحیح وسقیم اور رطب ویابس کا ایک طومار بن کر رہ گئی ہے (تاریخ مفسرین ۲۲۱)

علامہ سیوطی نے امام مجاہد تابعی اور شریح ابن عبید حضرمی کے حوالہ سے اس آیت کی جو تشریح نقل کی ہے اس میں لفظ ''وزر'' کو گناہ کے معنی میں لیا گیا ہے حالانکہ امام ابن کثیر نے ان اقوال کے ضعیف ہونے کی وجہ سے اپنی تفسیر میں انہیں نقل نہیں کیا۔

اردو مفسرین میں مولانا تھانویؒ عام طور پر درمنثور کا حوالہ دیتے ہیں اس آیت کی تفسیر میں بھی مولانا نے درمنثور کے منقول آثار کے حوالہ سے مذکورہ آیت کی تفسیر میں ''وزر'' سے ذنب مراد لیا ہے اور وہی تاویل کی ہے جو اکثر حضرات کرتے ہیں کہ: حسنات الأبرار سیآت المقربین یعنی نیکوں کی بھلائیاں اصحاب تقرب کی کوتاہیاں قرار پاتی ہیں

اس اعتبار سے یہ آیت سورہ فتح کی آیت لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ کے ہم معنی ہو جاتی ہے، لیکن اس ناچیز نے جہاں تک غور کیا تو یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ سورہ فتح کی آیت مذکورہ اور دوسری اسی قسم کی آیات (سورہ محمد ۱۹، سورہ غافر ۵۵) کی تاویل میں مذکورہ توجیہ جاری ہو جاتی ہے کیونکہ یہ لفظ (ذنب و ذنوب) قرآن کریم میں قصور، جرم اور گناہ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، لیکن لفظ ''وزر'' اور ''اوزار'' کے الفاظ قرآن کریم میں بار اور بوجھ کے معنی میں بھی استعمال ہوئے ہیں اور گناہ کے معنی میں بھی لائے گئے ہیں۔ اس لئے مذکورہ مشہور باریک تاویل سے بچنے کے لئے شاہ صاحب نے مذکورہ بوجھ کے معنی میں استعمال کیا ہے اور یہ شاہ صاحب کی قرآن فہمی اور ادب رسالت دونوں کا کمال ہے۔ اور یہی وہ توجیہہ ہے (موضح قرآن کی) جو آیت مذکورہ کو پادری فنڈر کے اعتراض سے واضح طور پر محفوظ رکھتی ہے۔





پادری فنڈر کے مناظروں کی تحقیق

ترجمان دارالعلوم ستمبر ۲۰۰۲ء میں حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی کا مضمون "حضرت شاہ عبدالقادر اور مولانا آزاد" استفادہ کی نیت سے پڑھا۔ اس مضمون میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا پادری فنڈر سے مناظرے کے ضمن میں ذکر آ گیا ہے۔ اور حضرت مولانا کیرانوی کے ساتھ مولانا شریف الحق دہلوی کا بھی ذکر ہے کہ فنڈر سے موصوف نے بھی مناظرہ کیا۔

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ حضرت مولانا کیرانویؒ نے پادری فنڈر سے مناظرہ ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں کیا تھا۔ مولانا کے دست راست ڈاکٹر وزیر خاں تھے مناظرہ صرف دو دنوں تک جاری رہا، تیسرے دن بغیر کسی اطلاع کے پادری فنڈر غائب ہو گیا اور پھر کبھی مولانا کیرانویؒ کے سامنے آنے کی جرأت نہ کر سکا حالانکہ فنڈر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان سے پہلے جرمنی گیا۔ وہاں چندے قیام کے بعد سوئزرلینڈ پھر انگلستان پہنچا یہاں کی لندن چرچ سوسائٹی نے اسکو قسطنطنیہ بھیج دیا۔ یہاں فنڈر نے سلطان عبدالعزیز خاں سے ملاقات کر کے حضرت مولانا کیرانوی سے اپنے مناظرہ کی فرضی داستان سنائی اور سلطان کو بتایا کہ اس مناظرہ میں عیسائیت کو فتح ہوئی اور اسلام مغلوب ہو گیا۔ سلطان کو اس مصنوعی روداد سے تشویش ہوئی اور انہوں نے تحقیق حال کیلئے شریف مکہ عبداللہ پاشا کو فرمان جاری کیا کہ ہندوستانی حجاج سے صحیح حالات معلوم کر کے باب الخلافۃ کو مطلع کریں۔

شریف مکہ اس مناظرہ کی مفصل روداد حضرت سید احمد دحلان سے سن چکے تھے اور ان میں یہ بھی معلوم تھا کہ صاحب مناظرہ حضرت مولانا کیرانوی ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ آ چکے ہیں اور یہیں قیام پذیر ہیں چنانچہ سلطان کو شریف مکہ نے بلا تاخیر اطلاع پہنچائی کہ حضرت مولانا مکہ مکرمہ میں موجود ہیں سلطان عبدالعزیز خاں نے شاہی مہمان کی حیثیت سے مولانا کو قسطنطنیہ طلب کر لیا۔ حضرت مولانا ۱۸۶۴ء میں قسطنطنیہ تشریف لے گئے پادری فنڈر یہاں پہلے سے موجود تھا اسکو جب حضرت مولانا کی تشریف آوری کا علم ہوا تو قسطنطنیہ سے فرار ہو گیا اور زندگی بھر سامنے آنے کی جرأت نہ کر سکا۔

مولانا شرف الحق دہلوی ۱۸۵۴ء میں بہت کم عمر تھے اس لئے کہ مولانا دہلوی نے حضرت مولانا کیرانوی کے اس مدرسہ میں شرف تلمذ حاصل کیا ہے جس کو مولانا کیرانوی نے کیرانہ میں ۱۲۷۰ھ یا اس سے کچھ پہلے قائم کیا تھا اور فنڈر سے مناظرہ ۱۲۷۰ھ میں ہوا تھا۔ مولانا شرف الحق کا سن وفات ۱۳۵۴ھ ہے اسی سے مولانا دہلوی کی عمر کا اندازہ کرلیا جائے مزید براں فنڈر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان سے چلا گیا تھا پھر اس سے مولانا شرف الحق صاحب نے مناظرہ کس سن میں کیا تھا تحقیق طلب ہے۔

البتہ مولانا شرف الحق صدیقی دہلوی کا مناظرہ دہلی مشنری کے انچارج مسٹر لیفرائے سے ثابت ہے اور عیسائیت کی رد میں مولانا کی کتابیں اور مناظرے قابل قدر کارنامے ہیں۔

اسی طرح فنڈر کے مناظرہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی ذکر آگیا ہے کہ اس میں وہ شریک تھے یا کسی سے روداد سنی تھی جو مولانا کے ذہن میں محفوظ رہی۔ مولانا آزاد اور فنڈر کے زمانے میں بہت بعد ہے مولانا کا تاریخی نام فیروز بخت ہے جس سے سن ولادت ۱۳۰۵ھ برآمد ہوتا ہے اس لئے پہلے یہ تحقیق ضروری ہے کہ فنڈر دوبارہ ہندوستان میں کب آیا؟ اور دوبارہ آنے کے بعد اس کے مناظرے کن علماء اسلام سے ہوئے۔

یوں تو اس زمانہ میں جب عیسائیت کو فروغ دینے کی برصغیر میں انتھک اور جارحانہ کوششیں ہورہی تھیں ٹھیک اسی زمانہ جارحیت میں علماء کرام نے ۔ بےخوف وخطر عیسائیت کے سیل رواں کا رخ موڑ کر ایسے مضبوط بند باندھ دیئے کہ عیسائیت دم بخود ہوگئی۔ چند نام جو نوک قلم پر آگئے ہیں وہ یہ ہیں: ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا سید آل حسن، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، مولانا شرف الحق دہلوی، مولانا سید امیر حسن، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا سید ابوالمنصور ناصر علی، مولانا سید عبدالباری وغیرہم رحمہم اللہ رحمۃ واسعۃ۔

(مولانا) عبدالحفیظ رحمانی، لوہرن، سنت کبیر نگر یوپی

مولانا آزادؒ پر

قادیانی تفسیر کی پیروی کا بے بنیاد الزام

۱۹۱۲ء میں الہلال نے ملکی عدالت میں شہادت دی تھی کہ مولانا آزاد کو قرآن اور اس کے علوم پر بے پناہ عبور حاصل ہے۔ چنانچہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ۱۹۱۲ء کی عالمی تاریخ ملکی اور بین الاقوامی سیاست اور مذہبی امور کے تینوں محاذوں پر قرآن سے استدلال انطباق اور استشہاد کر کے بڑے بڑے متبحر علماء کو بھی حیرت میں ڈال دیا تھا حتی کہ دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا محمود الحسن جیسے عالمی سیاست کے ماہر نے فرمایا تھا کہ ہم سبق بھول گئے تھے مگر الہلال نے ہمیں اپنا بھولا سبق یاد دلا دیا۔

اسی ابوالکلام کی عمر ۱۹۱۲ء میں صرف ۲۴ برس کی تھی مگر اس کا پختہ قلم، حیرتناک بصیرت، بے پناہ مطالعہ اور بے لاگ تنقید نے علامہ شبلی کو بھی ششدرہ کر دیا تھا۔ اسی ابوالکلام نے ۱۹۱۲ء میں جمعیۃ علماء ہند جیسی جماعت کے اجلاس میں خطبہ صدارت پڑھ کر علماء اسلام کو سیاست اور علوم قرآن کے سبق پڑھائے تھے، اسی ابوالکلام نے جب ۴۲ برس کی عمر میں ترجمان القرآن لکھ کر علم ادب اور تاریخ کے علماء فضلاء کو چونکا دیا تھا تو آج اس پر الزام عائد کیا جا رہا ہے کہ اس نے تاریخی سرقہ کیا ہے اور سرقہ بھی کس کا محمد علی مرزائی جیسے اک بے راہ گنام، کم علم اور بے بصیرت انسان کا۔

ہم شکر گزار ہیں کہ مولانا اخلاق حسین صاحب نے اس الزام کی عالمانہ تردید فرمائی۔ (ملاحظہ ہو ماہنامہ ریاض الجنۃ، دار العلوم، جون پور)

مولانا قاسمی لکھتے ہیں:

مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر قرآن "ترجمان القرآن" کو مسلمانوں کی نظروں سے گرانے کے لئے نے مختلف جہتوں سے حملے کئے گئے ان میں سے ایک حملہ یہ ہے کہ مولانا آزاد نے قادیانی تفسیر سے استفادہ کیا۔

مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت کتاب کا پہلا ایڈیشن چھپ کر جب اہل علم کے

سامنے پہونچا تو اہل علم نے اس کی پذیرائی کا حق ادا کیا۔ سرکاری حلقوں نے تو اس کتاب کے ساتھ بے رخی کا رویہ اختیار کیا اور کتاب کے مباحث میں جہاد، جزیہ اور گاندھی جی کی اہنسا کو صرف وقتی حکمت عملی (نہ مستقل اعتقاد) اور وحدت دین کے اس تصور کی نفی جو گاندھی جی کے حلقہ میں مشہور ہے اور مسلمانوں کے لئے تہذیبی اور دینی تشخص کی ضرورت اور اس کا اعلان۔ جیسے مباحث کو دیکھ کر یہ طبقہ متوحش ہو گیا۔

اور دلی اردو اکیڈمی کا سرکاری ادارہ اس کتاب کی اشاعت میں تعاون دینے کا وعدہ کرنے کے بعد اس سے منحرف ہو گیا۔ یہ دور تھا جناب شریف الحسن صاحب نقوی کی سکریٹری شپ کا تھا۔

بہر حال ملت اسلامیہ کے دوسرے ذمہ دار حضرات نے تعاون کیا اور یہ کتاب ہندوستان کے دینی اداروں تک پہنچائی گئی اور پہنچائی جارہی ہے اور کتاب کا پہلا ایڈیشن ختم ہورہا ہے۔ حسب ذیل مضمون مولانا ابوسلمان صاحب شاہ جہاں پوری مقیم حال کراچی کی توجہ دہانی پر ترتیب دیا گیا ہے جو دوسرے ایڈیشن میں شامل کیا جائے گا۔

قرآنی بصیرت کے متعلق مولانا شاہ جہاں پوری صاحب کی طرف سے ایک تصحیح نامہ موصول ہوا جس میں کتاب کی بعض فروگذاشتوں پر توجہ دلاتے ہوئے ایک اہم بات یہ لکھی کہ

> "اہم بات یہ تھی کہ اختر اور نیوی (قادیانی) کے دعوے کی تردید کی جاتی، انہوں نے انوار ابوالکلام میں شامل مقالہ میں دعوی کیا ہے کہ وہ غلام احمد قادیانی کی تفسیر سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ ترجمان القرآن کی تاریخی تحقیقات میں اس سے استفادہ کیا ہے" اب صورت یہ ہے کہ مولانا آزاد کے قرآنی افکار و خدمات پر ایک اہم تصنیف آ گئی اور مذکورہ دعوے کا رد نہیں کیا گیا، اب اگر کسی مقالہ میں ایسا کیا بھی گیا تو اخبار اور رسالے کون محفوظ رکھتا ہے؟
>
> بہر حال آپ کی تصنیف پر مبارکباد پیش کرتا ہوں، آپ نے مولانا کی یہ اتنی اور ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے جو صرف آپ ہی

انجام دے سکتے تھے"۔

مولانا موصوف پاکستان میں مولانا آزاد اور جماعت شیخ الہند کے اکابر پر جو بے مثال تحقیقی کام انجام دے رہے ہیں وہ نہ صرف قابل قدر ہے بلکہ اس ماحول میں حیرت انگیز بھی ہے۔ اور یہ مولانا مرحوم اور ان اکابر کی روحانی اور علمی کرامت ہے جس نے شاہ جہاں پوری صاحب کو اس کام کے لئے منتخب کرلیا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ حسن اتفاق کی بات ہے کہ موصوف کو جناب مولانا قاری شریف احمد صاحب کا مکتبہ رشیدیہ اودو بازار کراچی اور اس کے نگراں مولانا تنویر احمد صاحب شریفی نبیرہ حضرت قاری صاحب کا مخلصانہ تعاون حاصل ہو گیا۔

بہر حال مولانا کی توجہ دہانی پر کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے لئے یہ مضمون لکھا گیا ہے مولانا نے اختر اور نیوی کے حوالہ سے جو بات تحریر کی ہے وہی بات ملک زادہ منظور احمد صاحب نے دوہرائی ہے جو تسامحات کے ذیل میں مع جواب کے مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت کتاب میں نقل کی گئی ہے، ملک زادہ صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔

"بعض جگہ تو مولانا نے مولانا محمد علی کے اجتہادات سے بالکل اتفاق کیا ہے، فرق انداز بیان کا"۔

ملک صاحب کا اشارہ مولوی محمد علی مرزائی کی تفسیر بیان القرآن کی طرف ہے۔ خاکسار کو پہلے ایڈیشن کی ترتیب کے موقعہ پر مغالطہ ہوا تھا اور مولانا محمد علی کے لفظ سے ذہن مولانا جوہر کی طرف سے چلا گیا تھا، چنانچہ اسی خیال کے مطابق اس کا جواب پہلے ایڈیشن میں دیا گیا۔ مولانا ابوسلمان صاحب کی تصحیح کے بعد وہ غلط فہمی دور ہوئی۔ اور پیش نظر مضمون اسی کی تردید میں لکھا گیا۔

مولوی محمد علی قادیانی کی اردو تفسیر۔ بیان القرآن۔ ۱۹۲۲ء میں طبع ہو کر سامنے آئی اس لئے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ تفسیر مولانا آزاد کے سامنے رہی ہوگی۔ کیونکہ ترجمان القرآن کی ترتیب وطباعت کی داستان رانچی کی چار سالہ اسارت (۱۹۱۶ء تا ۱۹۱۹ء) سے شروع ہو کر ۱۹۳۰ء تک پہنچتی ہے۔

مولانا قید و بند کے ہنگامی دور سے گذرتے رہے، مسودات ضبط ہوتے رہے اور

کچھ ضائع ہوتے رہے اور مولانا پھر تکمیل میں مشغول ہو گئے، بالآخر ۲۰ر جولائی ۱۹۳۰ء کو آخری مسودات کی ترتیب سے فارغ ہو گئے۔ (ترجمان القرآن جلد اول ۶۰)

یہ قادیانی تفسیر اپنے دینی مباحث، لغوی اور تاریخی تحقیق، زبان و بیان۔ کسی لحاظ سے بھی اپنے اندر ایسی ندرت اور انفرادیت نہیں رکھتی کہ مولانا آزاد جیسا عظمت علمی میں مستغرق عالم۔ اپنے آپ کو اس سے استفادہ پر مجبور پاتا۔ جبکہ محمد علی صاحب اکثر مقامات پر موقعہ و بے موقعہ مرزا غلام احمد قادیانی کی مجددیت کا تذکرہ کر کے ایک سنجیدہ ذہن قاری کا موڈ خراب کر دیتے ہیں۔

غلط فہمی کی بنیاد!

اختر صاحب نے اگر کسی بد نیتی سے نہیں بلکہ کسی غلط فہمی کی بناء پر مولانا آزاد کی تفسیر کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ذوالقرنین کی تحقیق میں مولانا آزاد سے پہلے محمد علی صاحب نے یہ لکھا تھا کہ ذوالقرنین فارسی حکمراں دارائے اول ہے۔

مولانا آزاد نے بھی اسی رخ پر غور کیا۔ لیکن مولانا نے دارائے اول کے بجائے اسکے پوتے سائرس کو ذوالقرنین کا مصداق ثابت کیا اور جدید اثری تحقیقات اور قرآنی بیان کے اشارات سے استدلال کر کے (۳۰) صفحات پر مشتمل فیصلہ کن بحث تحریر کی۔

اور بعد کے محققین اہل قلم نے مولانا کی تحقیق کو خراج تحسین ادا کیا اور اسے اپنی تفسیریوں میں جگہ دی۔

اس ایک اشتراک کے علاوہ کوئی بات ایسی نہیں جس کی بناء پر یہ دعویٰ درست ہو کہ مولانا نے محمد علی صاحب کی تفسیر سے استفادہ کیا۔

ناچیز نے مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت کتاب (صفحہ ۲۰۸) میں اس کی تفصیلی بحث نقل کی ہے۔

اس کے علاوہ محمد علی صاحب کی تفسیر مولانا آزاد اور جمہور اہل سنت سے جس قدر مختلف ہے اس پر علیحدہ مضمون میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو آگے آرہا ہے۔

امام شاہ ولی اللہؒ کے اصلاحی مشن کو مسخ کرنے کی مذموم کوشش

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو عالم اسلام نے بارہویں صدی کا مصلح و مجدد تسلیم کیا کیونکہ شاہ صاحب نے اسلام کے چشمہ صافی کو بدعات و محدثات سے پاک صاف کرنے کی کامیاب کوشش فرمائی۔

تصوف و طریقت کے نام پر شرکِ جلی اور شرک خفی کی جو رسمیں اور جو بدعی افکار و تصورات مذہب توحید اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی طاقت اور قوت تاثیر کو کمزور کر رہے تھے ان کی پرزور تردید فرمائی۔

ہندوستان کے رضائی فرقہ نے اس مجدد خاندان سے اسی بنیاد پر اپنے آپ کو الگ رکھا اور شاہ صاحبؒ کے پوتے حضرت شہیدؒ کو خاص طور پر اپنے لعن و طعن اور تکفیر بازی کا نشانہ بنایا۔

اعلیٰ حضرت بریلوی کی کتابوں میں مولانا محمد اسماعیل شہید کے ساتھ جو گستاخانہ رویہ اختیار کیا گیا وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن ان کے جد امجد حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بارے میں بھی ایک جگہ اعلیٰ حضرت صاحب یہ فقرہ تحریر کر گئے کہ سارے فتنے کی جڑ یہی ایک شخص ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو امت مسلمہ نے جو عظمت و عقیدت دی اور علماء کے اصحاب فکر و تقویٰ طبقہ میں شاہ صاحب کو جو مقبولیت ملی اس فرقہ کی حاسدانہ سازشوں نے اسے نقصان نہیں پہنچایا۔ بلکہ یہ فرقہ خود ہی راسخین اہل علم کی نظروں میں علم و ثقاہت کے

پہلو سے گر گیا۔

اس فرقہ کے پڑھے لکھے لوگوں کو اپنی اس بے وزنی و بے قدری کا احساس تھا چنانچہ اس طبقہ نے اپنے آپ کو شاہ صاحب کے مصلحانہ افکار سے ہم آہنگ کرنے کے بجائے یہ کوشش شروع کی کہ شاہ صاحب کو اپنے رنگ میں رنگ لیا جائے۔ اس کوشش کا آغاز پاکستان کے رضائی مکتب فکر سے ہوا۔ اور اب اس کوشش کو باقاعدہ ایک تحریک اور ایک محاذ بنانے کی جدوجہد کی جارہی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام یہ ہوا کہ شاہ صاحب کی سوانحی کتاب انفاس العارفین کا اردو میں ترجمہ کیا گیا اور مترجم (مولانا محمد فاروق) نے مقدمہ میں یہ دعویٰ کیا کہ ولی اللہی فکر سے تعلق کا دم بھرنے والوں نے اب تک شاہ صاحب کی بعض اہم کتابوں کو دبا رکھا تھا اور انفاس العارفین کا اردو ترجمہ ان اہم کتابوں کو منظر عام پر لانے کی پہلی کوشش ہے پھر اس کے بعد شاہ صاحب کی ایک کتاب القول الجلی کا اردو ترجمہ شائع کیا گیا، اس کے مترجم مولوی تقی انور صاحب ہیں، اس کا مقدمہ مولانا ابوالحسن صاحب زید فاروقی نے لکھا اور مولانا مرحوم نے چھپانے اور دبانے کی داستان کو اور زیادہ دراز کیا اور حکیم محمود صاحب برکاتی کے حوالہ سے لکھا کہ۔

شاہ صاحب کی کتابوں کو نایاب کر کے دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ اپنے مصنفات کو شاہ صاحب کی طرف منسوب کیا گیا اور اپنے نظریات کی تبلیغ شاہ صاحب کے نام سے کی گئی (القول الجلی ص ۳)

ایک کثیر التصانیف عالم کے ساتھ دو ایک معمولی کتابوں میں ایسا ہونا ممکن ہے اور ہو سکتا ہے کہ شاہ صاحب کے معاملہ میں بھی ایسا ہوا ہو۔ لیکن اس داستاں کو اتنا بڑھانا کہ ہر اس عبارت کو الحاقی قرار دیدینا جو اپنے خیال و مسلک کے خلاف نظر آئے کہاں کی تحقیق ہے؟ اس کوشش سے تو شاہ صاحب کی تمام تصنیفات ہی شک و اشتباہ کی نذر ہو جائیں گی۔

جن کتابوں کے بارے میں مولانا زید صاحب کا خیال یہ ہے کہ وہابیہ اور اصحاب توحید نے انہیں چھپایا وہ کتابیں شاہ ولی اللہؒ کے کشف اور قلبی کیفیات اور روحانی واردات سے متعلق ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ شاہ صاحب نے ان کتابوں میں تصوف کے احوال بیان کرنے کے لئے اس وقت کی مروج صوفیانہ زبان اور صوفیانہ اصطلاحوں سے کام لیا ہے اور پھر ان کا جو مطلب بیان کیا ہے وہ عام صوفیہ کے خیالات سے مختلف ہے۔

جیسا کہ تکلیف شرعی کے سقوط کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے (فیوض الحرمین ص ۲۳) پھر حضرت شاہ صاحب نے کشفی حالات و علوم کے بارے میں جس حقیقت کا اظہار کیا ہے وہ یہ ہے۔

"کشف و کرامات اور علوم مکاشفات یہ سب آنے جانے والے ہیں، صبح کو آتے ہیں اور شام کو چلے جاتے ہیں۔ یہ علم نہ حصولی ہے اور نہ علم حضوری ہے" (القول صفحہ ۳۱۸)

حضرت شاہ صاحب نے کشف و کرامات کی حقیقت کو چند لفظوں میں بیان کر کے اپنی تمام کشفی تصنیفات کی اصل حیثیت کو واضح کر دیا کہ کشوف و کیفیات عارضی اور وقتی باتیں ہیں۔ علوم شریعت (کتاب و سنت) زندگی کا دائمی اور مستقل ہدایت نامہ ہے۔ اور انہیں علوم کی تبلیغ و اشاعت دینی فریضہ ہے۔ کشوف اور کیفیات کی تبلیغ و اشاعت نہ دین کا فریضہ ہے اور نہ دین حق کی عظمت ان عارضی کیفیات سے وابستہ ہے۔

امام الصوفیہ شیخ ابن عربی کے شارح امام عبدالوہاب شعرانی نے اپنی مشہور کتاب الیواقیت میں لکھا ہے۔ "ہمارے نزدیک کشف کو وحی پر مقدم کرنا بے حقیقت ہے کیوں کہ اہل کشف پر اکثر اشتباہ واقع ہوتا ہے (ص ۳۴)

ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "کسی ولی کے لئے جائز نہیں کہ وہ ایسی معصیت کے ارتکاب میں سبقت کرے جس کے متعلق اسے بذریعہ کشف یہ معلوم ہو گیا ہو کہ اس معصیت میں مبتلا ہونا اس کے لئے مقدر ہو چکا ہے مثلاً کسی ولی کو اس بات کا کشف ہوا کہ وہ رمضان شریف کی فلاں تاریخ کو بیمار پڑ جائے گا، اس نے اپنے اس کشف کی وجہ سے اس دن کا روزہ ہی نہ رکھا تو یہ اس کے لئے جائز نہیں ہے"

علماء حق نے شاہ صاحب کی انہی تصنیفات و تحقیقات کو عام کیا جو وحی الٰہی کے یقینی علوم کی تشریحات پر مشتمل ہیں۔

امام شعرانی فتوحات مکیہ کے ایک اقتباس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "کسی ولی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ دعویٰ کرے کہ مجھ پر امر الٰہی نازل ہوا یا مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ امر کیا، اور اگر کوئی ایسا کہے تو وہ تلبیس ابلیس میں مبتلا ہے (۱۹۵)

حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی مجددانہ عظمت کشف و کرامات کے ان واقعات و حالات سے وابستہ نہیں جو آپ نے انفاس العارفین، القول الجلی اور تصوف کی

دوسری کتابوں میں بیان کئے ہیں۔ بلکہ علوم وحی (کتاب وسنت) کی ان تشریحات وتحقیقات سے وابستہ ہے جن کی شاہ صاحب نے عقل وحکمت کی خداداد صلاحیت کے ذریعہ اشاعت کی۔ اور اپنی ایمانی فراست سے آنے والے سائنسی دور کے عقلی تقاضوں کے مطابق انہیں مرتب کیا،

شاہ ولی اللہؒ کے کشف وکرامت کی وہ باتیں جو آپ نے اپنے والد اور چچا اور اپنے متعلق بیان کی ہیں ان سب کی حیثیت روحانی تفریح کی ہے۔ آپ کی حقیقی کرامت یہ ہے جس کے متعلق شیخ اکبر اپنی فتوحات میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ان اعظم الکرامات ان یصل العبد الی حَدِّ لو غفلَ العالم کله من الله لقام ذکر ذالك الولی مقام ذکر الجمیع (الیواقیت ۲۵۲)

سب سے بڑی کرامت کسی ولی کی یہ ہے کہ بندہ ذکر الٰہی کے اس مقام پر پہنچ جائے کہ اگر سارا عالم خدا سے غافل ہو جائے تو تنہا اس بندہ کا ذکر اس عالم کے ذکر کے قائم مقام ہو جائے۔

یہاں لفظ ذکر اپنے وسیع شرعی مفہوم میں بولا گیا ہے۔ یعنی ہر وہ عمل صالح جو زبان، قلم اور جسمانی اعضاء سے صادر ہو وہ ذکر الٰہی میں شامل ہے (مکتوبات امام ربانی دفتر دوم ص ۶۱)

قانون شریعت کی مشہور تشریحی تصنیف۔ حجۃ اللہ البالغہ۔ ہے جس میں کسی صاحب کو بھی الحاق واضافہ کا شبہ نہیں ہوا، اس میں شاہ صاحب نے ایک باب قائم کیا۔

من ابواب الاحسان۔ یعنی احسان کے مباحث۔ یہاں شاہ صاحب نے صوفیاء کرام کی عام اصطلاح تصوف وطریقت کے الفاظ سے گریز کیا اور حدیث جبریل کا لفظ احسان استعمال کیا۔ یہ مباحث احسان (۳۶) صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں جس میں شاہ صاحب احسان کی حقیقت، اخلاص، حضور قلب، خدا اور اس کے رسول کی محبت، اخلاق حمیدہ اور ان کی حقیقت اور آخر میں روحانی احوال کی تفصیل بیان کرتے ہیں، لیکن کسی جگہ تصوف وطریقت کے الفاظ اور صوفیانہ احوال ومراسم کا حوالہ نہیں دیتے۔ نظری بحث میں کوئی مثال صوفیائے وقت کی پیش نہیں کرتے، بلکہ ایک جگہ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران شاہ صاحب کے قلب میں جو القاء ہوا اسے بیان کرتے ہیں۔

"۱۱۴۴ھ میں جب مجھے مدینہ منورہ میں قیام کی سعادت حاصل ہوئی تو میں نے بے شمار مرتبہ اس امر کا مشاہدہ کیا کہ آپ فرما رہے ہیں۔

لاتجعلوا زیارة قبری عیداً ۔ میرے مزار مبارک کی زیارت کو عید (کے تہوار) کی طرح نہ قرار نہ دینا۔ پھر لکھتے ہیں۔

هٰذا اشارة الی سدِّ مَدْخلِ التحریف کما فعل الیهود والنصارٰی بقبور الانبیاء علیهم السلام وجعلوها عیداً وموسماً بمنزلة الحج.

(حجۃ اللہ مصری جلد دوم ص ۷۷)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث پاک میں دین برحق کے اندر ہر قسم کی تحریف کا راستہ بند کرنے کی طرف اشارہ فرمایا، جیسے یہود و نصاریٰ نے اپنے انبیاء کے مزارات کے ساتھ معاملہ کیا اور ان مزارات کو عید کا میلہ بنادیا اور اس زیارت کو حج بیت اللہ کے اجتماع کی طرح قرار دے لیا۔

انفاس العارفین اور القول الجلی کے مکاشفات اور عرس و چہلم کی محفلیں منعقد کرنے کے واقعات کو کتاب الٰہی اور سنت نبوی کی طرح زور دے کر بیان کرنے والے حضرات کو حجۃ اللہ البالغہ کے اس روحانی کشف والہام کا علم کیوں نہیں ہے۔؟

کیا یہ بھی الحاق ہے؟

مولانا زید صاحب رقم طراز ہیں"

شاہ ولی اللہ کو گروہ اسماعیلیہ، وہابیہ، غیر مقلدین اور اہل حدیث نے تحریفات و تزویرات کر کے اپنے رنگ میں عوام کے سامنے پیش کیا ہے (مقدمہ القول الجلی ص ۱۸)

ایک عام قاری کس طرح شاہ صاحب کی اصلی تعلیمات اور حقیقی افکار اور وہابی جماعت کے الحاقات اور تحریفات کے درمیان فرق و امتیاز قائم کر سکتا ہے؟

اس کی کوئی کسوٹی ان حضرات کو بیان کرنی چاہئے جو شاہ ولی اللہ کے نظریات کا اپنے آپ کو حقیقی ترجمان قرار دے رہے ہوں۔

شاہ صاحب فرقہ ناجیہ (نجات یافتہ فرقہ) کی تشریح کرتے ہوئے نجات کی جو کسوٹی تحریر فرما رہے ہیں وہ یہ ہے،

الفرقة الناجیة هم الأخذون فی العقیدة والعمل جمیعاً بما ظهر من الکتاب

والسنة وجری علیه جمهور الصحابة والتابعین (حجۃ اللہ ۱۷۰)

شاہ ولی اللہ کے یہ نئے ترجمان اور بخیال خود حقیقی وکیل یہ بتا سکتے ہیں کہ کشف وکرامات اور عرس وچہلم اور مزارات سے علمی اور روحانی استفادہ کرنے کے جو واقعات ان حضرات کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتے ہیں کیا عہد رسالت اور عہد صحابہ وتابعین میں ان باتوں کا عام چلن اور عام چرچا تھا۔ ایک واقعہ حضرت ابوایوب انصاریؓ کا ان حضرات کو مل گیا کہ انہوں نے اپنا رخسار قبر مبارک پر رکھ کر اظہار غم کیا۔ لیکن کیا عہد صحابہ میں ایسا بھی ہوا کہ روزانہ صبح وشام عاشقانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مزار پاک پر آکر قدم بوسی کرتے ہوں۔ قبر مبارک پر مراقبہ کر کے حضورؐ سے علمی اور روحانی فیض حاصل کرتے ہوں؟

کیا صحابہ وتابعین کے عہد مبارک میں وفات پانے والے بزرگوں کے مزارات پر اس قسم کی تقریبات کے ہجوم لگے رہتے تھے۔ کیا اس عہد مبارک میں مزارات پر ہزاروں روپے صرف کر کے بلند گنبد اور قبے تعمیر کیے جاتے تھے۔؟

شاہ صاحب کے ان خود ساختہ وکیلوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ روحانی قوتوں کا انکار نہیں کرتا۔ لیکن روحانی قوتوں کی وہ کرشمہ سازیاں جوامت کے عہد زوال میں نمایاں ہوئیں انہیں واجب الاتباع شریعت وسنت میں کوئی اہم مقام دیا جائے۔؟

اسے کوئی صاحب علم وایمان تسلیم نہیں کر سکتا، کسی ولی اور قطب کے کشف کو وحی الٰہی اور علم نبوت کی طرح بے چوں وچرا تسلیم کرنا شریعت حقہ کے ساتھ مذاق ہے۔ اس کی ایک مثال شاہ صاحب ہی کی زندگی میں یہ ملتی ہے کہ ایک طرف حضرت شاہ صاحب کے بارے میں یہ لکھا گیا ہے کہ آپ نے اپنے استاد شیخ ابو طاہر صاحب کی فرمائش پر حضرت مجدد صاحب سرہندی کی کتاب "ردّ روافض" کا فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا اور شیعیت کی تردید میں حضرت امام ربانی نے جو قوی دلائل پیش کئے ان پر شاہ صاحب نے مجدد صاحب کی تعریف وتحسین کی۔ دوسری طرف جس شہر مبارک (مدینہ منورہ) میں بیٹھ کر یہ کتاب تحریر کی اسی شہر مقدس میں روضہ پاک پر شاہ صاحب کو یہ کشف حاصل ہوا۔؟

وعلم باطن ہیچ احدی بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم از ائمہ اثنا عشری رضی اللہ عنہم قوی ترنیست یعنی حضور علیہ السلام کے بعد علم باطن اثنا عشری اماموں سے زیادہ کسی کا قوی نہیں ہے (صفحہ ۲۶)

یہی وہ تصور ہے جس پر شیعیت کی ساری عمارت قائم ہے۔ اگر اس نظریہ کو تسلیم کرلیا جائے تو پھر رفض و شیعیت کی تردید میں اتنا زور لگانے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔

مولانا زید صاحب فیوض الحرمین صفحہ (۶۳) کے حوالہ سے ائمہ اہل بیت کے بارے میں شاہ صاحب کا ایک کشف تحریر فرماتے ہیں۔ ”میں ائمہ اہل بیت کی طرف متوجہ ہوا، میں نے ان کا ایک خاص طریقہ پایا اور وہی اصل ہے اولیاء کے طریقوں کی“

تعجب ہے کہ مولانا زید صاحب شاہ صاحب کی کتابوں میں تصرف کے لئے وہابیہ اور اسماعیلیہ کی طرف دیکھتے ہیں اور ان کی نظر شیعہ فرقہ کی طرف نہیں اٹھتی، جس فرقہ کے بارے میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس نے شاہ عبدالعزیز صاحب کے تحفہ اثناعشریہ میں الحاق کیا اور شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ موضح قرآن کے حاشیہ میں الحاق کیا جس کا نمونہ راقم کے پاس موجود ہے۔

یہ موضح قرآن کا وہ پہلا ایڈیشن ہے جو مطبع احمدی کلکتہ میں (۱۲۰۴۵ھ) کو چھپا، مولانا زید صاحب نے مولانا برکاتی کے حوالہ سے ایک مقام پر یہ تسلیم ضرور کیا ہے کہ قرۃ العینین فی ابطال شہادۃ الحسینؓ اور الجنۃ العالیہ فی مناقب المعاویہؓ دونوں کتابیں ارباب تشیع نے شاہ صاحب کی طرف منسوب کر دی ہیں۔ (صفحہ ۴)

مولانا زید صاحب اس کشف کا مطلب سمجھنے میں خود حیران و پریشان نظر آتے ہیں اور لکھتے ہیں ”حضرت شاہ ولی اللہ کو نیا طریقہ حضرات ائمہ اہل بیت سے ملا ہے، اس نئے سلسلہ (تصوف) کا تفصیلی بیان عاجز کی نظر سے نہیں گذرا۔“

مولانا صاحب کو اس کی تفصیلی تشریح شیعہ علماء کی کتابوں میں مل سکتی تھی، اور ایران کے علامہ خمینی نے اپنی کتاب کشف الاسرار میں شیعی تصوف کی تشریح اسی اصل کے تحت کی ہے۔ مولانا زید صاحب نے القول الجلی کے ایک کشف کے بارے میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ کشف جب ایک رسالہ میں شائع ہوا تو بعض علماء (جو زید صاحب کے ہم مسلک ہی ہوں گے) نے کہا کہ شاہ صاحب نے اس کشف میں ستاروں کی تاثیرات پر بحث کی ہے (بلکہ ستاروں کی تاثیرات کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو معمول قرار دیا ہے) اسے کتاب سے خارج کر دیا جائے۔ لیکن زید صاحب نے بعض علماء اور فضلاء کے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا۔

وہ علماء حق جن کے سینوں کو اللہ تعالیٰ نے توحید و نبوت کے خالص علوم سے روشن کیا ہے اگر انہوں نے شاہ صاحب کی طرف منسوب ایسی کتابوں کو اہمیت دینے سے گریز کیا جن کے ذریعہ رواجی تصوف کے تصورات اور مراسم کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے تو ان کا وہ جذبہ یقیناً توفیق الٰہی کے تحت صادر ہوا اور اس میں دین برحق کی عظیم مصلحت پوشیدہ رہی ہے آخر آج اس حلقہ تصوف میں بھی بعض ایسے علماء و فضلاء نکل آئے جنہوں نے بعض کشوف کو کتابوں سے خارج کرنے کا مشورہ دیا؟۔

یہ الگ بات ہے کہ فرقہ اسماعیلہ دہابیہ کی ضد میں جن حضرات کو اپنی نجات آخرت نظر آتی ہے وہ رکیک سے رکیک تاویلات کے سہارے ان کشوف کو عوام کے سامنے پیش کرنے پر اصرار کر رہے ہیں۔

اس طالب علم کو اس حقیقت کے اظہار میں کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوتی کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ان کشوف و کیفیات کو موضوع بحث بنا کر عوام میں انھیں اچھالنا اور طبقہ خواص میں محصور و محدود رکھے جانے والے روحانی احوال کو نااہل عوام تک پہونچانا نہ صرف حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ساتھ زیادتی و گستاخی ہے بلکہ شریعت حقہ کے ساتھ مذاق کرنا ہے۔ اور شریعت کو مذاق کا موضوع بنانے کے لئے اہل ضلالت کو دعوت دینا ہے۔

ان اہل تحقیق پر تعجب ہوتا ہے کہ یہ حضرات شاہ صاحب کی تصنیفات میں جب کوئی عبارت بدعات و محدثات کی تردید میں دیکھتے ہیں، تو اسے فرقہ وہابیہ کا الحاق و تزویر قرار دے کر اسے رد کر دیتے ہیں۔ اور جب کوئی عبارت ایسی ملتی ہے جو کتاب الٰہی اور احادیث صحیحہ کی واضح تعبیرات کے خلاف ہوتی ہے تو اسے اسرار حقیقت کا نام دے کر اس کی تاویلات کی جاتی ہیں اور انہیں صحیح قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

پہلی بات کی مثال یہ ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے حاجت بر آری کی نیت سے بزرگوں کے مزارات پر حاضری دینے کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا۔

کل من ذهب الی بلدة اجمير او الی قبر سالار مسعود او ماضاهاها لاجل حاجة يطلبهافانه آثم اثماً اكبر من القتل والزناء. اليس مثله الاّ مثل من كان يعبد المصنوعات او مثل من كان يدعوا الأت والعزّى (تفهيمات الهيه مطبوعه

حیدر آباد سندھ جلد دوم ص ۴۹)

یعنی ہر وہ شخص جو کسی حاجت کے لئے شہر اجمیر یا سالار مسعود غازی کے مزار بہرائچ جائے یا ان سے مشابہ کسی دوسری جگہ جائے تو اس نے گناہ کیا ایسا گناہ جو قتل بدکاری کے گناہ سے بڑا ہے کیا وہ اس شخص کی طرح نہیں ہے جو بنائی ہوئی چیزوں کی عبادت کرتا ہے یا جولات وعزیٰ کو پکارتا ہے۔

مولانا زید صاحب کے خیال میں یہ عبارت شاہ صاحب کی عبارت میں ملائی گئی ہے اور اس کی دلیل مولانا کے نزدیک یہ ہے۔

"اس (ملانے والے کو) معلوم نہیں کہ کسی فعل کے ثواب کو فرض قطعی کے ثواب سے یا حرام قطعی کے گناہ سے زیادہ اور بڑا اقرار دینا اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ہے، اس شخص کو یہ نہیں معلوم کہ قتل کرنے اور زناء کرنے کے گناہ کا منکر کافر ہے اور اجمیر شریف اور بہرائچ شریف کسی حاجت کی طلب کے لئے جانے والا اگر کہتا ہے کہ اس میں گناہ نہیں ہے تو وہ کافر نہیں ہے۔ (مقدمہ القول الجلی صفحہ ۶)

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے افکار پر پوری نظر رکھنے والا اس حقیقت کو جانتا ہے کہ یہ عبارت باطل نہیں بلکہ حق ہے اور اس عبارت کے مصنف خود شاہ صاحب ہی ہیں اور شاہ صاحب کو دلائل شرعی کی روشنی میں اچھی طرح معلوم ہے کہ غیر اللہ کو حاجت روا سمجھ کر ان کے پاس جانا، وہ فوت شدہ بزرگ ہوں یا اصنام شرک جلی ہے اور شرک جلی کے گناہ کا انکار کرنے والا اپنے آپ کو کفر کے اندھیرے میں پہنچا دیتا ہے۔ یہ متفق علیہ مسئلہ ہے۔

شاہ صاحب کے سامنے اس وقت مزارات پرستی کا پورا نقشہ واضح تھا، ان حضرات کو شاہ صاحب کی آخری وصیت کا مطالعہ کرنا چاہئے، جسے تاریخی تحقیق کے ساتھ جناب پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس وصیت میں شاہ صاحب نے صاف طور پر لکھا ہے۔ "صوفیہ کے ساتھ تعلق ونسبت بہت غنیمت ہے لیکن ان کی مروجہ رسموں کی کوئی قیمت نہیں میری بات بہت تلخ ہے لیکن مجھے جو حکم ملا ہے میں اسے بجالانے کے لئے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"تم مدار صاحب اور سالار صاحب کی قبروں کا حج کرتے ہو اور یہ تمہارے بدترین افعال ہیں" حضرت خواجہ اجمیری کے مزار کا طواف آج تک کرایا جاتا ہے۔ اور اس فعل کو طواف

ہی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس میں کسی تاویل کی گنجائش نظر نہیں آتی۔

شاہ صاحب نے جس دور میں قبر پرستی کی اس شدت سے مزمت کی ہے وہ دور عالم گیرؒ کی وفات کے بعد کا دور ہے جسے خلیق نظامی صاحب نے مسلمانان ہند کی مذہبی اور اخلاقی گرلوٹ کا بدترین دور قرار دیا ہے۔ اور مسلم یونیورسٹی کے دوسرے پروفیسر ڈاکٹر محمد عمر صاحب نے اس کی مثالیں دی ہیں اور بتایا ہے کہ اس دور میں مساجد ویران نظر آتی تھیں اور مزارات پر رونق تھی، یہاں تک کہ دہلی جامع مسجد کے حوض پر ہندو اور مسلمان دونوں کی دکانیں لگتی تھیں اور اس بازار کو مولانا محمد اسماعیل شہید نے بادشاہ وقت کو توجہ دلا کر ہٹوا لیا تھا۔

اور جامع مسجد کے آثار میں موئے مبارک کے ساتھ بزرگوں کی تصویریں بھی تھیں جن کی زیارت کرائی جاتی تھی، ان تصویروں کو حضرت مرزا جان جاناں نے بادشاہ کو توجہ دلا کر ہٹوا لیا تھا۔

دوسری بات کی مثال یہ ہے :

علم نجوم بحیثیت ایک علم کے ضرور موجود ہے لیکن حسب ذیل صحیح حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ستاروں کی تاثیر کو اہمیت دینے کے بارے میں جو وعید ارشاد فرمائی ہے وہ ملاحظہ ہو۔

عَنْ زَیْدِ بنِ خَالد الجهنی رَضِیَ اللهُ عنهُ قَالَ: صَلّٰی لَنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیهِ وَسَلَّمَ صَلاَةَ الصُّبحِ بالحُدَیْبِیَةِ، عَلَی إثْرِ سمَاءٍ (۱) کَانَت منَ اللَّیْلَةِ فَلَمَّا انصَرَفَ النَّبِیُّ صَلی الله عَلَیه وَسَلّمَ اَقبلَ عَلَی النَّاس فَقَال لَهُمْ" هَلْ تَدْرُوْن مَاذا قال ربکم ؟ قالوا اللّٰه و رسوله عالم، قَالَ أصبَحَ مِنَ عِبَادِی مؤمِن بی و کَافر، فأمَّا مَن قَالَ: مُطِرنَا بِفَضْلِ الله وَرَحْمَتِه، فَذالكَ مُؤمِن بِی، کَافر بالکَوکَبِ وَأمَّامَنْ قَالَ: مُطِرْنَا بِنَوءِ (۱) کذَاو کَذا ، فَذٰلِكَ کَافِر بِی ، مومِن بالکَوکَبِ" رواہ البخاری (و کذالك مالك والنسائی)

زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا: اللہ کے پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں مقام حدیبیہ میں فجر کی نماز پڑھائی رات میں بارش ہوئی تھی آپ نماز سے فارغ ہو کر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور سوال فرمایا تمہیں پتہ ہے ؟ تمہارے پروردگار نے کیا کہا؟ لوگوں نے جواب دیا اللہ اور اس کے پیغامبر (صلی اللہ علیہ وسلم) زیادہ جانتے ہیں کہا کہ

میرے بندوں نے میری تصدیق کر کے یا میرا انکار کر کے صبح کی جس نے کہا ہم پر بارش اللہ کے فضل ورحمت سے ہوئی ہے وہ میری تصدیق کرنے والا اور ستاروں کا انکار کرنے والا ہے لیکن جس نے کہا فلاں فلاں نچھتر سے بارش ہوئی ہے وہ میرا انکار کرنے والا اور ستاروں پر ایمان رکھنے والا ہے۔ (بخاری، موطا، نسائی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص مسلمان ہو کر واقعات عالم کو ستاروں کی تاثیر کی طرف منسوب کرتا ہے وہ اپنا ایمان گنوا دیتا ہے۔ حدیث مطلق ہے لیکن محدثین نے اس وعید کو خاص کیا ہے اور لکھا ہے کہ جو شخص ستاروں کو موثر حقیقی (نہ کہ صرف ایک سبب) سمجھ کر ایسا کہتا ہے یہ وعید اس کے لئے ہے۔

مولانا زید صاحب نے القول الجلی کے حوالہ سے شاہ صاحب کی یہ تحقیق نقل کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پاک میں دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنے کے جو واقعات پیش آئے ہیں ان میں جو کہیں زہرہ ستارہ کی قوت کارفرما تھی اور کہیں مشتری اور عطارد کی قوت کا اثر تھا اور کہیں ان ستاروں کی قوت آفتابی قوت سے مل کر دوگنی ہو گئی تھی۔ حجۃ الوداع کے موقعہ پر ہوا،

وہم چنیں روز حجۃ الوداع قوت مشتری با قوت شمسیہ و قوت قمر و قوت زہرہ و قوت زحل و قوت عطارد در ہم آمیخت من کل واحد منہا جزء واحد تا آنکہ یک چیز شد، در عالم تخمہ تسخیری و تالیفی، فرمانی و تشریعی منتشر گردانید (ص ۳۶۱۔ ۳۶۲)

حجۃ الوداع کے موقعہ پر ایسا ہی ہوا کہ مشتری ستارہ کی قوت دوسرے سیارات، آفتاب و ماہتاب زہرہ، زحل اور عطارد کی قوتیں آپس میں مل کر ایک قوت بن گئی اور اس قوت نے دنیا کو فتح کرنے اور مانوس کرنے، حکم جاری کرنے اور شریعت کو پھیلانے کا تخمہ دیا:

اس سے پہلے لکھا ہے کہ ان ستاروں کی قوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس نفیس سے جوش مار کر نکلی اور دشمنوں کو زیر کر لیا، (مقدمہ صفحہ ۷۴)

اول تو اس قسم کی باتوں کو شاہ صاحب جیسی محدث، فقیہ اور مفسر قرآن ہستی کے حوالہ سے عوامی رسالوں میں چھاپنا انتہائی بے احتیاطی بلکہ جسارت بے جا معلوم ہوتی ہے۔

مولانا زید صاحب نے اس تحقیق کی تشریح و تاویل میں جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی جگہ کتنا ہی صحیح ہو لیکن جس ذات اقدس کے کمالات کو قرآن کریم صفات الٰہی کا ظہور کہتا ہو اور رسول

پاک کو مظہر صفات کے طور پر پیش کرتا ہو اس ذات اقدس کو سیاروں اور ستاروں کا معمول بنا کر پیش کرنا کیا اس ذات اقدس کی تقدیس و عظمت کے مطابق ہے؟

قرآن کریم نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حمیدہ کو رحمت الٰہی کا مظہر کہا۔ فبما رحمة من الله لنت لهم (آل عمران ۱۵۹)

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ خدا کی رحمت کے سبب رحم دل اور نرم مزاج واقع ہوئے ہیں۔

قرآن کریم نے آپ کی فاتحانہ قوت کو اپنی قوت کا ظہور کہا۔ وما رميت اذ رميت ولكن الله رمى (انفال ۱۷)

اے نبی! آپ نے مٹی نہیں پھینکی جب آپ نے پھینکی لیکن دراصل اللہ تعالیٰ نے پھینکی۔

یہ قرآنی تعبیر ہے اور اسی تعبیر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت پوشیدہ ہے۔ صرف وہابیہ اسماعیلیہ کی ضد میں اس قسم کی بحثوں کو عوام میں لانا اور پھر یہ دعویٰ کرنا کہ رسالت کی عظمت کے علم بردار ہم ہیں۔ یہ وہابیہ اسماعیلیہ کورے گستاخ ہیں۔ کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے؟

کسی مصنف کی تصنیف میں الحاق واضافہ کا دعویٰ کرنا تو آسان ہے لیکن اسے ثابت کرنا آسان نہیں محض کسی بات کو اپنے مذاق و مسلک کے خلاف پا کر اسے الحاق کہنے لگے تو اس کو کون اہمیت دے سکتا ہے۔

صوفیائے چشت میں حضرت سید گیسو دراز کے ملفوظات جوامع الکلم کے بارے میں اہل علم نے یہ لکھا ہے کہ ملفوظات صوفیہ میں اس مجموعہ کو مستند حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ مجموعہ سید صاحب کے صاحبزادے نے اپنے والد کی حیات میں مرتب کیا اور سید صاحب نے اس کی تصحیح کی اور پھر اسے چھاپا گیا،

ان ملفوظات میں سید صاحب فرماتے ہیں

"نوعا آخر چند سالکے عارفے وچند مالکے ہا لکے بسیار دین اسلام رازیاں کار آمدند، چناں کہ فرید عطار، جلال رومی، محی الدین ابن عربی سخنے مزخرف وبذاتہ منحرف اصحاب الفضول"

یعنی چند عارف اور صوفی ایسے گذرے ہیں جنہوں نے اپنے ملمع شدہ کلام (سچ اور غلط کا

مرکب) اور اصحاب شریعت سے انحراف کرنے والی باتوں سے دین اسلام کو نقصان پہنچایا ہے اور ان صوفیوں میں فرید الدین عطار، مولانا جلال الدین رومی مصنف مثنوی، شیخ ابن عربی شامل ہیں صوفیائے چشت کے حلقہ میں ان مشائخ کی حیثیت اور ان کے کلام کا مرتبہ درجہ استناد رکھتا ہے اور تصوف کے خیالات کا ماخذ و مرجع ان حضرات کی مشہور کتابیں ہیں۔

سید محمد گیسودراز کوئی معمولی آدمی نہیں، حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلوی کے جانشیں ہیں اور سرزمین دکن میں سید محمد صاحب کے ذریعہ تصوف کی بڑی اشاعت ہوئی ہے۔

بعض اہل قلم کو اس عبارت کے بارے میں شبہ ہوا ہے کہ شاید یہ کلام الحاقی ہو، لیکن جب اس عظیم چشتی بزرگ کے عام افکار و خیالات اور اس کا ماحول سامنے آتا ہے اور اس پر غور کیا جاتا ہے تو یہ تعجب دور ہو جاتا ہے۔

یہ وہ دور ہے جب ہندوستان میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی اصلاحی تحریک ان کے ایک شاگرد مولانا عبدالعزیز صاحب دبیلی کے ذریعہ ہندوستان پہنچی اور اس وقت کے مسلم حکمراں محمد ابن تغلق پر اس کا اثر پڑا۔

محمد ابن تغلق نے تصوف کے مروجہ غالیانہ خیالات و اعمال سے بے زاری کا اظہار کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ صوفیہ کی ایک جماعت کو دہلی سے چلے جانے پر مجبور کر دیا،

ابن تیمیہ کی تحریک کو آج طنزیہ زبان کے مطابق وہابی تحریک کہہ لیجئے اس وہابی تحریک کے پھیلتے ہوئے اثرات کا مخدوم چراغ دہلوی نے جائزہ لیا اور اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ چشتی مشائخ کی محنت کو ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

حضرت محبوب الٰہی (شیخ نظام الدینؒ) کے مریدوں میں مخدوم صاحب کا مزاج شروع ہی سے بالکل علحدہ تھا، مخدوم صاحب نے مسجد قوت الاسلام مہر دلی میں سالہا سال حدیث شریف کا درس دیا تھا، مخدوم صاحب پر اتباع سنت کا غلبہ تھا،

مخدوم صاحب کے اسی مختلف رنگ سے عام صوفی لوگ بیزار معلوم ہوتے تھے، چنانچہ ایک نادان صوفی نے آپ پر چاقو سے حملہ کر کے آپ کو زخمی کر دیا تھا۔

صوفیا کے تذکرے اس حملہ کا سبب بیان نہیں کرتے لیکن اس کے سواء اس کا اور کیا سبب ہو سکتا تھا کہ آپ صوفیاء کے عام طریقوں سے الگ تھلگ رہ کر اتباع سنت پر زور دیتے

تھے، اور یہ بات عام صوفیوں کو ناپسند تھی،

مخدوم صاحب کے جانشین سید محمد گیسودراز تھے اور یہ اپنے شیخ کی راہ میں ان سے دو قدم آگے تھے۔ سید صاحب کھلم کھلا اعلان کرتے تھے۔

مشرب پیر حجت نمی شود، دلیل از کتاب وحدیث نے باید (اخبار الاخیار ص ۸۱)

پیر کا مشرب مرید کے لئے حجت شرعی نہیں ہے، ہر عمل کے صحیح ہونے کے لئے کتاب اللہ اور حدیث نبوی سے دلیل دینا ضروری ہے۔

سید محمد گیسودراز کا یہ اعلان وعقیدہ مروجہ تصوف کے بنیادی اصول کی نفی کرتا ہے تصوف کا بنیادی کلمہ یہ ہے۔

بے سجادہ رنگین کن، گرت پیر مغان گوید

سید محمد صاحب چشتی صوفیاء میں وہ پہلے اور آخری صوفی ہیں جنہوں نے اسلامی علوم کے ہر شعبہ پر کتابیں تصنیف کیں، سید صاحب شیخ ابن عربی کی نصوص الحکم کے افکار کی تردید میں بھی ایک کتاب تصنیف کرنا چاہتے تھے مگر اس دور کے مشہور قادری بزرگ سید اشرف جہاں گیر سمنانی نے انہیں روک دیا۔ (مشائخ چشت ۲۳۳)

صوفیائے چشت کے مشہور مصنف اور مبصر پروفیسر خلیق نظامی صاحب نے لکھا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کی حکمت عملی نے چشتی تصوف کو ابن تیمیہ کی اصلاحی تحریک کے سیلاب میں بہنے سے بچالیا۔

ان دونوں بزرگوں نے تصوف کو شریعت سے قریب کیا اور صوفیاء اور علماء کے درمیان جو دوری تھی اسے ختم کیا،

اور یہ وہ جدوجہد تھی جو حضرت مخدوم صاحب کو ان کے مرشد کامل حضرت محبوب الٰہی سے ورثہ میں ملی تھی، حضرت شیخ المشائخ کے ملفوظات (فوائد الفواد) کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے اس ناچیز نے فوائد الفواد کے علمی مقام کتاب میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

پروفیسر خلیق نظامی صاحب نے اس اہم موضوع پر اختصار کے ساتھ گفتگو کی ہے، اصل میں یہ موضوع امام ابن تیمیہ پر قلم اٹھانے والے اہل علم کی توجہ کا طالب تھا، لیکن ہندوستان کے تصوف پر ابن تیمیہ کی تحریک اصلاح کا کیا اثر پڑا، ؟۔ اس بحث سے مولانا ابو

الحسن علی صاحب ندوی کی اہم کتاب دعوت و عزیمت حصہ دوم بھی خالی نظر آتی ہے۔
آٹھویں صدی ہجری کے عظیم مجدد مصلح امام ابن تیمیہ اور پھر گیارھویں صدی ہجری کے عظیم مجدد امام ربانی سرہندی اور پھر بارہویں صدی ہجری کے مجدد شاہ ولی اللہؒ اور ولی اللہی مشن کی تکمیل کرنے والے ان کے پوتے مولانا محمد اسماعیل شہید نے اپنی ٹھوس دعوتی، تعلیمی اور اقدامی جدوجہد کے ذریعہ اسلام کے مقدس چشمہ کو یونانی، عجمی اور ہندی تصورات سے پاک صاف کر کے تصوف کے غلو اور افراط پسندی کو ختم کیا اور ایک اعتدال کی راہ ڈالی۔
جو حدیث کی اصطلاح میں احسان کی راہ ہے،
بڑے تعجب اور افسوس کا مقام ہے کہ جن مصلحین امت نے تصوف کو بچایا اور صوفیاء کرام کی لاج رکھی انہیں تصوف کا دشمن کہا جاتا ہے۔

مولانا زید صاحب کی چھینٹے بازی

مولانا زید صاحب مرحوم کا یہ مقدمہ جو ۱۵۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اس میں مولانا نے امام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کو تصوف کے احوال ور موز پر مشتمل بعض کتابوں کے حوالوں سے عرس اور سماع، مزارات سے فیض حاصل کرنے اور روحانی مستی و بے خودی سے وابستہ صوفی ثابت کرنے کی کوشش کا نہایت اہم خوشگوار، مسرت انگیز اور انقلابی فرض ادا کیا ہے۔ لیکن آخر میں مولانا فاروقی صاحب نے اس مقدمہ کے اصل موضوع سے ہٹ کر شاہ ولی اللہؒ کے ایک کشفی قول کے حوالہ سے حضرت سید احمد شہیدؒ کی شخصیت کو مطعون کرنے کی مبارک سعی بھی فرمائی ہے۔
مولانا صاحب کی اس کوشش کا علمی تجزیہ چونکہ ایک ناگوار بحث چھیڑ دیتا اس لئے اس عاجز نے اس سے صرف نظر کرنا ضروری ہے۔
صرف اس تصور کے حامی علماء و صوفیاء کی توجہ کے لئے اشارۃً اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ اصحاب روحانیت کے ہاں امیر، امام، مجدد، سلطان وقت اور فاتح عصر اور نہ جانے کیسے کیسے عجیب و غریب دعوے ملتے ہیں، اس لئے شاہ ولی اللہؒ کے اس قول "از درویشے اگر میل سلطنت و رغبت ست سر بزند وایں رغبت بہ الہام حق ظاہر نماید کہ برائے اعلائے کلمۃ اللہ بود داست قبول نہ باید کرد و سخن او را معتبر نہ باید داشت کہ مفتوں تسویل نفس و شیطان شدہ

است۔" کا مصداق اگر حضرت سید احمد بریلوی شہیدؒ ہو سکتے ہیں تو حضرت مجدد الف ثانی بھی ہو سکتے ہیں اور خود شاہ ولی اللہؒ بھی ہو سکتے ہیں۔

میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے ان دعووں کو نقل کر کے عام اور کم علم قارئین کے عقیدہ کو خطرہ میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

تحریک بالاکوٹ کے قائدین کرام، سید احمد بریلوی اور مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ دہلوی کی طرف سے اگر روحانی سرمستی و بے خودی کے جوش میں کوئی دعوئی زبان پر جاری ہوا تو ان حضرات نے اس دعوٰی کا عملی ثبوت بھی پیش کیا۔

اسلامی تاریخ کے آخری دور میں نہی عن المنکر کے لئے حدیث پاک کے پہلے درجہ فلیغیرہ بیدہ۔۔ کی تعمیل کا یہ نظارہ ایثار، قربانی، شہادت حق کے لئے بے قراری امیر کی اطاعت کا صادق جذبہ۔ ہتھیلی پر سر رکھ کر ظلم کی ننگی تلواروں کا سامنا، زخموں میں چور ہو کر بھی نعرۂ حق بلند کرنا، خون میں نہائی ہوئی لاشوں کو چوم چوم کر سپرد لحد کرنا۔ بدر واحد کے واقعات کی یاد تازہ کر گیا۔

مولانا زید صاحب نے اس سے زیادہ بے اصولی پن کا مظاہرہ کیا ہے، جب موصوف نے مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے حوالہ سے

جاسوس کی ڈائری کر کے حجاز کے محمد ابن عبد الوہاب کو انگریزوں کا ایجنٹ ثابت کیا ہے۔

آخر سید احمد بریلوی کے تذکرہ کے بعد اس بحث کے چھیڑنے کا تک کیا تھا۔؟

کیا زید صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تحریک شہیدین (بالاکوٹ) بھی انگریزوں کے اشارہ پر چلائی گئی اور اس تحریک کے مجاہدین بھی (وہابی ہونے کے رشتہ سے) انگریزوں کے ایجنٹ تھے۔؟

پاکستان کے ایک مشہور عالم (مولانا پروفیسر مسعود صاحب ابن مفتی مظہر اللہ صاحب مرحوم امام مسجد فتحپوری) نے ادھر ادھر کی بے سند باتوں اور غیر معقول حکایات کو جوڑ کر اسی موضوع پر ایک کتاب ترتیب دی شاید مولانا زید مرحوم اپنے مقدمہ کے آخر میں ایک بے جوڑ اور بے موقع بات لکھ کر اسی بے بنیاد تصور کی تائید کرنا چاہتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

جزیہ کی جدید تحقیق

علامہ شبلی نعمانی اور مولانا ابوالکلام آزاد

حسب ذیل مقالہ مولانا آزاد سمینار منعقدہ خدا بخش اورینٹل لائبریری (۲۸ جون ۲۰۰۳) کی ایک نشست میں پیش کیا گیا۔

ترجمان القرآن (مولانا ابوالکلام آزاد) اگرچہ مکمل تفسیر نہیں لیکن جس قدر بھی ہے یعنی سورہ المومنون تک وہ مکمل طور پر دعوتی اسلوب بیان کا بہترین نمونہ ہے۔

قرآن کریم نے سورہ نحل (۱۲۵) میں دعوت حق کے تین اصول بیان کئے ہیں۔ (۱) حکمت بالغہ (۲) موعظہ حسنہ (۳) مباحثہ احسن۔ یعنی دعوت حق اور تبلیغ اسلام کے لئے ان تین اصولوں کی پابندی ضروری ہے۔

اسلام کی دعوت دی جائے ، دلائل اور براھین سے ، پند و نصیحت سے ، سنجیدہ مباحثہ سے اور ان تینوں طریقوں میں دعوت کی زبان کا اسلوب نہایت بلیغ و بدیع ہو اور اسکی واضح مثال خود قرآن کریم ہے۔

قرآن کریم عربی زبان کے بہترین ، مؤثر ، دل نشین اور بلیغ ادبی اسلوب کے اندر عقائد صحیحہ عبادات ، اخلاق ، معاملات کی دعوت دیتے ہوئے نہایت معقول دلائل دیتا ہے۔ دل پر اثر کرنے والے وعظ و نصیحت سے کام لیتا ہے اور ضرورت پڑنے پر نہایت سنجیدہ مباحثہ کرتا ہے۔

مولانا آزاد نے اپنی تفسیر کو اردو کے بہترین بلیغ پیرایہ میں مرتب کیا ہے اور قرآن کے تمام مضامین میں قرآن حکیم کے تینوں اصولوں کی رعایت کی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے سیاسی مسائل اور غیر مسلموں سے متعلق احکام کے اندر بھی دعوت کا حکیمانہ اور مشفقانہ انداز بیان اختیار کیا ہے جبکہ بعض جدید اونچی تفسیروں میں سیاسی مسائل کی تشریح حکمت و موعظہ کے انداز سے

خالی نظر آتی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مفسر قرآن صاحب کتاب دعوت و حکمت کے داعی اور شارح نہیں بلکہ ایک سیاسی حکمراں اور خلیفۃ المسلمین ہیں جو غیر مسلم رعایا کو حکومتی ٹیکس ادا کرنے کا حکم دے رہا ہے اور اس شارح قرآن کے انداز گفتگو میں ایک داعی کی دل سوزی اور دل نوازی نہیں بلکہ ایک حاکم کی رعونت اور ایک حکمراں کا تحکم بول رہا ہے ۔

دعوت اور تجارت میں فرق ؟

مولانا آزاد نے ایک مضمون " مقام دعوت " میں دعوت اور تجارت کے درمیان فرق کرتے ہوئے لکھا ہے :

" اسی راہ (عشق و محبت) پر چل کر دعوت اور تجارت کے باہم تضاد و تبائن مسلک کا بھی پتہ لگاؤ اور اندازہ کرو کہ دونوں راہیں ایک دوسرے سے کس قدر ابعد ہیں ، اگرچہ نفس عمل ، صرف قوی انفاق حیات کے اعتبار سے دونوں میں پوری پوری یکسانیت بھی پائی جاتی ہے ؟ تاجر اور داعی کو نہ دیکھو ، بلکہ یہ دیکھو کہ ایک تاجر کی حیات عشق کا معشوق کون ہونا چاہئے ، اور ایک داعی کی حیات محبت کی محبوبیت کس میں ہوتی ہے ؟ تاجر کو تم دیکھو گے کہ وہ تاجر نہیں ہے اگر نفع خاص اور حصول زر اس کا معشوق و مطلوب نہ ہو برخلاف اس کے داعی وہی ہو گا جس کا محبوب نفع عام اور اس لئے حصول زر نہیں بلکہ طلب بے زری ہو ۔ تاجر اگر پانے کو اپنا معشوق نہ بنائے تو اپنی ہستی کھودے ، اور داعی اگر کھونے کے عشق سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل ہو تو اس پر لذت دعوت حرام ہے ۔

کسے کو تشنۂ وصل است باکوثر نمی سازد
بہ آب خضر اگر عاشق رسد لب ترنمی سازد
الفت خطرناک است پہنائش نظر درکن !
دراں وادی کہ عشق اوست تن باسر نمی سازد!

(مقام دعوت ، ص ۲۱ - ۱۹)

سیاسی مسائل کی تشریح میں قرآنی دعوت کے اصول کی رعایت کی ایک مثال اہل ذمہ کے

جزیہ کی بحث ہے جو حسب ذیل ہے۔

جزیہ کیا ہے؟

جزیہ کی مشہور آیت ہے: حتی یعطوا الجزیۃ عن یدی وھم صاغرون (توبہ ۲۹)

اس کا ترجمہ صاحب تفہیم القرآن یہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔ (خلاصہ تفہیم ۲۱۲)

لیکن مولانا آزاد ترجمہ کرتے ہیں:

یہاں تک کہ وہ اپنی خوشی سے جزیہ دینا قبول کرلیں اور حالت ایسی ہو جائے کہ ان کی سرکشی ٹوٹ چکی ہو۔

اس پر تشریحی نوٹ لکھتے ہیں:

اس کے بعد فرمایا۔ حتی یعطوا الجزیۃ الخ یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ اٹھا کر جزیہ دیدیں۔ نہ صرف عربی زبان میں بلکہ تقریباً ہر زبان میں یہ محاورہ موجود ہے کہ کسی چیز کو اپنے ہاتھ سے دے دینا رضامندی سے دے دینا ہوتا ہے۔ مثلاً اردو میں کہیں گے تم اپنے ہاتھ سے اٹھا کر جو دے دو گے ہم لے لیں گے۔ یعنی اپنی خوشی سے جو کچھ دے دو گے ہمارے لئے بہت کچھ ہے ٹھیک ٹھیک یہی مطلب اس قرآنی ترکیب کا بھی ہوتا ہے۔

مولانا نے جزیہ کے ساتھ اہل ذمہ کی تحقیر و تذلیل کے تصور کی تردید کی۔ عن یدی وھم صاغرون کے مفہوم میں مولانا نے تمام اہل تراجم سے اختلاف کیا ہے یہاں تک کہ اپنے مقتدا امام ولی اللہ سے بھی اختلاف کیا۔ شاہ صاحب "خوار شدہ" ترجمہ کررہے ہیں مولانا آزاد تقلید شخصی کے قائل نہیں تھے اس لئے فقہاء احناف کے ہاں انہیں قرآن کریم کے اس لفظ کے مناسب معنی نہیں ملے تو انہوں نے امام شافعی کی طرف رجوع کیا اور امام شافعی کی کتاب الام میں مولانا کو مناسب تشریح مل گئی جو اسلام کے اصول عدل کے مطابق ہے۔ چنانچہ مولانا نے امام صاحب کا یہ قول نقل کیا۔ یعنی اس جگہ صغار کا اصطلاحی مفہوم مراد ہے۔

الصغار ان یجری علیھم کلمۃ الاسلام۔ صغار یہ ہے کہ ان پر اسلامی حکومت کے

قوانین جاری ہوجائیں۔

پھر مولانا جزیہ کو آزادی رائے اور مذہبی جذبات کے احترام کی مثال قرار دے کر تحریر کرتے ہیں۔

فی الحقیقت انسان کے عقائد و جذبات کی آزادی کا یہ ایسا اعتراف تھا جس کا اس عہد میں کوئی دوسری قوم تصور نہیں کر سکتی تھی۔

مولانا کا اشارہ غیر مسلم شہریوں کو جنگ میں شرکت کرنے سے مستثنیٰ کرنے کی طرف ہے۔

غور کرو! مولانا آزاد نے تحقیر کے مفہوم کی جگہ احترام کا مفہوم کس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے

مولانا آزاد کی نظر اسلام کے اس قانون عدل پر تھی جسے امام ابو یوسف نے اپنی کتاب "کتاب الخراج" (صفحہ ۲۰۹) میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ حضرت علیؓ اعلان کرتے تھے۔ دمائهم کدمائنا واموالهم کاموالنا۔ یعنی امن و قانون کے ساتھ مسلم حکومت میں رہنے والے غیر مسلموں کا خون ہمارے خون کی طرح ہے اور ان کا مال ہمارے مال کی طرح ہے۔ کنز العمال کی روایت میں اعراضهم کاعراضنا (ان کی آبرو ہماری آبرو کی طرح ہے) کا فقرہ زیادہ ہے۔

مولانا سعود احمد صاحب کا سوال!

اس ناچیز کے مضمون مذکورہ پر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے سنی شعبہ دینیات کے ناظم مولانا سعود احمد صاحب نے یہ فرمایا کہ جزیہ اہل ذمہ کے بارے میں جدید تحقیق پر علامہ شبلی نعمانی کا ایک کتابچہ مولانا آزاد کی تفسیر سے پہلے شائع ہو چکا ہے اور اس کتابچہ میں وہ حدیث اخوہ بھی ہے جسے مولانا آزاد کا انکشاف قرار دیا جارہا ہے۔ مولانا موصوف کی اس مداخلت کا احقر کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اس لئے میری طرف سے خاموشی اختیار کی گئی۔ حالانکہ بعض شرکاء اجلاس کے خیال میں مولانا سعود احمد صاحب کی اس مداخلت سے مولانا آزاد کی تفسیری تحقیق کا وزن کم ہورہا تھا اور میرے پاس اس کا مدلل جواب نہیں تھا کیوں کہ مولانا شبلی کا وہ کتابچہ میری نظر سے نہیں گذرا تھا۔ البتہ مجھے ایک واقعہ یاد آگیا اور وہ یہ ہے جو میں نے جلسہ میں سنایا کہ جمعیۃ علماء کے اکابر مولانا

آزاد سے ملاقات کرنے جاتے تھے اور جب کبھی مولانا کو اچھے موڈ میں دیکھتے تو وہ حضرت مولانا سے علمی سوالات بھی کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مجلس میں مفتی عتیق الرحمن نے مولانا سے جزیہ کے بارے میں مولانا شبلی کے مضمون کا تذکرہ کر کے کہا، کیا آپ نے مولانا کا وہ مضمون ملاحظہ فرمایا ہے؟ مولانا نے جواب دیا، ہاں میرے بھائی! میں سب سے استفادہ کرتا ہوں۔ مگر میں نے اپنی تفسیر میں کتاب الام کا حوالہ اصل کتاب سے نقل کیا ہے اور کتاب الام کے حاشیہ پر دیکھا جاسکتا ہیکہ میرا دو لفظی نوٹ تحریر ہے۔ میں نے امام شافعی کی عبارت کلمۃ الاسلام پر یہ تحریر کیا ہے۔ یعنی قوانین اسلامی۔

کلمۃ الاسلام سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ اس سے کلمۃ توحید لاالہ الا اللہ مراد ہے اگر یہ مراد لیا جائے تو پھر اہل ذمہ کی بحث ہی ختم ہوجاتی ہے۔ میں نے واضح کیا ہے کہ کلمۃ الاسلام سے امام شافعی کی مراد قوانین اسلامی (حکومت اسلامی کے قوانین) مراد ہیں۔

یہ واقعہ مفتی عتیق الرحمن صاحب نے دفتر جمعیۃ علماء ہند میں خود سنایا۔

مولانا شبلی نعمانی کے اس کتابچہ کے مطالعہ کی پھر بھی ضرورت باقی رہی تھی تاکہ ترجمان القرآن اور مولانا نعمانی کی تحقیق کے درمیان فرق ہوسکے۔

پھر میں نے اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے مولانا برہان الدین سنبھلی شیخ الحدیث ندوۃ العلماء سے درخواست کی کہ وہ مولانا شبلی کا وہ رسالہ دیکھ کر بتائیں کہ اس کے مضمون کی کیا نوعیت ہے۔ مولانا سنبھلی اس سمینار میں موجود تھے۔

مولانا موصوف نے ازراہ کرم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ سے مولانا شبلی کا وہ قدیم کتابچہ منگایا اور اس کا مطالعہ کر کے مجھے لکھا:

مکرمی سلام مسنون

راقم نے آپ کے حکم کی تعمیل میں مولانا شبلی کا رسالہ "الجزیہ" منگا کر دیکھا وہ بہت قدیم نسخہ مدینہ پریس بجنور کا مطبوعہ ہے (چھوٹے سائز پر کل ۸ صفحات کے اندر سما گیا ہے) جگہ جگہ سے بوسیدہ ہے مگر ماتیقرا (پڑھنے کے قابل) ہے۔

اس رسالہ میں کہیں بھی نہ تو کتاب الام کا تذکرہ ہے اور نہ اس حدیث (حدیث اخوہ) کا جسکے بارے میں آپ نے دریافت کیا ہے۔ (اللهم انا شهيد ان العباد كلهم اخوة ، ابوداؤد جلد اول ص ۲۱۱ الخ

امید ہے کہ آنجناب بخیر ہونگے۔ والسلام

احقر برہان الدین

16-8-3

نہیں کہا جاسکتا کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک ذمہ دار عالم نے ایسی بے بنیاد مداخلت کیوں ضروری سمجھی؟

چونکہ یہ ساری بحث لائبریری میں ریکارڈ کی گئی ہے اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ مذکورہ مقالہ کے ساتھ مولانا سنبھلی مدظلہ کی تحقیق سے اہل علم کو مطلع کردیا جائے۔ راقم نے سمینار کی ایک نشست کی صدارتی تقریر میں کہا کہ مولانا آزاد بڑے مظلوم ہیں ، آزادی سے پہلے سیاسی تنگ نظری نے مولانا کو اپنے سیاسی تعصب کا نشانہ بنایا اور آج کے سیکولر ذہن اور سیکولر اداروں میں بھی مولانا انصاف سے محروم ہیں۔

سرکاری سیکولر ادارے مولانا کی سیاسی ، ادبی اور صحافتی زندگی پر اچھی سے اچھی کتابیں شائع کرتے ہیں مگر مولانا کی دینی اور تفسیر قرآن سے متعلق خدمات پر کوئی توجہ نہیں دی جارہی ہے کیونکہ موجودہ سرکار کے نزدیک سیکولرازم اور مذہب کے درمیان جھگڑا چل رہا ہے۔

میں ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے فیضان ابوالکلام کے نام سے مولانا آزاد کی دینی اور مذہبی تحریروں کے اہم اقتباسات کے بارے میں ایک عمدہ کتاب شائع کی جسکا اس راقم السطور نے پہلے کھلے اجلاس میں اجراء کیا۔ ○

ارذل عمر کا اکرام یا اہانت؟
شاہان دہلی کے تراجم میں اختلاف!

مشہور اردو شاعر مصحفی امروہوی نے بڑھاپے کو حقیر قرار دیتے ہوئے کہا ہے:

دن جوانی کے گئے، موسم پیری آیا/ آبرو خاک ہے اب وقت حقیری آیا

استاد داغ دہلوی نے پیری کو عذاب میں داخل کر دیا:

ہوا زمانہ پیری عذاب میں داخل/ جوان تھے تو جوانی تھی خواب میں داخل

ریاض خیر آبادی بڑھاپے کو موت سے بدتر قرار دیتے ہیں:

موت سے بدتر زمانہ آئے گا/ جان سے اچھی جوانی جائے گی۔

آیئے اس پر غور کریں کہ بڑھاپے کا خالق، پروردگار عالم اپنے بندوں کی اس عمر کے بارے میں کیا فرماتا ہے اور بڑھاپے کی عمر پر قرآن وحدیث کا تبصرہ کیا ہے؟

یہ مسئلہ اس پہلو سے بہت نازک ہے کہ جو کتاب حق انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیتی ہے۔ ''قابل اکرام'' (اسراء ۷۰) ''خدائی صنعت وہنرمندی کا بہترین نمونہ'' (سورہ تین ۴) ''نظام فطرت میں خدا کا نائب ونمائندہ'' (بقرہ ۳۰) کہتی ہے وہ کتاب حق اشرف المخلوقات کے بڑھاپے اور عمر کی ڈھلتی اور بگڑتی حالت کو کس نظر سے دیکھتی ہے؟

قرآن کریم میں دو جگہ ارذل عمر کا ذکر کیا گیا ہے، سورہ نحل (۷۰) میں انسانی زندگی کے مختلف مراحل پر روشنی ڈالتے ہوئے اختصار کے ساتھ اور سورہ حج (۵) میں تفصیل کے ساتھ بڑھاپے کی آخری منزل (ناکارہ عمر) کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ نحل میں فرمایا گیا: وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَىْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ. ''اللہ تعالیٰ نے اے انسانو! تمہیں پیدا کیا پھر وہ تمہاری عمر پوری کر دیتا ہے اور (اس دوران میں) تم میں سے کوئی انسان بڑھاپے کی ناکارہ عمر کو پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ وہ علم رکھنے کے بعد پھر بے علم اور انجان ہو جائے بے شک اللہ تعالیٰ جاننے

والا اور قدرت والا ہے۔ اردو میں یہ کہاوت مشہور ہے کہ بچہ اور بوڑھا برابر ہے، بوڑھا آدمی بچوں کی طرح ضد کرتا ہے، بچوں کی طرح جلدی روٹھ جاتا ہے اور جلدی خوش ہو جاتا ہے اور یہ عقل کی کمزوری کا نتیجہ ہے۔

قرآن کریم نے دونوں آیات میں ارذل عمر کی خود ہی تشریح کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ عمر انسانی کا وہ حصہ (بڑھاپا) جس میں باطنی قوت، عقل و ذہن اور حافظہ کمزور ہو جاتا ہے وہ ارذل عمر ہے حالانکہ بڑھاپے میں باطنی قوت کے ساتھ ظاہری اور جسمانی قوتیں بھی کمزور ہو جاتی ہیں، لیکن قرآن کریم نے جسمانی کمزوری کو اہمیت نہیں دی، کیونکہ جسمانی قوتیں حیوانات کے اندر بھی ہوتی ہیں، انسان اور حیوانات جسمانی قوتوں میں قدرے مشترک ہیں، جو قوتیں انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہیں وہ باطنی قوتیں، عقل، ذہن اور فکر ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم نے بڑھاپے کا اصل نقصان حافظہ کی کمزوری اور بھول اور نسیان کو قرار دیا ہے۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اصحاب تراجم نے ارذل اور رذیل عمر کے الفاظ کا ترجمہ کیا کیا ہے۔؟ عربی لغت میں رذالۃ کے مفہوم میں حقارت و ذلت اور خراب، خستہ و ناکارہ کے معانی شامل ہیں۔ سماجی عرف کے لحاظ سے حقیر و ذلیل افراد کے لیے بھی رذیل اور ارذل کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں اور جو چیز خراب ہو جائے، بگڑ جائے اس کے لیے بھی رذیل کی صفت بولی جاتی ہے۔ رذالہ، کسی چیز کے خراب اور بے کار حصہ کو کہا جاتا ہے اور جس شخص کے ہاتھ بے کار ہو گئے ہوں اسے مرذول (مفعول) کہا جاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے ان آیات میں جو تراجم کیے انہیں دیکھیے۔ سورہ نحل کی آیت میں سید شریف جرجانی کی پیروی کرتے ہیں اور "خوارتر عمر" (جرجانی) کی جگہ "خوارترین عمر" تحریر کرتے ہیں۔ سورہ حج کی آیت میں "فروترین زندگانی" (جرجانی) کی جگہ "بدترین عمر" تحریر کرتے ہیں۔ خوارترین اور بدترین کے الفاظ رذالت کے ایک مفہوم (حقارت واہانت) کے مطابق ہیں۔

فارسی تراجم میں یہی مفہوم نظر آتا ہے لیکن قرآن کریم نے اس جگہ رذیل عمر کے معنی خود بیان کر کے اور اس نقطہ کو عقل و دانش کی کمزوری کے معنی میں لیکر اس لفظ کے مرادی معنی واضح کر دیے ہیں جو لغوی مفہوم میں بھی داخل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے رذالت کے لفظ کو لغوی مفہوم کے ایک جزء کے ساتھ خاص کر دیا اور حقارت و ذلت کے جزء کی نفی کر دی تا کہ اشرف المخلوقات کی اہانت نہ ہو۔

صاحبزادگان کا اختلاف

ارذل عمر کے الفاظ کا ترجمہ شاہ ولی اللہ کے دونوں صاحبزادوں نے اپنے والد سے ہٹ کر کیا

اوران کی نظراس پر رہی کہ قرآن نے ارذل عمر کی تشریح خود کردی ہے اوراس لفظ کو لغوی مفہوم کے ایک جزء کے ساتھ خاص کردیا ہے۔عربی مفسرین نے بھی قرآن کریم کے اسلوب بیان کے مطابق ان آیات کی تشریح کی ہے عربی مفسرین میں ابن کثیراور صاحب جلالین نے اضعفه واخسه من الھرم والخزف کے الفاظ لکھے ہیں یعنی کمزور،اور ضعیف عمر بڑھاپے سے اور عقل وخرد کی خرابی، بھول اورنسیان سے عربی مفسرین نے ارذل کے تشریح میں حقیراور ذلیل کے الفاظ تحریر نہیں کئے اور انسان کے نوعی عز و شرف کا لحاظ کیا۔

قرآن کا مطلب یہی ہے کہ وہ عمر جو کام کے قابل نہیں رہتی ، فارسی میں وہ ناکارہ ہے اور ہندی میں اسے نکما کہا جاتا ہے،قرآن بڑھاپے کی توہین نہیں کرنا چاہتا،مولانا تھانوی نے یہی دو لفظ استعمال کئے ہیں۔مولانا آزاد نے ان آیات میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی پیروی کی اور سورہ نحل میں بدترین حالت کے الفاظ لکھےاور سورہ حج میں نکمی عمر کے الفاظ لکھے،مولانا نے اپنی تحقیق سے کام نہیں لیا، مولانا مودودی صاحب نے دونوں جگہ بدترین عمر کے الفاظ تحریر کئے یہ تمام حضرات اردو اور عربی کے بہترین فاضل ہیں لیکن ان تراجم میں ان کی نظر قرآنی تشریح کی طرف جانے کے بجائے شاہ ولی اللہ کے ترجمہ کی طرف گئی اور اشرف المخلوقات کو اس شکایت وشکوہ کا موقعہ دے دیا کہ خالق فطرت نے ہماری بے قدری کی، جو عمر قابل رحم تھی اسے بدترین عمر قرار دیدیا گیا۔

حضرت نوح علیہ السلام

اب رہے وہ الفاظ جو قرآن نے مخالفین حضرت نوح کے حوالہ سے بطور حکایت نقل کئے ان کا مفہوم وہی ہوگا جو ان الفاظ کے کہنے والوں کے نزدیک تھا اور عمر ناکارہ کے بیان میں جو الفاظ ہیں وہ خود خداتعالٰی کا کلام ہے دونوں کے درمیان فرق ہے۔سورہ ہود میں کہا گیا۔ھم اراذ لنا بادی الرأی ، (۲۷) مخالفین نے کہا:"اے نوح! تیری اتباع رذیل لوگ کررہے ہیں"۔

شاہ ولی اللہ اور جرجانی دونوں نے مردم کمینہ (کمین لوگ) کے الفاظ تحریر کئے ہیں ان کے صاحبزادوں نے بھی رذالے (شاہ رفیع الدین) اور نیچ قوم (شاہ عبدالقادر) کے الفاظ تحریر کئے کیونکہ ان اقوال کے قائل اسی مفہوم میں ان الفاظ کو استعمال کرتے تھے، بخلاف ارذل عمر کے الفاظ کے، یہ الفاظ حضرت حق تعالٰی کے ہیں اور حق تعالٰی نے ان الفاظ کی خود تشریح کردی ہے۔

سورہ شعراء میں بھی یہ الفاظ ہیں، واتبعک الارذلون ،یعنی حالانکہ پیروی تو کردہ اند سفلہ

گاں، یعنی اے نوح، کیا ہم تیری پیروی کریں جبکہ تیری پیروی حقیر اور ذلیل لوگ کر رہے ہیں اس جگہ بھی سابق کی طرح شاہ رفیع الدین صاحب نے رذالے اور شاہ عبدالقادر نے کمینے کے الفاظ تحریر کئے، حضرت نوحؑ کے مخالفین نے حقیر و ذلیل کہہ کر یہ بھی کہا کہ ان کی عقل موٹی ہے، سطحی سوچ والے لوگ ہیں جو آپ کے ساتھ ہو گئے ہیں، مخالفین نے عقل کی نفی نہیں کی موٹی عقل والا کہہ کر حضرت نوح کے متبعین کی توہین کی۔ اسی طرح قریش مکہ نے حضرات صحابہ کرام (اہل ایمان) کو بے وقوف کہہ کر ان حضرات کی توہین کی۔ قالوا انؤمن کما آمن السفهاء (بقرہ ۱۳)

''مشرکین مکہ نے کہا، کیا ہم اسلام پر اس طرح ایمان لے آئیں جس طرح بے وقوف لوگ ایمان لائے ہیں'' حالانکہ قریش مکہ جانتے تھے کہ رسول پاک ﷺ پر ایمان لانے والے صاحب عقل و خرد لوگ ہیں۔ بے وقوف اور بے عقل نہیں ہیں مشرکین مکہ اہل ایمان کو بے وقوفی کا طعنہ دیتے تھے، ان میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ حضرات صحابہ کے مقابلہ میں اپنے آپ کو اشراف کہیں اور صحابہ کرام کو رذیل قرار دیں۔ حضرت نوح کے مخالفین کا یہی مطلب تھا کہ ہم اشراف قوم ہیں اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ قوم کے حقیر و ذلیل افراد ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا خطرہ

حضرت یعقوب علیہ السلام کو جب اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے یوسف کی خوشبو آئی جو ان کے پیرہن کی مصر سے روانگی کے وقت شروع ہوگئی تھی تو عمر رسیدہ (۱۳۰ برس) باپ نے اپنے پوتے اور پوتیوں سے کہا، انی لاجد ریح یوسف لو لا ان تفندون (یوسف ۹۴)

اس کا مطلب خیز ترجمہ یہ ہے۔ ''تو ان کے باپ نے کہنا شروع کیا کہ اگر تم بڑھاپے میں بہکی بہکی باتیں کرنے والا نہ سمجھو تو ایک بات کہوں کہ مجھ کو یوسف کی خوشبو آرہی ہے'' (تھانوی)

عربی میں لفظ ''فند'' کے جو معنی آتے ہیں شاہ ولی اللہ اس کے مطابق یہ ترجمہ کرتے ہیں: اگر بہ نقصان عقل نسبت نہ کنید مرا گفتند الخ دونوں صاحب زادگان نے اردو کا ایک ہلکا پھلکا محاورہ لکھا: ''اگر بہکا ہوا کہو'' (شاہ رفیع الدین) ''اگر نہ کہو کہ بوڑھا بہک گیا'' (شاہ عبدالقادر) اب اردو زبان کی وسعت اور مترجمین اردو کے ذوق محاورہ بندی کی رنگا رنگی ملاحظہ کرو۔ سب سے پہلا با محاورہ ترجمہ (ڈپٹی نذیر) ہر لحاظ سے نہایت موزوں ترجمہ کہا جا سکتا ہے، لکھتے ہیں: اگر مجھ کو سترا بہترا نہ بتاؤ تو ایک بات کہوں کہ مجھ کو تو یوسف کی مہک آرہی ہے''۔ ستر بہتر (۷۰۔۷۲) سال کی عمر میں بہکتے اور

بے تکی باتیں کرنے کا دور کسی نہ کسی درجہ میں شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس واقعہ کے وقت حضرت یعقوب کی عمر (۱۳۰) برس کی تھی۔ آپ (۱۷) برس مصر میں رہے اور اس حساب سے (۱۴۷) سال کی عمر میں وفات پائی۔ حضرت ابراہیم کے عہد کے لحاظ سے یہ عمر طبعی تھی، بہت زیادہ نہیں تھی مولانا آزاد نے اپنے ذوق زبان دانی کے مطابق لکھا: ''اگر تم لوگ یہ نہ کہنے لگو کہ بڑھاپے سے اس کی عقل ماری گئی تو میں کہوں گا مجھے یوسف کی مہک آرہی ہے۔'' نقصان عقل اور ناقص العقل کے لیے عقل ماری گئی، بہترین محاورہ ہے جو لغوی مفہوم کے قریب ہے۔ مولانا احمد سعید نے اسی مفہوم کو ادا کرتے ہوئے لکھا: ''میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں اگر تم نے میری بات کو بڑھاپے کی کم عقلی نہ سمجھا تو میری تصدیق کرو گے۔''

مولانا احمد سعید سے پہلے لولا کا جواب (لقلتُ) ''تو میں کہوں'' مقدر مانا گیا اور مولانا نے (لصد قتمونی) کے لفظ کو مقدر تسلیم کیا اور آیت کے مطلب کو خوب واضح کیا، دو مترجم حضرات ایسے ہیں جنہوں نے سٹھیانے کا محاورہ استعمال کیا ہے۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب نے لکھا: ''اگر مجھے یہ نہ کہو کہ سٹھ گیا ہوں'' مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا: ''تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں''۔

ایک سو تیس سال کی عمر کے بوڑھے آدمی پر سٹھیانے کا محاورہ ٹھیک بیٹھتا ہے۔ یہ بات صحیح ہے لیکن اردو محاورہ سازوں نے ساٹھ برس کی عمر والوں کے حق میں بدحواس ہونے کا فتوی لگانے میں غلطی کی ہے اردو لغت والوں نے سٹھیانے کے محاورہ کا مطلب بدحواس ہونا، بہکنے لگا، لکھا ہے۔ ڈپٹی صاحب کے محاورہ (سترا بہترا) میں تو کسی حد تک صداقت پائی جاتی ہے اور بعض عمر رسیدہ لوگ اس عمر میں اپنے حواس کبھی نہ کبھی کھو بیٹھتے ہیں، لیکن ساٹھ برس کی عمر والوں کے حواس خراب ہو جاتے ہیں یہ واقعہ کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

اردو کا دوسرا محاورہ ساٹھ سال کی عمر کے لیے یہ درست ہی کہا جاتا ہے، ساٹھا پاٹھا یعنی ساٹھ سال کا جوان پٹھا۔ ارذل عمر کے بارے میں حضرت علی کا قول (۷۵ سال) بھی کوئی کلیہ نہیں معلوم ہوتا، حضرت علی کا ذاتی تجربہ ہو سکتا ہے ورنہ مختلف لوگوں کے مختلف حالات سامنے آتے ہیں اور اس کا تعلق فطری قوۃ سے ہے بعض حضرات نوے اور سو (۹۰۔۱۰۰) کے لپیٹے میں آنے کے بعد بھی سلیم الحواس نظر آتے ہیں اور بعض حضرات اس عمر سے بہت پہلے بدحواس ہو جاتے ہیں۔

نظیرا کبرآبادی کے ہاں ارذل عمر!

نظیرا کبرآبادی نے ارذل عمر کی یہ تصویر کشی کی ہے:

تن سوکھا، کبڑی پیٹ ہوئی، گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا، چلنے کی فکر کرو بابا
سر کانپا چاندی بال ہوئے، منہ پھیلا پلکیں آن جھکیں
قد ٹیڑھا کان ہوئے بہرے اور آنکھیں بھی چندھیائی گئیں
سکھ نیند گئی، اور بھوک گھٹی، دل سست ہوا، آواز نہیں
جو ہونی تھی سو ہو گزری، اب چلنے میں کچھ دیر نہیں

ارذل عمر کی تعریف حدیث میں!

ارذل عمر کی تعیین میں حضرت علی کا قول (۷۵) برس کا ہے، پچھتر برس کے بعد سے یہ تنزلی آگے بڑھتی رہتی ہے۔ فضائل کی ایک حدیث میں اس عمر کی فضیلت بیان کرتے ہوئے کہا گیا: فاذا بلغ السبعین احبه اهل السماء فاذا بلغ الثمانین کتب الله حسناته وتجاوز عن سیئاته. ''جب انسان ستر سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جب اسی سال کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی نیکیوں کو لکھنے کا حکم دیتا ہے اور اس کے گناہوں کو مٹانے کی ہدایت کرتا ہے۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا: فاذا بلغ ارذل العمر لکی لا یعلم بعد علم شیئا کتب الله له مثل ما کان یعمل فی صحته من الخیر .(ابن کثیر جلد ۳ ص ۲۸۷)''انسان جب بڑھاپے کی منزل (ارذل عمر) کو پہنچتا ہے اس وقت اس کا علم اور اس کی سمجھ کمزور ہو جاتی ہے تو کمزوری کے دور کی نیکیوں کا ثواب اتنا ہی عطا کیا جاتا ہے جتنا ثواب تندرستی اور جوانی کی عمر میں ملتا ہے۔ فقہ کی اصطلاح کے مطابق کمزوری اور لاچارگی کا دور رخصت کا دور کہلاتا ہے اور قوت اور استطاعت کے دور کو عزیمت کا دور کہا جاتا ہے۔

گناہ بھاگتے ہیں!

فطری طور پر بڑھاپے کی عمر ایسی ہے جس سے گناہ خود بخود بھاگتے ہیں، جب انسان گناہ کرنے کے قابل نہیں رہتا، صرف گناہ کی حرص مٹاتا ہے جوانی کی پڑی ہوئی عادتیں اسے گناہ پر اکساتی

ہیں مگر عملی ناطاقتی بوڑھے میاں کو لاچار کر دیتی ہے، جوان آدمی جب کسی عمر رسیدہ بوڑھے کو کسی برائی میں مبتلا دیکھتا ہے تو اسے شرم آجاتی ہے، ایک شاعر کہتا ہے:

ناتوانی کا برا ہو غش پہ غش آنے لگے/ دو گھڑی دل کھول کر رونا بھی مشکل ہو گیا۔

اور دوسرے شاعر (شہیدی) نے تو حد کر دی، وہ کہتا ہے:

شہیدی حشر کے دن بھی ہمارا ہو چکا اٹھنا/ یہی عالم رہا بعد فناء گر ناتوانی کا

بڑھاپے کی ناطاقتی کے اندر بھی اگر برائی کرنے کی حرص بھڑک جاتی ہے تو بڑے میاں کی آبرو خراب ہو جاتی ہے۔ امیر مینائی کہتے ہیں:

آبرو کھوتی ہے پھر بھی رکھتی ہے ناکام حرص/ دشمنِ عزت ہے جس کا ہے جہاں میں نام حرص

استاد بے خود دہلوی کی بھی سنئے، وہ کہتے ہیں:

وصل میں مجبور ہیں، وہ کیا کریں، ہم کیا کریں/ ایک ارماں دل سے نکلا اور پیدا ہو گیا

حدیث میں قوت کی فضیلت

حدیث میں آتا ہے المؤمن القوی خیر من المؤمن الضعیف وفی کل خیر۔ طاقتور مومن کمزور مومن سے بہتر ہوتا ہے اور ویسے ہر دو میں خیر ہے، یعنی بعض پہلو قوت کے اندر خیر کے ہیں اور بعض پہلو کمزوری اور بے چارگی کے اندر خیر کے ہیں۔ یہ اشارہ بڑھاپے کی عمر میں خیر کے پہلوؤں کی طرف کیا گیا ہے۔

قرآن کریم کی برکت

مشہور تابعی عکرمہ (شاگرد ابن عباس) فرماتے ہیں: من قرأ القرآن لم یصر بهذه الحالة (ابن کثیر ۲۷۹) "جو شخص قرآن کریم کی تلاوت کرتا رہتا ہے تو اس کی حالت اس منزل پر نہیں پہنچتی"، یعنی بڑھاپے میں اس کے حواس اور اس کی عقل قائم رہتی ہے اور یہ برکت تلاوت قرآن کی ہے اور اس کی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام کی حفاظت کے لیے قاری قرآن کے قوت حافظہ کی حفاظت کرتا ہے اور بڑھاپے کی حالت میں بھی قاری اور حافظ کو تلاوت پر قائم رہنے کی توفیق عطا کرتا ہے۔

سورہ والتین والزیتون میں اسفل سافلین کے الفاظ آئے ہیں بعض علماء نے ان الفاظ کی تفسیر ارذل عمر سے کی ہے، اس کی تشریح کے لیے راقم نے مستقل تحقیق کی ہے۔

پہلے فارسی ترجمہ قرآن کی تحقیق

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے فاضل عربی جو پونہ مسلم تعلیمی کمپلیکس میں عربی کے پروفیسر ہیں فارسی کے پہلے ترجمہ قرآن کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ دہلی سے شائع شدہ پانچ ترجموں والے قرآن میں پہلا فارسی ترجمہ شیخ سعدی شیرازی کا تحریر کیا گیا ہے حالانکہ شیخ سعدی کی تصنیفات پر جو تحقیقی کام ہو چکا ہے اس میں ترجمہ قرآن کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ جواب میں گزارش ہے کہ دہلی سے شائع شدہ پانچ تراجم والا قرآن کریم کسی مستند عالم نے ترتیب نہیں دیا بلکہ ناشر صاحب سید محمد شفیع الدین صاحب مالک اقبال پرنٹنگ پریس حویلی اعظم خاں دہلی نے خود ترتیب دیا ہے اور اس کے حاشیہ پر احسن التفاسیر (مولانا سید احمد حسن) شامل کر دی ہے ناشر مرتب نے بغیر تحقیق کے کسی سے سنی سنائی بات لکھ دی اور فارسی ترجمہ کو شیخ سعدی کی طرف منسوب کر دیا۔

مولانا عبدالحق صاحب حقانی مصنف تفسیر حقانی نے اپنے مقدمہ تفسیر (البیان) میں اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے یہ لکھا کہ یہ ترجمہ سید شریف جرجانی (وفات ۸۱۲ھ) کا ہے (البیان ۴۹۹) حقانی صاحب کی یہ بات تحقیقی ہے۔ میں نے پروفیسر صاحب (پونہ) کے مراسلہ کے بعد اپنے اطمینان کے لیے مشہور فارسی فرہنگ (تصنیف ڈاکٹر معین جلد ۱۰) کا مطالعہ کیا، اس مستند فارسی فرہنگ سے معلوم ہوا کہ میر سید علی ابن محمد شریف الجرجانی (گرگان ایران) میں پیدا ہوئے، مصنف نے سید شریف کو علوم حکمت و عرفان اور فنون ادبی کا ماہر استاد لکھا ہے، ان کی وفات (۸۱۲ھ) میں تحریر کی گئی ہے۔ سید شریف جرجانی کے ترجمہ قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ سید صاحب قرآنی علوم کے بھی ماہر تھے، کیونکہ شاہ ولی

اللہ نے سید شریف کے اپنے سے پہلے ترجمہ فارسی کی بڑی حد تک پیروی کی ہے، کہیں کہیں زبان کا اسلوب بدل دیا ہے۔

سید صاحب علامہ تفتازانی کے معاصر تھے، علامہ نے سید صاحب کا ایرانی حکمراں شاہ شجاع مظفری سے تعارف کرایا اور شاہ شجاع انہیں گرگان سے شیراز لے آیا اور انہیں مدرسہ دارالشفاء میں مدرس مقرر کر دیا۔

تیمور نے جب شیراز پر حملہ کیا تو وہ انہیں اپنے ساتھ سمرقند لے گیا ڈاکٹر معین مصنف فرہنگ نے سید صاحب کی ادبی اور فنی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن ان کتابوں میں ترجمہ قرآن جیسی اہم خدمت کا ذکر نہیں کیا اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف فرہنگ شیعہ ملک سے تعلق رکھتا ہے اور اس ملک کے لوگ ترجمہ کو اہمیت نہیں دیتے کیونکہ اس کارنامہ (ترجمہ قرآن) سے اس کے مصنف کا سنی ہونا ظاہر ہے اور صاحب فرہنگ کو یہ پسند نہیں تھا۔

سید شریف کے فارسی ترجمہ کی ہندوستان میں موجودگی یہ بتاتی ہے کہ وہ تیمور کے ساتھ ہندوستان آئے، تیمور پندرہ دن ہی میں قتل و غارت گری کر کے واپس چلا گیا اور سید صاحب بھی اس کے ساتھ واپس ہو گئے، کیونکہ سید صاحب کا مزار شیراز میں واقع ہے، البتہ ان کا ترجمہ اہل علم کے پاس رہا اور انہوں نے اس کی ہندوستان میں اشاعت کی۔

صاحب جائزہ تراجم (دیوبند) کی تحریر کے مطابق ہندوستان میں پہلا فارسی ترجمہ شہاب الدین ہندی دولت آبادی کا ہے جو بحر مواج (تفسیر) کے نام سے چھپا ہے، اس ترجمہ اور تفسیر کی تاریخ (۸۴۸ھ) ہے یہ شیر شاہ سوری کے استاد تھے، شیر شاہ ایک صاحب علم و فضل اور نیک سیرت بادشاہ تھا، اس کی سرپرستی میں اس کے استاد نے یہ عظیم خدمت انجام دی، لیکن شیر شاہ صرف پانچ سال حکومت کر سکا اس لیے مذکورہ تفسیر کا تذکرہ صرف تاریخ میں نظر آرہا ہے، البتہ سید شریف کا ترجمہ ہندوستان میں شائع ہوا اور مقبول ہوا۔

قرآن مجید کا منظوم ترجمہ

اردو میں سب سے بڑا سرمایہ عربی کے تراجم کا ہے۔ اس میں قرآن پاک کے تراجم اور تفاسیر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک حضور اکرم محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک عربی میں نازل فرمایا۔ قرآن مجید کے مخاطب اوّل اہل عرب تھے اس لئے قرآنِ پاک کی افہام و تفہیم کے لئے تفاسیر بھی سب سے پہلے عربی میں لکھی گئیں۔ جب اسلام سرزمینِ عرب کی حدود سے نکل کر ان علاقوں اور ملکوں میں پھیلنے لگا جہاں کے لوگوں کی زبان عربی نہیں تھی تو عجمی مسلمانوں کو قرآن میں دیئے گئے اللہ کے پیغام کو سمجھنے کی ضرورت پیش آئی۔ اسی کے ساتھ یہ ضرورت بھی محسوس کی جانے لگی کہ قرآن پاک کے معنی و مفہوم اور پیغام کو عام شخص تک پہنچانے کے لئے اپنے مخصوص علاقہ یا ملک کی زبان کے قالب میں اُسے ڈھالا جائے۔ اِسی ضرورت کے پیش نظر عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں تراجم و تفاسیر کا عمل شروع ہوا۔ آج چودہ[۱۴] صدیاں بیت جانے کے بعد اس صحیفۂ آسمانی کی توضیح و تشریح اور ترجمہ و تفسیر کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ علوم قرآنی کے ماہر ڈاکٹر حمید اللہ رقم کے مطابق چودھویں صدی کے ربع چہارم میں قرآن مجید کا ایک سو سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ دنیا کی ساری زبانوں کے مقابلے میں اُردو میں قرآن کے تراجم کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اس میں بونے[۹۱] تراجم ملتے ہیں۔ اردو کے بعد فارسی تراجم ہیں جن کی تعداد باؤن[۵۲] ہے[۱]۔ مگر ڈاکٹر مسعود احمد نے اپنے مقالے "اردو تراجم و تفاسیر قرآنی" میں تراجم و تفاسیر کی تعداد ایک سو پچپن[۱۵۵] بتائی ہے۔[۲]

---

[۱] برگِ گل (جریدہ) کراچی شمارہ ۵ ص ۲۵۶ بحوالہ نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۵۰ء ص ۵۲ مضمون کلام پاک کا اولین منظوم ترجمہ اور تفسیر از ضمیر نیازی [۲] نگار (ماہنامہ) دسمبر ۱۹۶۲ء ص ۲۲۵ بحوالہ ایضاً .... ایضاً ..... ایضاً .....

ہندوستانی عوام کے لئے مطالبِ قرآنی سمجھنے یا سمجھانے کے لئے وہی مسائل درپیش تھے جو اور غیر عربی زبان والوں کے ساتھ تھے۔ ابتدا میں یہاں مسلم سلاطین کی درباری زبان فارسی ہونے کے سبب یہ خواص و عوام کی بھی زبان تھی۔ اس لئے قرآن کے افہام و تفہیم کی دشواری کے پیش نظر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے سب سے پہلے ہندوستان میں قرآن پاک کا ترجمہ "فتح الرحمٰن" کے نام سے فارسی میں کیا۔ بعدازاں اردو نے جب فارسی کا مقام لے لیا اور اردو عوام و خواص کی زبان بن گئی تو اردو میں سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے چوتھے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے قرآن مجید کا ترجمہ "موضح قرآن" کے نام سے ۱۲۰۵ھ مطابق ۹۱-۱۷۹۰ء میں کیا۔ اس کے علاوہ حضرت شاہ محدث دہلوی کے تیسرے صاحبزادے اور جید عالم حضرت شاہ رفیع الدینؒ نے بھی قرآن پاک کا لفظی ترجمہ کیا ہے۔

متعدد شعرائے کرام نے قرآن پاک کے ترجمے کو نظم کے قالب میں بھی ڈھالنے کی سعی جمیل کی ہے۔ کچھ شعراء نے منظوم ترجمے کے ساتھ ساتھ تفسیر بھی نظم کی ہے۔ قرآن پاک کے منظوم ترجمہ کی تاریخ تقریباً چار سو سال پر محیط ہے۔ یہ رجحان بھی اردو میں فارسی سے آیا۔ اس صحیفۂ آسمانی کے اردو میں ابتدائی منظوم تراجم و تفسیر گجراتی یا اردو گجری زبان میں ملتے ہیں۔ اردو میں اولین جزئی منظوم ترجمہ گجرات کے عالم، صوفی اور ولی حضرت بہاؤ الدین ملقب بہ باجن ابن حاجی معز الدین کا ملتا ہے۔[1] ان کے جزئی ترجمہ سے تا دمِ تحریر تقریباً پانچ سو سال کی طویل مدت میں متعدد مکمل اور جزئی منظوم ترجمے کئے گئے ہیں اور بعض شعراء نے محض سورتوں اور چند پاروں کے ترجمے کو ہی نظم کیا ہے۔

کلام پاک کا اردو میں اولین منظوم ترجمہ و تفسیر مولوی قاضی عبدالسلام بدایونی ابن قاضی عطاء الحق عباسی کا "زادِ الآخرت" ہے۔ یہ تیرہویں صدی ہجری کا شاہکار ہے اور ۱۸۶۸ء میں حسنِ طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ اردو ترجمہ کی مصنف ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم شرف الدین

---

[1] برکات الاولیاء ص ۶۲-۶۱ بحوالہ نوائے ادب بمبئی۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء۔ کلام پاک کا اولین منظوم ترجمہ و تفسیر از ضمیر نیازی

کے مطابق اشعار کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے مگر ضمیر نیازی پچاسی[1] ہزار اشعار بتاتے ہیں۔

اس منظوم ترجمے کے تقریباً بہتر سال بعد قرآن پاک کا دوسرا منظوم ترجمہ شمس الدین شائق ایزدی (متوفی ۱۳۵۵ھ) نے "نظم البیان فی مطلب قرآن" کے نام سے ۱۳۱۶ھ میں کیا۔ اس کے بعد جو یہ سلسلہ جاری ہوا تو آج تک قائم ہے۔ مطیع الرحمٰن خادم (علی گڑھ) نے "نظم المعانی ترجمہ کلامِ ربانی" (۱۳۶۶ھ مطابق ۱۹۴۶ء) کے نام سے، سیماب اکبر آبادی نے "وحی منظوم" (۱۳۶۵ھ مطابق ۱۹۴۶ء) کے نام سے مجید الدین اثر زبیری نے "سحر البیان" (۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۱ء) کے نام سے، سید شمیم اختر نے "آبِ رواں" (۱۹۶۰ء) کے نام سے منظوم ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ کیف بھوپالی "مفہوم القرآن"[2] کے نام سے ستائیس پاروں کے ترجمے کو نظم کے قالب میں ڈھال سکے کیونکہ زندگی نے ان کے ساتھ وفا نہ کی۔ کبیر کوثر بھوپالی "القرآن المنظوم" کے نام سے منظوم ترجمہ کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں اور کچھ پاروں کا منظوم ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ آغا شاعر نے بھی "نظم مقدس" کے نام سے قرآن پاک کے ترجمے کو نظم کے قالب میں ڈھالنے کی مساعی جمیلہ کی ہے۔

آغا شاعر نے ۱۹۱۳ء میں قرآن پاک کے ترجمہ کو نظم کرنا شروع کیا۔ ان کو جب قرآن پاک کے ترجمے کو نظم کرنے کا خیال آیا تو اس عظیم اور دشوار کن کام کو دیکھ کر کبیدہ خاطر ہو گئے مگر اسی رات ایک خواب دیکھا جس کی تعبیر کو فال نیک سمجھا اور اس کام میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ جمیل احمد صدیقی اس خواب کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> "آغا صاحب مذہبی خیالات اور اخلاقیات کے دلدادہ تھے۔ انھوں نے سوچا کہ کلام پاک آسانی سے لوگوں کے ذہن نشین ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی انھوں نے اس طرف توجہ کی مگر یہ سوچ کر کہ اتنا بڑا کام کس طرح مکمل ہوگا، کبیدہ خاطر ہو گئے۔ رات کو خواب میں دیکھتے ہیں کہ مسجد میں حوض کے کنارے وضو کر رہے ہیں۔ کلی کرتے ہی بجائے پانی کے منہ سے ننھی ننھی

---

[1] نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۷۵ء مضمون کلام پاک کا اولین منظوم ترجمہ و تفسیر از ضمیر نیازی

[2] ہفتہ وار "بلٹز" (بمبئی) مورخہ ۲ رجولائی ۱۹۹۲ء (ص ۱۶) کے مطابق "مفہوم القرآن" کی اشاعت دہلی سے ہو گئی ہے۔

سرخ، سپید، سبز رنگ برنگ کی چڑیاں نکل کر اڑ رہی ہیں اور خوش الحانی سے ترنم ہیں۔
اس کی تعبیر انہوں نے یہ لی کہ فال نیک ہے اور بسم اللہ کہہ کر کلام پاک نظم میں ترجمہ
کرنے میں مصروف ہو گئے۔"[1]

ابتدا میں جب انھوں نے ترجمہ کا کچھ حصہ منظوم کیا تو حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور منظوم ترجمہ سُنایا۔ خواجہ صاحب بہت خوش ہوئے اور متاثر بھی۔ یہ ۱۲ جولائی ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ :-

"آج جناب آغا شاعر نے ایک عجیب و غریب چیز سنائی یعنی قرآن پاک کا منظوم اُردو ترجمہ، نہایت شیریں، بامحاورہ اور مؤثر فقرے ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر سیاق عبارت الٰہی کی پیروی میں مشکلات آئی ہیں جس کے لئے میں نثر کا ترجمہ بھی شامل کرنے کی صلاح دیتا ہوں ----"[2]

آغا شاعر نے حضرت شاہ عبدالقادر محدثؒ دہلوی (متوفی ۱۲۳۰ھ) کے نثری ترجمے کو نظم کے قالب میں ڈھالا ہے۔ شاہ صاحب کا ترجمہ قرآن کے ترجموں میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ سینکڑوں علمائے کرام نے قرآن کے اُردو ترجمے کرنے اور تفسیر لکھنے میں ان کے ترجمے سے استفادہ کیا ہے۔ بقول مولانا عبدالماجد دریا آبادی "ترجمہ کی راہ ہندوستان میں اگر شاہ دہلوی اور ان کے خاندان والوں نے نہ کھول دی ہوتی تو آج خدا معلوم کتنی دشواریوں کا سامنا ہوتا۔"[3] اس لئے آغا شاعر نے ایسی ذی علم شخصیت کے ترجمہ کو نظم کرنے کے لئے انتخاب کیا جس کو نہ صرف قرآن پاک کا ولین آسان اور بامحاورہ ترجمہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے بلکہ جس کا گھرانہ قرآن پاک کے ترجمے کے باب میں عالمی شہرت کا مالک ہے۔

---

[1] آغا شاعر۔ حیات و شاعری ص ۵۰ (کچھ اسی قسم کا واقعہ علامہ اقبالؒ کی پیدائش کے بارے میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی تصنیف 'فکر اقبال' (۱۹۶۱ء) میں ص ۱۴ پر بیان کیا ہے۔)

[2] نظم مقدس (منظوم ترجمہ قرآن مجید) از آغا شاعر ص ۱۱۶ اکتوبر ۱۹۲۷ء (کراچی۔ پاکستان)

[3] مقدمہ ترجمہ قرآن مطبوعہ ۱۹۵۲ء بحوالہ قرآن حکیم کے اردو تراجم از ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم شرف الدین ص

آغا شاعر نے منظوم ترجمہ کا بیڑا اس لئے بھی اُٹھایا تھا کہ شاید یہ ان کی مغفرت کا سامان بن جائے۔ وہ پُر امید تھے کہ اس نیک عمل سے غفور الرحیم انھیں ضرور بخش دے گا۔ اس لئے اتنی لگن سے کام کیا کہ دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا۔ اس عظیم الشان کام میں ان کی راتیں کالی ہوئیں۔ اس کو وہ توشۂ آخرت اور مغفرت کا ذریعہ سمجھتے تھے اس لئے عمر کے آخری حصہ تک اس میں ہمہ تن مصروف رہے اور مکمل کر کے ہی سانس لیا۔ اپنے منظوم ترجمے کے بارے میں خود فرماتے ہیں کہ :۔

" اے سمیع و بصیر خدا! اے لاثانی ملک القدوس! محض اس خیال سے کہ تیرے کلام پاک سے ہم سرکش ولہو ولعب میں مصروف بندے ناآشنا ہوئے جاتے ہیں، اس عاجز نے اپنی حتی الوسع تیرے کلام کے معانی اور مطالب کو محض تیری ہی قوت اور ہدایت سے نہ صرف خوش وضع اور آسان نظم کا جامہ پہنایا ہے بلکہ لطفِ زبان کے ساتھ لفظی ترجمے کی بھی احتیاط سے پابندی کی ہے۔

تو حاضر و ناظر ہے، اس میں راتیں کالی ہوئی ہیں اور دن بیتے ہیں اس لئے اے رب العالمین! اسے اپنی خدائی میں پھیلا دے تاکہ مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے اسے ذوق شوق سے پڑھیں اور تیری حمد و پاکی کا وظیفہ بنائیں۔

کیا عجب ہے اگر تیری مشیت میں ایسا ہو کہ تو اسی ناقابل کمزور اور بے سُواد ہاتھ سے اسے تمام و کمال پورا کرائے، زہے نصیب، خہے تقدیر، کیونکہ تو خود فرماتا ہے واللہ یختص برحمتہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔"[۱]

ابتدا میں بطور نمونہ ان کے منظوم ترجمہ کے آٹھ صفحات ۱۳۳۱ھ میں شائع ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ "نظام المشائخ" (دہلی) میں بھی کچھ حصے شائع ہوئے۔ مگر ان کی زندگی میں صرف تین پاروں کا ہی منظوم ترجمہ شائع ہو سکا۔ پہلا پارہ ۱۳۳۱ھ، تیسواں پارہ (عم) ۱۳۳۶ھ اور دوسرا پارہ ۱۹۳۴ء میں طبع ہوا۔ لیکن اب مکمل قرآن مجید کا منظوم ترجمہ کراچی (پاکستان) سے شائع ہو گیا ہے۔

---

[۱] نظم مقدس۔ منظوم ترجمہ قرآن مجید۔ آغا شاعر قزلباش دہلوی ص ۱۱۶ اکتوبر ۱۹۷۱ء کراچی (پاکستان)

قرآن پاک کا جب پہلا پارہ کا منظوم ترجمہ شائع ہوا تو آغا شاعر نے اظہار رائے کے لئے اخباروں کے علاوہ بعض مشاہیر ادب کو بھی بھیجا۔ ہر طرف سے تعریف و تحسین کے کلمات برسنے لگے۔ اس سلسلے میں اکبر الہ آبادی کا ایک دلچسپ واقعہ عبدالمجید سالک نے بیان کیا ہے جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں۔ سالک صاحب لکھتے ہیں :۔

"ایک دن میں حاضر ہوا تو کسی قدر (آغا شاعر) افسردہ سے بیٹھے تھے میں نے پوچھا "حضرت مزاج کیسا ہے"؟ آج تو کچھ انقباض سا معلوم ہوتا ہے۔ صندوقچی پاس پڑی تھی اس کو کھولا، ایک خط نکال کر میرے آگے رکھ دیا اور فرمایا "سالک صاحب ذرا یہ سخن فہمی عالم بالا بھی ملاحظہ ہو۔ میں نے دیکھا تو مولانا اکبر الہ آبادی مرحوم کا خط تھا۔ لکھا تھا :۔

حضرت آغا تسلیم!

اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے کلام اللہ کو نظم کر دیا۔ اب کوئی اللہ کا بندہ اسے طبلے اور سارنگی پر گا بھی دے، تو مزا آجائے" میں پڑھ کر بے اختیار ہنس دیا۔ آغا صاحب نے میری طرف تیز نظروں سے دیکھا، میں نے فوراً عرض کیا حضرت آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اکبر صاحب کو قرآن مجید کا ترجمہ نظم میں کرنے سے اختلاف ہوگا، جیسے دوسرے صدہا لوگوں کو ہے، اور ان کی طبیعت میں ظرافت ہے۔ اس لئے ازراہِ بے تکلفی انہوں نے آپ کو یہ خط لکھ دیا۔ اس پر منقبض ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ فرمانے لگے "جب کسی سخن فہم کی طرف سے ایسی حرکت سرزد ہو تو رنج ہوتا ہے ......"[1]

اکبر الہ آبادی کیا بہت سے علمائے کرام نے بھی قرآن کے منظوم ترجمہ اور تفسیر کو مستحسن نظروں سے نہیں دیکھا۔ سیماب اکبر آبادی نے جب اپنے منظوم ترجمہ کے بارے میں علمائے کرام سے رجوع کیا تو ان میں اکثر معتبر اور مقتدر عالموں نے اسے تحریف سمجھ کر

---

[1] آغا شاعر۔ حیات و شاعری۔ ص ۱۰۰

سخت ناپسند فرمایا۔ اسی طرح مولوی محمد ہاشم فرنگی صاحب نے جب کیف بھوپالی کے اردو منظوم ترجمۂ قرآن پاک کی خبر پڑھی تو عبدالماجد دریا آبادی کو ایک مکتوب میں تحریر کیا کہ "...... بحور اور قافیوں کی پابندی کے ساتھ کوئی ایک جزو کی بھی اردو نثر اور نظم میں یا دنیا کی کوئی نثر کسی نظم میں اپنی تمام خصوصیات، افادات اور مالہ وماعلیہ کے ساتھ اپنی افادی حیثیت کو برقرار رکھ سکتی ہے؛ میں تو سمجھتا ہوں کہ قرآن شریف کی کسی مختصر سی سورۃ کا بھی صحیح اور جامع ترجمہ کسی عربی نظم میں بھی ممکن نہیں"[1] عبدالماجد دریا آبادی اس سے اتفاق کرتے ہوئے ان کو لکھتے ہیں کہ "بے شک یہ کام انتہائی ذمہ داری کا ہے۔ البتہ ایک سے زائد ترجمے پورے تو شاید نہیں جزواً شائع ہو چکے ہیں مثلاً آغا شاعر کا ترجمہ اور کامیاب ترین ترجمہ اب تک آثر زبیری لکھنوی ثم کراچوی کا نظر سے گذرا ہے"[2]

قرآن مجید کے منظوم ترجمہ کا مسئلہ صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ جب دسویں صدی ہجری میں پہلی بار صحیفۂ آسمانی کی تفسیر کو دمشق کے مشہور عالم شیخ بدرالدین محمد بن رضی الدین الغزی نے عربی نظم کے قالب میں ڈھالا تو اسی قسم کا مسئلہ درپیش آیا۔ حاکم وقت سلیمان بن سلطان روم نے ملک کے نامور علمائے کرام سے اس منظوم تفسیر کے بارے میں تصویب اور تصدیق حاصل کی۔ اس کے بعد ہی مترجم (شاعر) کو بادشاہ کی جانب سے خلعت اور بیش بہا انعام واعزاز سے نوازا"[3]

دراصل قرآن پاک کے منظوم ترجمے کا مسئلہ بڑا نازک مسئلہ ہے۔ جن علمائے کرام نے قرآن کریم کے منظوم تراجم پر اظہار خیال فرماتے ہوئے ان کو تعریف وتحسین کے کلمات سے نوازا ہے، انھوں نے بھی اس طرف واضح اشارہ کیا ہے کہ علماء اور فقہا اس کی اجازت دینے سے اجتناب کیوں کرتے ہیں۔ حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ فرماتے ہیں کہ "یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ نثر کا دامن جس قدر وسیع ہے اسی قدر نظم کا دامن تنگ ہے اسی لئے فقہا

---

[1] اور [2] صدق جدید لکھنؤ - ۲۶ جولائی ۱۹۶۳ء ص ۷، بحوالہ نوائے ادب اکتوبر ۱۹۶۵ء مضمون۔ کلام پاک کا اولین منظوم ترجمہ اور تفسیر از ضمیر نیازی

[3] قاضی زاہد الحسینی، تذکرۃ المفسرین ج ۱ ۱۹۶۸ء ص ۷۳، بحوالہ نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۶۵ء ایضاً

نے (قرآن پاک کو) نظم کرنے کی اجازت نہیں دی"[1] حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ "قرآنِ پاک کے منظوم ترجمہ کا مسئلہ ایک نازک مسئلہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ علمائے کرام اس کی اجازت دینے میں تامل کرتے ہیں...... وحی الٰہی کو نظم کے قالب میں اس طرح پیش کرنا کہ کلام پاک کے مفہوم و مدلول میں سرِمو فرق نہ آنے پائے، آسان نہیں ہے۔ اس کے لئے انتہائی احتیاط، قابلیت اور دیدہ وری کی ضرورت ہے ...."[2] قرآنِ پاک کے منظوم ترجمے کو مستحسن نظروں سے نہ دیکھنے کی ایک وجہ اور بھی ہے کہ جب قرآنِ مجید کے نثری ترجمے میں غلطیوں کا خطرہ لاحق ہے تو نظم کی پابندیوں کی وجہ سے یہ خطرہ کئی گنا بڑھ جاتا ہے اور پھر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن مجید کے پیغام کو عوام الناس تک پہنچانے کے لئے نثری ترجمے کے مقابلے میں منظوم ترجمے کی افادیت کئی گنا کم ہے مگر شعراء کے منظوم ترجمے کیونکہ نیک نیتی پر مبنی ہیں اس لئے ان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

آغا شاعر نے اپنی سالہا سال کی محنت، اور بیش بہا عظیم الشان کام کو زیورِ طباعت سے آراستہ کرنے کے لئے بڑی دوڑ دھوپ کی مگر کامیابی نہیں مل سکی۔ ان کے دوست واحباب نے بھی سعی کی مگر کوئی راستہ نہ نکل سکا۔ مشفق خاں لطیف احمد جریح[3] نے مولوی عبدالحق (بابائے اُردو) کو ان کے منظوم ترجمے کی طباعت کے سلسلے میں ایک مکتوب بھیجا تھا۔ عبدالحق صاحب اس وقت انجمن ترقی اُردو کے صدر تھے۔ موصوف نے بھی اپنی عدیم الفرصتی کے باعث معذرت کا اظہار کرلیا تھا۔ مشفق خاں کو جو انھوں نے جواب دیا تھا اس سے آغا شاعر کے منظوم ترجمے پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ مکتوب ملاحظہ فرمائیں :-

"تسلیم آپ کا خط اور پارۂ سیقول کا منظوم ترجمہ پہنچ گیا۔ جواب ابھی تک اس لئے نہیں دیا تھا کہ میں ترجمے کو پڑھ لوں تو لکھوں۔

اب میں نے وہ منظوم ترجمہ دیکھ لیا۔ بیشک ترجمہ اچھا ہے اور بہت احتیاط سے کیا گیا ہے لیکن اس کے لئے ایسا پبلشر ملنا کہ کچھ معاوضہ بھی دے اس وقت نہیں مل سکتا۔

---

[1] نجم مقدس (منظوم ترجمہ قرآن مجید : الم سیقول) از آغا شاعر قزلباش دہلوی ص ۱۲۰

[2] ... منظوم ... نے سلم پرسنل لا (شریعت اسلام) بکبیر کوٹہ ص ۱۰،۱۸ [3] انسپکٹر مدارس امدادی (برار)

اب رہا یہ امر کہ یہاں کہ سررشتہ امورمذہبی سے کچھ امداد ہو۔ اس کے لئے مہینوں اور برسوں کی کوشش درکار ہے سخت پیروی کی ضرورت ہے۔ اس کی مجھے فرصت نہیں۔ (عبدالحق ۲۸ ستمبر ۱۹۲۷ء)

بقول جوش ملیح آبادی مولانا ابوالکلام نے سعی کی تھی کہ اسے چھپوادیں مگر ایسے مواقع پیش آئے کہ وہ بیچارے کچھ کر نہ سکے۔ مولانا آزاد بھی یہی چاہتے تھے کہ آغا شاعر کی محنت ضائع نہ جائے۔ آغا شاعر کے انتقال کے بعد ان کے بڑے لڑکے کو مولانا آزاد ایک مراسلہ میں لکھتے ہیں کہ :-

"آغا شاعر میرے پرانے مہربان دوست تھے۔ اس لئے میں آپ لوگوں کو اپنا عزیز سمجھتا ہوں۔ ہوسکے تو ان کے کارنامے منظوم ترجمہ کلام اللہ کو چھپوا دیجئے"[1]

مگر اتنی کوششوں کے باوجود یہ ترجمہ شائع نہ ہوسکا۔ آغا شاعر کو قرآن پاک کی عظمت اور تقدس کا پورا احساس تھا۔ وہ یہ بخوبی سمجھتے تھے کہ اس ترجمے میں معمولی سی بھی معنوی لغزش سے مفہوم میں تبدیلی واقع ہوسکتی ہے جو ایک گناہ کبیرہ ہے۔ خود فرماتے ہیں" باایں ہمہ میں سراپا عجز ہوں اغلطیوں سے مرکب ہوں، میں نے محض بندگان خدا کے فائدے اور آسانی کی غرض سے یہ کوشش کی ہے۔ اگر کہیں غلطی یا اغلاط سرزد ہوئی ہو تو عنداللہ معاف کیا جائے کیوں کہ مجھے اس کا کوئی فخر نہیں ....."[2] اس لئے انھوں نے پوری احتیاط سے کام لیا ہے۔

قرآن مجید کے ترجمے کو جن شعراء نے منظوم جامہ پہنایا ہے ان میں سے جن کے منظوم ترجمے دستیاب ہوسکے ان کے چند نمونے تقابلی مطالعہ کے لئے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے "بسم اللہ" کا منظومہ ترجمہ ملاحظہ کیجئے۔[3]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ (ترجمہ: شاہ عبدالقادر محدث دہلوی)

---

[1] چمنستان (دہلی) ۱۹۱۴ء بحوالہ آغا شاعر: حیات و شاعری ص ۱۴۴ [2] نظم مقدس، منظوم ترجمہ قرآن مجید۔ آغا شاعر دہلوی ص ۱۶

[3] مفہوم القرآن میں 'بسم اللہ' کے منظوم ترجمہ کی جگہ 'بسم اللہ' کا عربی متن ہی رکھا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیف بھوپالی نے 'بسم اللہ' کے ترجمہ کو نظم نہیں کیا ہے۔

منظوم ترجمے:

ہے نام سے خدا کے آغاز کا اُجالا　جو مہرباں بڑا ہے بے حد جو رحم والا　(آغا شاعر)
نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز بیاں　جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں[1]　(سیماب اکبرآبادی)
شروع ہے بنامِ خدائے تعالیٰ　ہے جو مہرباں اور بڑا رحم والا　(کبیر کوثر)
ترے نام سے ابتدا ہے خدایا　کہ تو مہرباں ہے بڑا رحم والا　(کبیر کوثر)

ابتدائے سخن بہ نامِ خدا　کہ وہ ہے مہرباں ہر در سوا
یاں میں لیتا ہوں پہلے اوس کا نام　جس کے مشمول رحم خاص عام
جب مقدر کیا گیا ارقام　نہ ہوا حرف سے شروع کلام
بعد بے کے جو اسم فرمایا　برطریقِ صلہ یہاں آیا
اہل تفسیر نے کیا ترقیم　اسم رحمٰن اور اسم رحیم
ہیں وہ رحمت سے دونوں مشتق نام　خاص پہلا ہے دوسرا ہے عام
نہیں رحمان بن خدائے کریم　اور کہا چاہے ہر کسی کو رحیم
جان مفہوم اب تو رحمان کا　کہ ہے رحمت کنندۂ دنیا
وہ جو دیتا ہے اس جہاں میں مدام　سب خلائق کو رزق روزی عام
سن تو معنی رحیم کے ہیں یوں　کہ ہے رحمت کنندہ بے چوں
مومنوں پر وہ خاص ہے رحمت　عاقبت اختصاص ہے رحمت
علم تفسیر سے جو ہیں آگاہ　کہتے ہیں اس طرح کہ بسم اللہ
آیت فاصل ہے وہ (کذا) از پئے فصل یک دگر ہے وہ[2]

(مولوی عبدالسلام)

ترجمہ سورۂ فاتحہ سب تعریف اللہ کو ہے؛ جو صاحب سارے جہان کا، بہت مہربان نہایت رحم والا. مالک انصاف کے دن کا، تجھ ہی کو ہم بندگی کریں اور تجھ

---

[1] ادر ے القرآن المنظوم ہے مسلم پرسنل لا؛ شریعت اسلام؛ از کبیر کوثر ص ۲،۲
[2] ڈاکٹر سید محمد عبد الحکیم شرف الدین۔ قرآن حکیم کے اردو تراجم

ہی سے مدد چاہیں، چلا ہم کو راہ سیدھی، راہ ان لوگوں کی جن پر تونے فضل کیا۔
نہ وہ جن پر غصہ ہوا اور نہ بھٹکنے والے۔ (ترجمہ شاہ عبدالقادرؒ محدث دہلوی)

منظوم تراجم سورۂ فاتحہ

ہے نام سے خُدا کے آغاز کا اُجالا — جو مہرباں بڑا ہے بے حد جو رحم والا
تعریف سب خُدا کو جو رب ہے عالموں کا — جو مہرباں بڑا ہے بے حد جو رحم والا
محشر کے دِن کا مالِک، روزِ جزا کا والی — تجھ کو ہی پُوجتے ہیں تیرے ہی ہم سوالی
سیدھی ڈگر پہ لے چل، ثابت قدم بنادے — نعمت جنہیں عطا کی اُن کی روِش سجھادے
نے اُن کی راہ جِن پر قہر و غضب ہوئے ہیں — نے اُن کی جو بھٹک کر گمراہ ہو گئے ہیں[1]

(آغا شاعر)

جُملہ خوبی خُدا کو ہے شایاں — کہ ہے پروردگارِ عالمیاں
کہ بہت مہر و رحم والا ہے — جس کی رحمت بیان سے بالا ہے
کہ وہی بادشاہِ روزِ جزا — (شاہی) اُس دِن کی ہے اسی کو سزا
تُجھ کو ہی کرتے ہیں عبادت ہم — اور تجھ سے ہی اِستعانت ہم
کر ہدایت ہمیں وہ سیدھی راہ — کہ مُراد اس سے ہے کتاب اللہ
راہ اُن کی ہمیں ہدایت کر — تُو نے اِنعام کردیا جن پر
اے سِوا اُن کے جو کہ تھے مغضوب — تھے جو محرُوم سب سے اور مسلوب
اور نہ گمراہوں کی وہ ہووے راہ — ایسی راہوں سے ہم کو رکھ لے نگاہ[2]

(مولوی عبدالسلام)

ہیں سبھی حمد و ثناء اللہ کو — عالموں کا پالنے والا ہے جو
مہرباں ہے، بخشنے والا بڑا — مالک و صاحب جزائے روز کا
ہم عبادت کرتے ہیں تیرے لئے — اور تجھی سے ہیں مدد ہم چاہتے
دے ہدایت ہم کو سیدھی راہ کی — راہ اُن کی جن کو نعمت تُونے دی

---

[1] اور [2] نئی راہ — قرآن نمبر مئی ۱۹۵۲ء بحوالہ القرآن منظوم — مسلم پرسنل لا (شریعت اسلام)، کیٹیر کوثر ص ۲۹

ہاں نہ ان کی جن پر ہے غصہ تیرا　　　　اور نہ گمراہوں کا رستہ دے خدا[1]

(مطیع الرحمٰن خادم)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سبھی خوبی سبھی تعریف ہے اللہ کو زیبا　　　　بزرگی ہے اسی آقائے عالی جاہ کو زیبا!
وہ ہے سارے جہانوں کا خدائے برتر و بالا　　　　برابر ساری مخلوقات کا ہے پالنے والا!
بہت ہی مہرباں ہے وہ بڑا ہی مہرباں ہے وہ　　　　سدا رحمت فشاں رحمت فشاں رحمت فشاں ہے وہ
وہی روزِ قیامت کا اکیلا حکمراں ہوگا　　　　کسی کا مشورہ ہوگا، نہ کوئی درمیاں ہوگا

خداوندا! ترے آگے ہم اپنا سر جھکاتے ہیں　　　　تجھی کو پوجتے ہیں بس تجھی سے لو لگاتے ہیں
خداوندا! تجھی سے مانگتے ہیں ہم مددگاری　　　　تجھے آتی ہے اپنے آرزومندوں کی دلداری
دکھادے ہم کو سیدھی راہ سیدھی راہ پرے چل　　　　جنہیں تو نے نوازا ہے انہیں کی راہ پرے چل
نہ اُن کی راہ پرے چل خدائی مار ہے جن پر　　　　تری پھٹکار ہے جن پر تری دھتکار ہے جن پر
نہ اُن کی راہ پرے چل بھٹک کر رہ گئے ہیں جو　　　　ملمع کی طرح چمکے چمک کر رہ گئے ہیں جو[2]

(کیف بھوپالی)

ترے نام سے ابتدا ہے خدایا　　　　کہ تو مہرباں ہے بڑا رحم والا
ثنا، حمد و تعریف سب رب کو زیبا　　　　ہے جو سب جہانوں کا مختار و مولا
تو اے رب ہے مالک قیامت کے دن کا　　　　بڑا مہرباں اور بڑا رحم والا
فقط اک تری ہی کریں ہم عبادت　　　　تجھی سے ہی مانگیں، جو مانگیں اعانت
کہ اے رب چلا ہم کو سیدھی ڈگر پر　　　　نوازا ہے جن کو انہی کی ڈگر پر
وہ گمراہ جن پر ترا قہر ٹوٹا　　　　بچا تو ہمیں اُن سے پروردگارا[3]

(کبیر کوثر)

سورۂ فاتحہ کا لفظی منظوم ترجمہ آغا شاعر نے خوش اسلوبی اور صحت کے ساتھ کیا ہے۔ وہ دیگر منظوم تراجم کے مقابلے میں کامیاب ترین ہے اور فن شاعری پر ان کی قدرت

---

[1] ڈاکٹر عبدالحکیم۔ شرف الدین۔ قرآن حکیم کے اُردو تراجم ص ۱۰۱ [2] مفہوم القرآن (منظوم پارہ الم) از کیف بھوپالی [3] القرآن المنظوم سے مسلم پرسنل لا (شریعتِ اسلام) از کبیر کوثر

اور مہارت کی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد علمائے کرام نے ان کے منظوم ترجمہ کو سراہا ہے۔
حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں :۔

"آغا صاحب کی نظم قرآن مجید کا حاصل ادا کرنے میں اچھی نظم ہے اور پارۂ الم کے متعلق بلکہ ربع اول کے لئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آغا صاحب نے قرآنی مفہوم کو خوبی اور صحت کے ساتھ ادا فرمایا ہے۔" [1]

حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی آغا شاعر کے منظوم ترجمے پر اظہار خیال فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"افسر الشعراء آغا شاعر دہلوی مرحوم کا منظوم ترجمۂ قرآنِ کریم کا ایک پارہ اس وقت میری نظر کے سامنے ہے۔ چیدہ چیدہ مقامات کا میں نے مطالعہ بھی کیا ہے، جہاں تک ترجمہ اور اظہارِ مُدعا کا تعلق ہے، اس کے معیاری ہونے کے لئے یہی سند کافی ہے کہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا نثری ترجمہ منظوم کی اصل ہے، اور یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ نثر کا دامن جس قدر وسیع ہے اُسی قدر نظم کا دامن تنگ ہے، اسی لئے فقہا نے نظم میں ترجمے کی اجازت نہیں دی۔

مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مُسلّم ہے کہ آغا صاحب مرحوم نے شاہ صاحبؒ کے ترجمے کو جس کمال کے ساتھ نظم کیا ہے اس کی بناء پر یہ منظوم ترجمۂ قرآنِ کریم کی بہترین "ترجمانی" کہا جا سکتا ہے۔ حق تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔

بندہ — احتشام الحق تھانوی ۲۶، اپریل ۱۹۶۵ء کراچی" [2]

قرآن مجید میں بہت سی سورتوں کے شروع میں حروف مقطعہ لائے گئے ہیں مثلاً الٓمٓ۔ حٰمٓ۔ الٓمٓصٓ وغیرہ۔ جمہور صحابہ و تابعین اور علمائے امت کے نزدیک یہ حروف رموز و اسرار ہیں جس کا علم سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں اور ہو سکتا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم بطور ایک راز کے دیا گیا ہو جس کی تبلیغ اُمت کے لئے روک دی گئی ہو۔ اس لئے ان حروف کی کوئی تفسیر و تشریح نہیں کی گئی۔ آغا شاعر نے

---

[1] اور [2] نظم مقدس۔ منظوم ترجمہ قرآن مجید (الم۔ سیقول) آغا شاعر قزلباش دہلوی ص ۱۲۰

جمہور صحابہ و تابعین اور علمائے امت کے قول کو نظم کر کے حروف مقطعہ کے نئے درج ذیل شعر شامل کیا ہے اور اس کو قوسین میں رکھا ہے ؎

ایسے حروف اکثر پردے میں ہیں سراپا قرآں کی رمز ہے یہ اک بھید ہے خدا کا

ترجمہ سورۃ البقرۃ مدینہ ۸۷ — آیات ۲۸۶ رکوع ۴۰

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا۔ اس کتاب میں کچھ شک نہیں۔ راہ بتاتی ہے ڈر والوں کو جو یقین کرتے ہیں بن دیکھا اور درست کرتے ہیں بن دیکھا اور درست کرتے ہیں نماز اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں۔ اور جو یقین کرتے ہیں جو کچھ اُترا تجھ پر اور جو اُترا تجھ سے پہلے۔ اور آخرت کو وہ یقین جانتے ہیں۔ اُنھوں نے پائی ہے راہ اپنے رب کی۔ اور وہی مُراد کو پہنچے۔

اور وہ جو منکر ہوئے۔ برابر ہے تو اُن کو ڈراوے یا نہ ڈراوے وہ نہ مانیں گے۔ مُہر کردی اللہ نے اُن کے دِل پر اور اُن کے کان پر اور اُن کی آنکھوں پر ہے پردہ اور اُن کو بڑی مار ہے۔ اور ایک لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں، ہم یقین لائے اللہ پر اور پچھلے دِن پر اور اُن کو یقین نہیں۔ دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے اور کسی کو دغا نہیں دیتے مگر آپ کو اور نہیں بوجھتے۔ اُن کے دِل میں آزار ہے، پھر زیادہ دیا اللہ نے اُن کو آزار۔ اور ان کو دُکھ کی مار ہے۔

اس پر کہ جھوٹ کہتے تھے۔ اور جب کہیئے اُن کو، فساد نہ ڈالو ملک میں کہیں، ہمارا کام تو سنوار ہے۔ سُن رکھو! وہی ہیں بگاڑنے والے پر نہیں سمجھتے۔ اور جب کہیئے ان کو، ایمان میں آؤ جس طرح ایمان میں آئے سب لوگ کہیں، کیا ہم اس طرح مسلمان ہوں جیسے مسلمان ہوئے بیوقوف؟ سُنتا ہے وہی ہیں بے وقوف پر نہیں جانتے اور جب ملاقات کریں مسلمانوں سے کہیں، ہم مسلمان ہوئے۔ اور جب اکیلے جاویں اپنے شیطانوں پاس کہیں، ہم ساتھ ہیں تمہارے ہم تو ہنسی کرتے ہیں۔[1] (ترجمہ۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی)

---

[1] نظم مقدس (منظوم ترجمہ قرآن مجید) از آغا شاعر قزلباش دہلوی

منظوم ترجمہ سورۂ البقرہ (پارہ الٓمّٓ)

ہے نام سے خدا کے آغاز کا اُجالا
جو مہرباں بڑا ہے بے حد جو رحم والا
الٓمّٓ [1]
حروفِ مقطعات
(ایسے حروف اکثر [2] پردے میں ہیں سراپا)
(قرآں کی رمز ہے یہ اک بھید ہے خدا کا)
ایسی کتاب ہے یہ جس [3] میں نہیں کوئی شک
ڈرتے ہیں جو خدا سے اُن کے لئے ہے چومک
جو غیب کے ہیں قائل [4] اور ہیں نماز پڑھتے
کرتے ہیں خرچ بھی جو رب کے دیئے ہوئے سے
اور وہ جو مانتے ہیں [5] جو کچھ بھی تم پہ اُترا
ایمان اُس پہ بھی ہے جو تم سے پہلے آیا
اورآخرت پہ بھی ہے [6] جن کو یقین (پورا)
(قائل سزا جزا کے ہے رات دن کا دھڑکا)
وہ ہی تو راہ پر ہیں [7] رب کی طرف سے اپنے
پھل پائیں گے وہی تو وہ ہی فلاح والے
منکر جو ہو چکے ہیں [8] اُن کے لئے ہے یکساں
خوف اُن کو دو نہ دو تم لائیں گے وہ نہ ایماں
کان اور دل پہ اُن کے [9] اللہ کی ہیں مہریں
آنکھیں بند ہیں اُن کی بھاری عذاب جھیلیں
ایسے بھی لوگ ہیں کچھ جو [10] منہ سے ہیں یہ کہتے
قائل ہیں ہم یقیناً اللہ و آخرت کے

حالانکہ درحقیقت [11] مومن ہی وہ نہیں ہیں
(کفر و نفاق دل میں راسخ ہیں دل نشیں ہیں)
جُل دیتے ہیں خدا کو اور [12] اُن کو جو ہیں مومن
لیکن نہیں یہ دھوکا (دھوکا ہے غیر ممکن)
دراصل دے رہے ہیں [13] آپ کو اپنے دھوکا
لیکن نہیں سمجھتے (یہ پھیر ہے سمجھ کا)
پہلے ہی روگ [14] اُن کے دِل میں بھرا ہوا تھا
پھر اور بھی خدا نے اُس روگ کو بڑھایا
بھاری عذاب [15] اُن پر اُس جھوٹ کی سزا ہے
(ایسا عذاب ہوگا جو درد سے بھرا ہے)
اور جب کہا ہے [16] اُن سے جھگڑو نہ تم زمیں پر
کہتے ہیں ہم تو خود ہی اصلاح کے ہیں خوگر
سُن لو وہی ہیں [17] مفسد وہ ہی تو ہیں فسادی
لیکن نہیں سمجھتے (اوندھی سمجھ ہے اُن کی)
اور جب کہا ہے [18] اُن سے ایمان لاؤ تم بھی
جیسا کہ اور لائے (کی بندگی خدا کی)
تو [19] کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان ایسا لائیں
جس طرح چند احمق (پھندے میں پھنس گئے ہیں)
سُن لو وہی ہیں احمق [20] پر جانتے نہیں ہیں
(اپنی حماقتوں کو پہچانتے نہیں ہیں)
جب مومنوں سے اُن کی [21] ہوتی ہیں چار آنکھیں
تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لا چکے ہیں

لیکن (جب اپنی ٹکڑی ملتی ہے اُن کو) تنہا[22]
کہتے ہیں (مرتے مرتے بھی) ساتھ ہے تمہارا[23]

شیطانوں سے وہ اپنے ملتے ہیں جب کسی جا
(اُن کو بناتے تھے ہم کہتے تھے اُن سے ٹھٹھا[1]

(آغا شاعر)

کتابِ مستند ہے یہ نہیں ہے کوئی شک اس میں
ذرا سا بیش و کم ہوگا نہ ہرگز حشر تک اس میں

یہ قندیلِ ہدایت ہے خدا کے نیک بندوں کو
دوائے کارگر بخشی گئی ہے دردمندوں کو

خُدا کے نیک بندے اپنی یہ پہچان رکھتے ہیں
کہ بِن دیکھے ہوئے وہ "غیب" پر ایمان رکھتے ہیں

وہ اپنے آپ کو پابند رکھتے ہیں نمازوں کا
یہی تو ہے علاجِ دردمندی پاکبازوں کا

خُدا کی دی ہوئی دولت برابر خرچ کرتے ہیں
نہ تنہا جیب بھرتے ہیں نہ تنہا پیٹ بھرتے ہیں

وہ اِس قرآن کی آیات بھی برحق سمجھتے ہیں
گزشتہ ساری تعلیمات بھی برحق سمجھتے ہیں

یقیں رکھتے ہیں کامل آخرت کی زندگی پر وہ
کبھی نازاں نہیں ہوتے حیاتِ عارضی پر وہ

یہی وہ لوگ ہیں جو مہرِ عالم تاب ہیں بے شک
خُدا کی سمت سے پورے ہدایت یاب ہیں بے شک

یہی وہ لوگ ہیں جو کامیاب و کامراں ہوں گے
یہاں بھی شادماں ہوں گے وہاں بھی شادماں ہوں گے

سراپا کفر ہیں جو کفر ہی سے پیار ہے اُن کو
سدا انکار ہے انکار ہے انکار ہے اُن کو

برابر ہے تمہارا اُن کو سمجھانا نہ سمجھانا
کہ ناممکن ہے اُن افراد کا ایمان لے آنا

خُدا کے قفل ہیں اُن کے دِلوں پر اور کانوں پر
حقیقت کی تجلی بند ہے اُن بدگمانوں پر

بُرے اندھے ہیں وہ پردے پڑے ہیں اُنکے دیدوں پر
بہت بے فکر بیٹھے ہیں نہ جانے کن اُمیدوں پر

بڑی بھاری بڑی اونچی سزا پائیں گے وہ اِک دن
خود اپنے "کارناموں" کا صلہ پائیں گے وہ اِک دن

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو فقط باتیں بناتے ہیں
نہایت شان سے ایمان کا نعرہ لگاتے ہیں

وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں خُدا پر بھی
ہمارا مستقل ایمان ہے روزِ جزا پر بھی

مگر ذرّہ برابر صاحبِ ایماں نہیں ہیں وہ
شریکِ کاروانِ آبلہ پایاں نہیں ہیں وہ

خُدا پہچانتا ہے خُوب ایسے خود پسندوں کو
کہ دھوکا دے رہے ہیں وہ خُدا کو اور بندوں کو

حقیقت میں بذاتِ خود ہی دھوکا کھا رہے ہیں وہ
بھرم اپنا زمانے بھر میں کھوتے جا رہے ہیں وہ

---

[1] نظم مقدس (منظوم ترجمہ قرآن مجید) از آغا شاعر قزلباش دہلوی

مگر کچھ بھی نہیں احساس اُن کو وائے نادانی
نہ دُنیا کی پشیمانی، نہ عقبیٰ کی پشیمانی

بسی ہے روگ بن کر اُن کے دل میں یہ ریاکاری
بڑھا دی ہے خُدا نے ایسے بیماروں کی بیماری

بڑی موذی بڑی قاتل سزا پائیں گے وہ اِک دِن
خُود اپنے کارناموں کا صِلہ پائیں گے وہ ایک دن

وہ جھوٹے اور دھوکے باز ہیں یعنی منافق ہیں
نہ اِس دنیا کے لائق ہیں نہ اُس دُنیا کے لائق ہیں

کہا جاتا ہے جب اُن سے کہ تم پُرامن بن جاؤ
خدا کی اِس زمیں پر تم نئے فتنے نہ پھیلاؤ

تو کہتے ہیں کہ ہم اصلاح کرتے ہیں بُرائی کی
بڑی ہی فکر ہے گویا انھیں ساری خدائی کی

خبر رکھنا! کہ سب فِتنے یہی ظالم اُٹھاتے ہیں
زمیں کو دوسروں کے واسطے دوزخ بناتے ہیں

مگر کچھ بھی نہیں احساس اُن کو وائے نادانی
نہ دُنیا کی پشیمانی ، نہ عقبیٰ کی پشیمانی !

کہا جاتا ہے جب اُن سے کہ تم انسان بن جاؤ
اِنھیں ایمان والوں کی طرح ایمان لے آؤ

تو کہتے ہیں کہ ہم کیا اس طرح ایمان لے آئیں
بہت سے بے وقوفوں کی طرح مشکل میں پڑ جائیں

حقیقت میں اُنھیں کی بے وقوفی پائی جاتی ہے
کہ اُن کے نام سے انسانیت شرمائی جاتی ہے

مگر کچھ بھی نہیں احساس، اُن کو وائے نادانی
نہ دُنیا کی پشیمانی، نہ عقبیٰ کی پشیمانی

اگر وہ شمعِ ایمانی کے پروانوں سے مِلتے ہیں
خُدا کے نیک بندوں یعنی مسلمانوں سے ملتے ہیں

تو کہتے ہیں کہ سچّائی پہ ایماں لا چکے ہم بھی
اندھیرے سے نِکل کر روشنی میں آچکے ہم بھی

مگر چُھپ چُھپ کے جب وہ اپنے "آقاؤں" سے مِلتے ہیں
"حضوروں" سے "خداوندوں" سے "داتاؤں" سے مِلتے ہیں

تو کہتے ہیں کہ ہرگز بھی مسلمانوں میں مت سمجھو
تمہارے ساتھ ہیں ہم، ہم کو بیگانوں میں مت سمجھو

بھلا ہم دوستی رکھتے ہیں کب مظلوم لوگوں سے
فقط اِک دِل لگی کرتے ہیں اُن معصوم لوگوں سے[1]

(کیفؔ بھوپالی)

آیات ۱۔تا (پارہ الٓمٓ) سورہ (۱) البقرہ

ترے نام سے ابتدا ہے خدایا
کہ تو مہرباں ہے بڑا رحم والا

بلاشک یہ قرآں ہے رب کا صحیفہ
ہدایت ہے اُن کو جنھیں ڈر ہے رب کا

وہ جو غیب پر اپنا ایمان لائے
نمازوں کو افضل جو ہر شے سے سمجھے

[1] مفہوم القرآن (منظوم ترجمہ پارہ الم) از کیف بھوپالی

بفضلِ خدا اُن کو جو بھی ملا ہے
اُسے خرچ راہِ خدا میں کیا ہے

نزولِ قرآنی کو برحق جو سمجھے
ہے اُس پر بھی ایمان اُترا جو پہلے

حقیقت جو روزِ قیامت کو سمجھے
خدا کو بھی پایا مرادوں کو پہنچے

جو منکر ہوئے ہیں نہ سمجھیں گے ہرگز
ڈرانے سے تیرے نہ مانیں گے ہرگز

خدا نے کیا بند کانوں کو اُن کے
لگائی ہے اِک مُہر بھی اُن کے دل پے

نگاہوں پہ اُن سب کی پردہ پڑا ہے
کہ قسمت میں اُن کی عذابِ خدا ہے

بہت سے منافق تو ایسے ملیں گے
"یقیں ہے خدا پر" یہ سب ہی کہیں گے

"ہے ایماں قیامت کے دِن پر ہمارا"
حقیقت میں لیکن یہ دھوکہ ہے سارا

یقیں اُن کو ہرگز نہیں ہے خدا پر
فریب و دغا ہے یہ رب سے سراسر

وہ کیا دیں گے ایمان والوں کو جھانسہ
خود اپنے کو لیکن وہ دیتے ہیں دھوکہ

سمجھنے کی کوشش میں بہکے ہوئے ہیں
سلجھنے کی کوشش میں اُلجھے ہوئے ہیں

دِلوں میں جو آزار پہلے تھا اُن کے
بڑھایا ہے کچھ اور اُس کو خدا نے

سزا دی ہے اُن کو دُکھوں کی خدا نے
یہ تاواں ہے اس کا کہ بچتے تھے حق سے

"اُٹھاؤ نہ فتنہ" کہا جب یہ اُن سے
"بھلائی کی خاطر ہے یہ سب" وہ بولے

اُنھی کی یہ فتنہ طرازی ہے سُن لو
سمجھتے نہیں ہیں وہ جو نیک و بد کو

کہا جب یہ اُن سے کہ ایمان لاؤ
بہت آگئے ہیں اِدھر، تم بھی آؤ

تو کہنے لگے ہم نہ ہوں گے مسلماں
کہ ناداں ہیں سارے کے سارے مسلماں

تو سُن لو کہ یہ لوگ ہیں خود ہی ناداں
شعورِ خدا سے ہوئے ہیں یہ انجاں

مسلماں سے ہوگی جو مڈبھیڑ اُن کی
تو کہہ دیں گے ایمان والے ہیں ہم بھی

اکیلے جو ملتے ہیں فتنہ گروں سے
تو کہتے ہیں اُن سے کہ "ہم ہیں تمھارے"

مسلماں سے ہم تو ہنسی کر رہے تھے
ہنسی اُن کی لیکن اُڑائی ہے رب نے

شر اُن کے بڑھائے کہ بہکے رہیں وہ
رہِ سرکشی میں ہی بھٹکے رہیں وہ

خریدی نہ راہیں یہ وہ ہیں جنھوں نے
مگر گمرہی کو خریدا انھوں نے

منافع نہ دے کچھ وہ سوداگری کیا　　نہ لائے جو منزل پہ وہ رہ روی کیا[1]

(کبیر کوثر)

متعدد علمائے کرام نے آغا شاعر کے منظوم ترجمہ پر جو اظہار خیال فرمایا ہے وہ گذشتہ صفحات میں آپ کی نظر سے گذر چکا ہے۔ ان علمائے کرام نے جن میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی شامل ہیں کوئی تجزیہ یا تنقیدی رائے پیش نہیں کی ہے۔ بلکہ اپنے دوستانہ فرائض اور اخلاقی تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ جس طرح آغا شاعر نے یہ کام ازراہ خلوص کیا اور اس کوشش کا سب سے بڑا محرک ان کی نیک نیتی اور جذبۂ خدمت تھا اسی طرح مذکورہ علمائے کرام نے جو اظہار خیال فرمایا ہے وہ اجمالی حیثیت کا حامل ہے۔ ظاہر ہے کہ راقم الحروف کا بھی یہ مقام نہیں ہے کہ وہ قرآن کے منظوم تراجم پر کوئی علمی حیثیت سے رائے دے لیکن بہ اعتبار بیان کچھ عرض کیا جا سکتا ہے۔

قرآن حکیم کے ترجمے کو نظم کرنے میں قدم قدم پر انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔ قرآنِ پاک کے ترجمے کو نظم کا جامہ پہنانے اور دیگر تخلیقی ادب کو منظوم کرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اول الذکر کے تقاضے کچھ اور ہیں اور موخر الذکر کے تقاضے کچھ اور۔ دیگر منظوم تراجم کے مقابلے میں یہ کام نہایت احتیاط اور ذمہ داری کا حامل ہے اور اسی لئے دشوار کُن بھی ہے۔ قدم قدم پر شاعر کو قرآنِ پاک کا تقدس اور یہ احساس گھیرے رہتا ہے کہ یہ کلام الٰہی ہے۔ اس لئے ہر امر کو وہ سو سو بار دیکھتا ہے کہ کہیں کوئی غلطی سرزد نہ ہو جائے، کہیں مفہوم بدل نہ جائے۔ نثر کو نظم کرنے میں ویسے بھی بہت سی دشواریوں اور مجبوریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ نظم کے کچھ قواعد اور اصول ہوتے ہیں۔ شعر کے فنی تقاضوں اور بحر و قافیہ کی پابندیوں کے ساتھ بعض دشوار ترین عبارتوں اور مضامین کو خوش اسلوبی اور صحت کے ساتھ نظم کے قالب میں ڈھالنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ آغا شاعر خود فرماتے ہیں کہ اس نظم (منظوم ترجمہ) میں حتی الوسع لفظی معنی کا لحاظ رکھا گیا ہے اس لئے بعض مقام پر قافیے کی قید میں صرف حرف روی کا خیال رکھا گیا ہے۔

---

[1] ماہنامہ 'پاکیزہ آنچل' (دہلی) ۲۰ر فروری ۱۹۸۹ء

اس مقدس کام میں شاعر کا اصل مقصد مقدس کلامِ ربِ جلیل کے ترجمے کو حتی الوسع نہ صرف خوش وضع اور آسان نظم کا جامہ پہنانا ہے بلکہ لطفِ زبان کے ساتھ لفظی ترجمے کی بھی احتیاط سے پابندی کرنی ہے۔ اس لئے شعری محاسن کے مقابلے میں شاعر کی تمام تر توجہ قرآنِ مجید کے معانی و مطالب کو نظم کی طرف زیادہ ہوتی ہے۔ قرآنِ پاک کے جو ترجمے بڑے بڑے علمائے کرام نے کئے ہیں ان کا پیرایۂ بیان مختلف ضرور ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک معانی و مطالب کا تعلق ہے سب کا مفہوم ایک ہے۔ یہی صورت قرآنِ مجید کے منظوم تراجم میں نظر آتی ہے کہ ایک ہی امر کو شاعر نے اپنے اپنے انداز خاص سے نظم کیا ہے مگر معانی و مفہوم کے اعتبار سے سب کا مطلب ایک ہے۔ اس مقدس کتابِ الٰہی کے منظوم ترجمے میں دوسرے ابیات کی طرح شعری محاسن تلاش کرنا بے سود ہے۔ بلکہ اس میں دیکھنا یہ ہے کہ قرآنِ مجید کے اردو ترجمے کے متن کو کس نے نہایت خوش اسلوبی اور صحت کے ساتھ نظم کیا ہے۔

آغا شاعر نے حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلویؒ کے ترجمۂ قرآنِ مجید کو نظم کرنے میں حتی الوسع لفظی معانی کا خیال رکھا ہے اور عام فہم اور آسان زبان استعمال کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ آغا شاعر خود فرماتے ہیں کہ ان کے نزدیک تو صرف کلامِ خدا کے ظاہری مطالب ہی کو اپنی زبان میں اُسی سیاق سے ادا کر دینا جہادِ اکبر کا حکم رکھتا ہے۔ انھوں نے بہ کمال اہتمام قرآن پاک کے مفہوم کا پابند رہتے ہوئے ترجمہ کو نظم کیا ہے۔ منظوم ترجمے میں اندازِ بیان میں سادگی اور سلاست کے ساتھ روانی بھی پائی جاتی ہے۔ بعض مقامات پر سیاق عبارت الٰہی کی پیروی میں جو مشکلات آئی تھیں، اس کے پیشِ نظر حضرت خواجہ حسن نظامیؒ نے انھیں منظوم ترجمے کے ساتھ نثر کا ترجمہ بھی شامل کرنے کی صلاح دی تھی۔ اس لئے منظوم ترجمے کی اشاعت میں انھوں نے خواجہ صاحب کے مشورہ پر عمل کیا ہے۔

"نظم مقدس" کے صفحات کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک جانب قرآنِ مجید کی عربی آیات اور اس کے نیچے حضرت شاہ عبد القادرؒ محدث دہلوی کا نثری ترجمہ ہے۔ اس کے عین مقابل منظوم ترجمہ دیا گیا ہے اور ہر شعر پر نمبر شمار ہے۔

کیفی کوثر نے بھی حضرت شاہ عبد القادرؒ کے ترجمۂ قرآنِ حکیم کو نظم کرنے میں حتی الوسع لفظی

ترجمہ کا لحاظ رکھا ہے۔ ان کا منظوم ترجمہ بھی نہایت صاف، رواں، سلیس اور قابلِ فہم ہے۔
جہاں تک کیفؔ بھوپالی کے منظوم ترجمہ کا تعلق ہے انھوں نے لفظی ترجمہ کے بجائے اصل ترجمہ کے مفہوم کی ادائیگی پر پوری توجہ مبذول کی ہے۔ اسی لئے ان کا منظوم ترجمہ، ترجمہ کی حدود سے نکل کر منظوم تفسیر کے زمرہ میں داخل ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اپنے ترجمے کے بارے میں وہ خود فرماتے ہیں کہ "یہ اشعار قرآن حکیم کا لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں ہیں بلکہ کلام الٰہی کے ترجمے کے مفہوم ادا کرنے کی ایک ناچیز کوشش ہے۔"[۱]

آغا شاعرؔ کی قرآن کے منظوم ترجمے کی مساعی جمیلہ اس معنی میں بھی قابلِ تعریف ہے کہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی طرف سے بالعموم اس طرح کے سنجیدہ موضوعات پر توجہ نہیں دی جاتی اور ایسے کاموں میں جس احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس سے عہدہ برآ نہیں ہوتے۔ آغا شاعرؔ کا یہ منظوم ترجمہ ان کی ایک مخلصانہ کوشش ہے۔ منظوم ترجمے کے ساتھ ساتھ اس کے دوسرے مفید طلب پہلوؤں پر بھی غور کیا جاسکتا ہے۔ دہلوی نثر کا جو اثر اس طرح منظوم کارناموں پر مرتب ہوسکتا تھا اس کا اظہار بھی اس سے ہوسکتا ہے۔ آغا شاعرؔ کی زبان، ان کا اندازِ بیان، ان کے محاورے، روزمرہ اور علمی گفتگو کے انداز کو اس ترجمہ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ ان کے مطالعہ کا ایک مفید طلب پہلو قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس منظوم ترجمہ کی بنیاد حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کے ترجمہ پر رکھی گئی ہے اس لئے یہ مزید اہمیت کا حامل ہے۔ آغا شاعرؔ نے بڑی جانفشانی سے اس مقدس کام کو انجام دیا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ اگر یہ "نظم مقدس" مسلمانوں کا وظیفہ ہوگیا تو میں سمجھوں گا میری محنت ٹھکانے لگی، اور دنیا کے سامنے ایک حیرت ناک خزانے کا دروازہ کھول کر شاداں و فرحاں رخصت ہو جاؤں گا۔" ان کی زندگی میں مکمل قرآن مجید کا منظوم ترجمہ شائع نہ ہوسکا مگر اب کراچی (پاکستان) سے حسنِ طباعت سے آراستہ ہوگیا ہے۔

---

[۱] مفہوم القرآن۔ منظوم پارہ الم۔ کیفؔ بھوپالی۔ گذارش اول ص ۵

جوش ملیح آبادی کی شاہکار نظم

نظام فطرت سے صداقت محمدیؐ پر استدلال

شاعر جب ایمان ویقین کی روشنی میں نظام فطرت کا گہرا مطالعہ کرتا ہے تو اسے اس کارخانہ ہستی میں رسالت محمدی ﷺ کی صداقت کے کھلے دلائل نظر آتے ہیں۔ لیکن جب وہی شاعر انکارِ الوہیت کے تصور میں ڈوب کر اس زمین وآسمان کے عجائبات پر غور کرتا ہے تو وہ اس گمراہ کن نتیجہ پر پہنچتا ہے۔

مہمل ہیں یہ لفظیں، یہ برا ہے، یہ بھلا ہے
جو کچھ ہے وہ صرف ایک تبسم کی ضیا ہے
(جوش)

اردو نظم ونثر میں رسولِ امین صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر نظام فطرت سے جو پرزور استدلال جوش ملیح آبادی کے ہاں ملتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ غور کیجئے۔

بہت سے گذرے ہیں توں توانساں، خرد کی شمعیں جلانے والے
بتوں کی ہیبت اٹھانے والے، خدا کا سکہ بٹھانے والے
مگر عرب کے خموش افق سے کرن وہ پھوٹی رسول بن کر
کہ جتنے ظلمت کے خاروخس تھے دہک اٹھے سرخ پھول بنکر
ابھی تک انکار پر مصر ہے، دماغ مختل ہے کافری کا
نظام قدرت سے ہے نمایاں ثبوت اس کی پیمبری کا
کوئی نظیر اس کی مل سکے گی؟[1] کہ آگ پانی سے جل سکی ہے
زمین چھٹکا سکی ہے تارے؟ چٹان موتی اگل سکی ہے
کبھی کوئی جنس اپنی ضد کی طرف بتادو اگر پھری ہے؟
کلی سے شعلے کبھی اٹھے ہیں؟ شرر سے شبنم کبھی گری ہے

[1] تضاد سے استدلال

بھلا یہ ممکن ہے ،کذب پر ہو مدار اِک دین مستقل کا؟
گراں بہا وقت کی جبیں پر نشان ہو اک پائے مضمحل کا
دروغ اور یہ فروغ پائے، دلوں پہ حاصل ہو بادشاہی
اور اس کی حقانیت پہ صدیوں کروڑوں انسان دیں گواہی
یہ ہم نے مانا کہ جھوٹ کو بھی فروغ ہوتا ہے لیکن اتنا
سبک شگوفوں سے چھیڑ کرتا، گذر گیا اِک ہوا کا جھونکا
مگر وہ ہستی جو آج لاکھوں خدا کے بندوں کی حرزِ جاں ہے
وہ محض اِک شعبدہ ہو ناداں! بتا فراست تیری کہاں ہے
پس ان دلائل کی روشنی میں ضرور یہ ماننا پڑے گا
کہ ہے پیام خدائے برتر، پیامِ پیغمبرِ عرب کا
سنے ہوئے اس پیامِ حق کو اگرچہ صدیاں گذر چکی ہیں
بہت سی قومیں ابھر کے ڈوبیں، ہزاروں جی جی کے مر چکی ہیں
مگر حروف اسکے ہیں کہ اب تک اسی طرح سے جھلک رہے ہیں
ہر ایک نقطے میں زندگی کے ہزاروں شعلے بھڑک رہے ہیں
کبھی تو کر غور اپنے جی میں کہ اس روشنی میں یہ[1] بات کیوں ہے؟
اگر یہ شئے عین حق نہیں ہے تو پھر یہ رنگِ ثبات کیوں ہے؟
اگر یہ مصحف نہیں تو ہاتھوں پہ کیوں مشیت لئے ہوئے ہے؟
اگر غلط ہے تو کیا خدا کا جلال سازش کئے ہوئے ہے؟
عرب وہ ریگِ رواں کا عالم، سراب، ہولناک دنیا
وہ سرخ ذرّات کا سمندر، تپش کا وہ خوفناک صحراء
حدود امن وا ماں سے باہر، لباس شائستگی سے عاری
گرج سے افلاک زلزلے میں، کڑک سے لرزاں[2] زمین ساری

[1] لازوال ہونے سے استدلال [2] رنگ ثبات سے استدلال [3] یتیمی سے استدلال

یہ ملک اور اک یتیم بچہ نہ کوئی وارث نہ کوئی والی
سرہانے اک پیر سال خوردہ، رسید صد ضعف وخستہ حالی
نہ باپ سر پہ، نہ ماں کا سایہ، بلا نصیب وستم رسیدہ
مقام حیرت کا رہنے والا، نہ شاد فرحاں نہ آبدیدہ
کتاب سے نابلد معری فیضِ تعلیم وتربیت سے
کھلیں جو آنکھیں تو بند پائی ہر راہ شش جہت سے
پلا ہو بے باپ کا جو بچہ عرب میں اور پھر اس ابتری[1] سے
اگر پیمبر نہیں تو واقف ہوا وہ کیونکر پیمبری سے؟
اگر صدا اس نبی اُمی کی آسمانی صدا نہیں ہے
تو پھر کہاں سے یہ فیض پہنچا؟ جواب اس بات کا نہیں ہے
عرب[2] کے ہیرو، عجم کے سلطاں، نظامِ ارض وسما کے والی
زمیں پہ لطف وکرم کی تونے عجب بنائے لطیف ڈالی
چلا جو دوشِ صبا پہ تیرا پیام اَبر بہار بنکر
تمام باطل کے سنگریزے مہک اٹھے برگ وبار بنکر
مشیت ایزدی کے دل سے بنا ہے شاید دماغ تیرا
وگرنہ کیوں طاقِ بادِ صَرصَر میں جل رہا ہے چراغ تیرا
دبے ہیں سینے میں زندگی کے بہت سے جوہر ابھرنے والے
اِدھر بھی ہاں اک نظر خدارا، دلوں کے بیدار کرنے والے
صلی اللہ علیہ وسلم
(نظم پیغمبر اسلام شعلہ وشبنم صفحہ ۲۴۸)

[1] وَوَجَدَكَ ضَالاً کی طرف اشارہ ہے [2] امی ہونے سے استدلال [3] پیغام رحمت سے استدلال

خانہ جنگی کا عذاب اور دعاء رسولؐ کی واپسی

خدا تعالیٰ نے مشرکین مکہ کو اپنے عذاب سے ڈراتے ہوئے سورۃ انعام (۶۵) میں فرمایا قل ھو القادر علی ان یبعث علیکم عذاباً من فوقکم او من تحت ارجلکم او یلبسکم شیعا ویذیق بعضکم باس بعض، انظر کیف نصرف الایات لعلھم یفقھون

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! تم اعلان کردو کہ وہ خدا اس بات پر قادر ہے کہ تمہیں تمہارے برے اعمال کی وجہ سے اوپر کی طرف سے عذاب نازل کرے یا تمہارے پیروں کے نیچے سے عذاب بھیجدے یا تمہیں مختلف گروہوں میں اکھٹا کر کے اور پھر ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ساتھ برسرپیکار کر کے آپسی جنگ کا مزا چکھائے، غور کرو! ہم کس طرح اپنی آیات اور دلائل کو مختلف پیرایوں سے بیان کرتے ہیں۔

صحاح کی احادیث میں آتا ہے کہ جب یہ تنبیہ اور دھمکی نازل ہوئی تو حضور علیہ اسلام نے پہلے دو فقروں پر پناہ مانگتے ہوئے فرمایا، اعوذ بوجھک، میں پناہ طلب کرتا ہوں اس عذاب سے اے پروردگار تیری ذات پاک کی لیکن تیسرے فقرہ اور باہمی خانہ جنگی کے عذاب کی دھمکی پر فرمایا۔ ھذا اھون و ایسر ہاں یہ صورت آسان اور ہلکی ہے حضرت جابر راوی فرماتے ہیں۔

وان استعاذہ لاعاذہ، رسول پاک اگر اس تیسری قسم کے عذاب سے پناہ مانگ لیتے تو اس سے بھی پناہ مل جاتی، لیکن حضرت جابر نے یہ بات نہیں سمجھی کہ حضور اس وقت اس سے پناہ مانگتے جب خدا کی طرف سے اشارہ ہوجاتا چنانچہ مشیت الٰہی کچھ اور تھی جسکی تشریح آگے آرہی ہے۔

رسول پاک نے اس تیسری قسم کے عذاب کو اس لحاظ سے ہلکا فرمایا کہ اس میں معذب قوم کی مکمل ہلاکت کی صورت نہیں بلکہ قوم کا وجود باقی رہتے ہوئے طرح طرح کی بربادیاں پیدا ہوتی ہیں۔

حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک روز مسجد نبوی میں آیت مذکورہ پر تقریر کرتے ہوئے تیسری صورت عذاب کے بارے میں فرمایا۔

ھذا اسوۃ الثلاثہ یہ ان تین صورتوں میں سب سے زیادہ بری صورت ہے، ابن

مسعود نے اس پہلو پر نظر رکھی کہ تباہی اور بربادی کا سلسلہ ایک مرتبہ ہی ہلاکت کے مقابلے میں زیادہ تکلیف دہ ہے، اس طرح حضرت عبد اللہ نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ کہیں حضورؐ کے الفاظ (اھون و ایسر) سے لوگوں پر یہ اثر نہ پڑے کہ خانہ جنگی کا عذاب معمولی سزا ہے اور معمولی بات ہے۔ اس لئے ابن مسعود نے بدترین عذاب کہہ کر اس غلط فہمی کا دروازہ بند کیا:

عذاب فوق!

اوپر کی طرف سے عذاب سے طوفانی ہواؤں اور طوفانی بارش کی طرف اشارہ ہے جس سے قوم عاد ہلاک کی گئی اور قوم لوط پر زلزلہ کے ساتھ اوپر سے پتھراؤ بھی ہوا۔

عذاب تحت!

نیچے کے عذاب سے پانی کا سیلاب، زلزلہ اور زمین دھنسنے کا عذاب مراد ہے
پانی کے سیلاب میں قوم نوح ہلاک ہوئی، زلزلہ کے عذاب میں قوم ثمود برباد ہوئی، زمین دھنسنے کے عذاب سے قارون ہلاک ہوا۔

آیت پر اشکال!

اس آیت کے تیسرے جزء (اختلاف) پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ پہلے دونوں طریقے خدا تعالیٰ کے فعل سے تعلق رکھتے ہیں یعنی فضاء آسمانی سے ہلاکت کا نزول ہو یا زمین ہی سے ہلاکت کی کوئی صورت پیدا ہو جائے، یہ دونوں صورتیں قدرت خداوندی ہی سے تعلق رکھتی ہیں لیکن تیسری صورت کا تعلق انسانی فعل سے ہے اور اللہ تعالیٰ اسے بھی اپنا فعل قرار دے رہا ہے۔

اس کا جواب اسی مشہور اسلوب قرآنی کے ذریعہ دیا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ قانون فطرت کو اپنا فعل قرار دے رہا ہے۔

چنانچہ تیسرے فقرہ کا مطلب خیز ترجمہ یہ ہوگا۔

''یا ایسا ہو کہ تم گروہ در گروہ ہو کر آپس میں لڑ پڑو اور ایک گروہ دوسرے گروہ کی شدت کا مزا چکھے''

باساء کے لفظ کا ترجمہ تینوں شاہ صاحبان سے جنگ اور لڑائی کیا ہے، اور جرجانی نے ''رنج'' یعنی پریشانی اور مصیبت، کے لفظ سے ترجمہ کیا ہے، مولانا آزاد نے شدت (سختی اور غلو پسندی) کا لفظ رکھا ہے جو آیت کے حقیقی مطلب سے بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔

قرآن کریم کی دوسری آیات میں باس کے لفظ کے ساتھ بطور تشریح ضراء کا لفظ لایا گیا ہے یعنی حالات کی سختی اور پریشانی

مستھم الباسا و الضراء (البقرہ ۲۱۴) فاخذ تاھم بالباساء و الضراء (انعام ۴۲)

سورۃ حج میں فقیر کی صفت بتایا گیا ہے، یعنی و اطعمو البائس الفقیر (حج ۲۸)

کھلاؤ برے حال اور سختی میں گرفتار محتاج کو،

البتہ البقرہ (۱۷۷) میں یہ لفظ دو جگہ آیا ہے اور دونوں جگہ الگ الگ معنی لیے جاتے ہیں،

والصاید ین فی الباساء و الضراء وحین الباس

جو لوگ صبر کرتے ہیں سختی اور پریشانی میں اور جنگ کے وقت میں

حاصل یہ کہ باہمی اختلاف (دینی ہو یا قومی اور خاندانی) کی شدت اور معاندانہ غلو پسندی ہلاکت کا سبب بنتی ہے اور یہ قانون فطرت ہے،

اختلاف کی شدت سے قوم میں انتشار اور نفرت پیدا ہوتی ہے اور شاعر نے بتایا ہے،

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزاء کا پریشاں
ہونا،

غالب نے ایک شعر میں عناصر کے اعتدال اور بے اعتدالی کی بات کہی ہے،

خدا تعالیٰ ''اتفاق اور اتحاد قائم رکھنے کی ہدایت کرتا ہے کیونکہ اتفاق زندگی ہے

واعتصموا بحبل للہ جمیعا ولا تفر قوا (آل عمران ۱۰۳)

اللہ کی رسی (دین حق) کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور آپس میں اختلاف پیدا نہ کرو

اسی کے ساتھ قران نے کہا کہ خاندانوں اور قبیلوں کا اختلاف ایک فطری ضرورت ہے اور اس کا مقصد آپسی پہچان ہے (حجرات ۱۳) اور یہ اس وقت تک ہے جس وقت تک اختلاف میں اعتدال رہے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اختلاف امتی رحمۃ (حدیث) میری امت میں مذہبی اختلاف رحمت ہے اس

اختلاف (فروعی) میں جب شدت پیدا ہوتی ہے تو یہ زحمت بن جاتا ہے

دین اور خاندانوں کے باہمی اختلاف کے یہ فطری حدود ہیں، اسلام اسکی اجازت دیتا ہے، لیکن یہ اختلاف حسد اور کبر نفس کے حدود میں داخل ہو جائے اور مذہب اور برادریوں کے نام پر ایک دوسرے کا خون بہانا شروع کر دے اسلام اسے عذاب الٰہی کی صورت قرار دیتا ہے

اوران اختلافات کے قائدین وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین برحق کے ڈنکے کو توڑ پھوڑ کر ہزاروں ڈھپلیاں بنالی ہیں،

دین حق کا ایک ڈنکا تھا، امت محمدیہ کا ایک ڈنکا تھا جو کملی والے آقا، نے بجایا، شاعر کہتا ہے

توحید کا ڈنکا عالم میں بجوادیا کملی والے نے

امت کے لئے عذاب سے حفاظت!

اس معاملہ میں ایک پیچیدہ سوال یہ پیدا ہو گیا کہ حضور نے عذاب کی جس تیسری قسم (خانہ جنگی اور باہمی اختلاف) کو ہلکا فرمایا اس سے اپنی امت کو محفوظ رہنے کی دعاء کی مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعاء منظور نہیں کی گئی، واپس کردی گئی۔

اپنی امت کے لئے اس سزا سے محفوظ رہنے کی دعاء سے حضور نے یہ بات بھی واضح کردی کہ اهون وایسر کہنے کا مطلب قبول کرنا نہیں بلکہ پہلی دو دعاؤں کے مقابلے میں اسے ہلکا کہنا مقصود ہے،

ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی تصریح (وما ینطق عن الهوٰی) کے مطابق حضور کی زبان پر امت کی حفاظت کے لئے دعا خدا کی اجازت سے جاری ہوئی پھر اسے نامنظور کیوں کر دیا گیا؟

پہلے اس روایت پر غور کرو

ایک روایت معاذ ابن جبل کی یہ ہے

معاذ کہتے ہیں، میں حضور کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں میں بھی آپ کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

یہ نفل نماز تھی جو آپ رات کو ادا کر رہے تھے، بعض روایات میں ہے کہ حضورؐ نے آٹھ

رکعات پڑھیں اور بہت لمبی نماز پڑھی معاذ کہتے ہیں،

قلت یا رسول اللہ، قد صلیتَ صلاةً طویلہ، فقال انی صلیت موھبة ورغبة حضور آج تو آپ نے بہت لمبی نماز پڑھی؟ آپ نے فرمایا ہاں، مجھ پر کبھی خوف کی کیفیت طاری ہوئی اور کبھی رحمت وامید کی کیفیت میری یہ نماز مکمل نماز تھی، پھر میں نے اس نماز کے بعد دعا کی

انی سالت للہ عزوجل ثلاثا، فاعتانی اثنین و منعنی واحدة سألتہ ان لا یھلک امتی غرقا فاعطانی، وسالتہ ان لایظھر علیھم عدوا لیس منھم فاعطا نیھا وسألتہ ان لایحل باسھم بینھم فردھا علی،

میں نے سوال کیا کہ میری امت سیلاب وغرقابی کے عذاب سے محفوظ رہے یہ دعا منظور کرلی گئی۔

میں نے یہ دعا کی میری امت پر باہر کا کوئی دشمن مسلط نہ ہوا سے بھی قبول کرلیا گیا، پھر میں دعا کی کہ میری امت فرقہ بندی اور گروہ بندی کی تباہی سے محفوظ رہے، یہ دعا واپس کردی گئی اس روایت کی اہمیت کے پیش نظر علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس روایت کو تمام طریقوں اور تمام سندوں کے ساتھ پندرہ بڑے بڑے صحابہ سے روایت کیا ہے

باہمی اختلافات کی تباہی سے آگاہ کیا گیا:

خداتعالیٰ کی طرف سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کرنے کا اشارہ کیا گیا اور پھر کھلے طور پر اس دعا کو نامنظور کردیا گیا تو اس میں یہ مصلحت پوشیدہ تھی کہ مسلمانوں کو آپسی اختلافات کی شدت کی برائی کے ہولناک نتائج کا پوری طرح احساس رہے اور مسلمان یہ سمجھیں کہ باہمی معاندانہ اختلافات اور حاسدانہ گروہ بندیاں اس درجہ تباہ کن فطری اثرات اور طبعی ہولناک نتائج رکھتے ہیں کہ دعا رسول پاک بھی اس فطری قانون سے امت کو محفوظ نہیں رکھ سکی۔ پھر یہ احساس مسلمانوں کو اختلافات کی شدت سے محفوظ رکھے اور وہ ہر میدان میں اختلافات کے اندر اعتدال اور خلوص قائم رکھیں قرآن کریم نے اس قانون فطرت کو سورہ بنی اسرائیل میں اس پیرایہ میں واضح کیا کہ جب کسی قوم کی بربادی کا وقت آتا ہے تو اس کے خوش حال لوگوں میں

دولت اور اقتدار کی حرص و ہوس کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور باہمی کشت و خون شروع ہو جاتا ہے،

اہل کتاب میں بھی باہمی بغض و عداوت باہمی اختلافات کی شدت سے پیدا ہوا اور قرآن نے اسے خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے قانون فطرت کے اٹل ہونے کی طرف اشارہ کیا (مائدہ:۱۴)

قائدین ملت غور کریں!

ملت کے دینی قائد ہوں یا قومی اور سیاسی قائد، سب خدا کے حضور میں حاضر ہو کر معاندانہ تفریق اور اختلافات کی تجارت تو بہ کریں اور اس ابتلا زدہ ملت کو تباہی کے گڑھے نکال کر باعزت زندگی کی طرف آنے دیں اور اس کام میں ان کی مدد کریں۔

محاسن موضح قرآن

امت محمدیہ علیہ السلام

کی برتری اور بزرگی، بڑوں کی وجہ سے چھوٹوں کے درجات میں ترقی وسیلہ و شفاعت

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا (الاحزاب ۴۷)

یعنی سب امتوں سے برتر یہی امت ہے۔ (فائدہ ۳ صفحہ ۵)

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ .... النَّبِيِّينَ۔ (ایضاً ۴۰)

یعنی کسی کو اس کا بیٹا نہ جانو، مگر رسول اللہ کا ہے، اس حساب سے سب اس کے بیٹے ہیں اور پیغمبروں پر مہر ہے اس کے بعد کوئی پیغمبر نہیں، یہ بڑائی اس کو سب پر ہے

اس امت کے اچھے اور برے دونوں بخشے جائیں گے

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ

(الفاطر ۳۲)

پھر ہم وارث کیے کتاب کے وہ جو چنے ہم نے اپنے بندوں میں سے۔ پھر کوئی ان میں برا کرتا ہے اپنی جان کا اور کوئی ان میں ہے بیچ کی چال پر اور کوئی ان میں سے ہے کہ آگے بڑھ گیا لے کر خوبیاں اللہ کے حکم سے یہی ہے بڑی بزرگی۔ باغ ہیں بسنے کے جن میں جاویں گے

فائدہ :۔ یعنی پیغمبر کے بعد کتاب کے وارث کیے ایک اور چنے بندے، یعنی یہ امت۔ ان میں تین درجے بتائے، ایک گناہ گار، ایک میانہ، ایک اعلیٰ۔ سب کو گنا چنے بندوں میں، امید ہے کہ آخر سب بہشتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہمارا گناہ گار قابلِ معافی ہے اور میانہ سلامت ہے اور آگے بڑھے، سو سب سے آگے بڑھے اللہ تعالیٰ کریم ہے اس کے ہاں کمی نہیں۔

مطلب :۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے چنے ہوئے اصطفینا سے استدلال کر کے پوری امت کو جنتی کہا ہے۔ شاہ صاحبؒ کے اس استدلال کا ماخذ سلف کا یہ قول ہے،

وكذا روى من غير واحد من السلف ان الظالم لنفسه من هذه الامة من المصطفين على ما فيه من عوج وتقصير۔	یعنی اکثر نے کہا ہے کہ گناہ گار ظالم بھی اسی امت میں شامل ہے اپنی تمام کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باوجود جس امت کو خدا تعالیٰ نے چنا ہوا فرمایا ہے۔ (ابن کثیر ج ۴ ص ۵۵۴)

شاہ صاحب کی تائید میں احادیث اور آثارِ صحابہ

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان تینوں طبقوں کو اس امت میں شامل فرمایا ہے، کیونکہ شاہ صاحبؒ کے سامنے مفسرین کی وہ تمام بحث تھی جو اس آیت کی تفسیر کے تحت ان حضرات کے ہاں ملتی ہے چنانچہ ابن کثیر نے اس تمام بحث کا خلاصہ لکھا ہے اور حسبِ ذیل حدیثیں اور آثارِ صحابہ نقل کیے ہیں۔

۱:۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ تینوں طبقے اسی امت کے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے تمام آسمانی کتابوں کا وارث بنایا ہے، اس امت کے ظالم (گنہگار) کی مغفرت کی جائے گی اس کے میانہ درجہ والے کو آسان حساب لے کر بخش دیا جائے گا، اس کے مقربین کو بلا حساب کتاب جنت میں داخل کیا جائے گا

امت کے گناہ گار طبقہ کا آسان حساب یعنی حسابا یسیرا اس طرح لیا جائے گا کہ اس طبقہ کو میدان محشر میں کچھ دیر ٹھہرایا جائے گا یوں سمجھئے کہ دنیاوی دستور کے مطابق اس طبقہ کو تا برخواست عدالت کی سزا دی جائے گی۔

یہودی حکومت اور قرآن کریم

افراط وتفریط کے دو متقابل نظریہ

یہودی حکومت کے بارے میں قرآن کریم کی تفسیر میں علماء تفسیر کے اندر افراط وتفریط پیدا ہوگئی ہے اور اس کا تعلق دنیا کے سیاسی حالات اور سیاسی انقلاب سے ہے۔ قرآن کریم میں یہود کے لیے ذلت ومسکنت کا دو جگہ اعلان کیا گیا ہے۔ تفصیلی اعلان سورہ آل عمران (۱۱۲) میں ہے: ضربت علیهم الذلة این ما ثُقفوا الا بحبل من الله وحبل من الناس وبآء وابغضب من الله وضربت علیهم المسکنة ذلك بانهم کانوا یکفرون بایٰت الله ویقتلون الانبیآء بغیر حق ذلك بما عصوا و کانوا یعتدون۔

سورہ بقرہ (۱۶) میں اسی مفہوم کی آیت اختصار کے ساتھ بیان کی گئی ہے دونوں آیتوں کا مطلب خیز ترجمہ یہ ہے: ''ان یہود پر جنھوں نے خدا کی نافرمانی کی اور ناحق جانتے ہوئے اپنے بعض رسولوں کو قتل کیا اور حدِ انسانیت سے گزر گئے۔ اس کے نتیجہ میں ان پر ذلت ومسکنت ڈال دی گئی، یہ لوگ جہاں بھی رہے ان کی یہی حالت رہی، البتہ خدا تعالی کی پناہ نے انھیں اس حالت سے کچھ بچایا یا لوگوں کے ساتھ عہد وپیمان کے سبب یہ لوگ اس حالت غضب سے کچھ محفوظ ہوگئے''۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قدیم علماء تفسیر نے ذلت ومسکنت سے اخلاقی پستی اور سماجی بے عزتی مراد لی ہے۔ مسکنت یعنی فقر کی تفسیر میں علامہ بیضاوی لکھتے ہیں: ای فقر قلبی وان کانوا اغنیاء فقر وافلاس سے قلبی فقر واحتیاج مراد ہے، اگرچہ یہود دولت مند تھے مگر دلوں کے حریص اور بخیل تھے۔

قرآن کریم نے دوسری جگہ (آل عمران ۷۵) ارشاد فرمایا: ومنهم من ان تامنه بدینار لا یؤده الیك اے نبی! ان یہودیوں میں کچھ لوگ اس قدر بددیانت اور مال کے حریص واقع ہوئے ہیں کہ اگر ان کے پاس ایک دینار بھی بطور امانت رکھا جائے تو وہ اسے بھی واپس نہ کریں۔ البتہ انہی

میں ایک طبقہ (نومسلم یہودی) دیانت دار بھی ہے جیسے عبداللہ ابن سلام وغیرہ۔ ذلت و مسکنت کی ایک صورت یہ تھی کہ مدینہ کے یہودی قبائل (بنی نظیر و بنی قریظہ) جب آپس میں لڑتے تھے تو اپنے اپنے حلیف مشرک قبائل (اوس وخزرج) سے مدد حاصل کرتے تھے اور جب لڑائی میں ان کے مخالف یہودی مشرک حلیف قبیلہ کے پاس قیدی بن کر جاتے تو پھر یہ ان قیدیوں کو فدیہ ادا کر کے آزاد کراتے تھے اور ان پر احسان رکھنا چاہتے تھے، یہ کس قدر ذلت کی بات تھی۔ قرآن کے سورہ بقرہ (۸۵) میں یہود کو ان کی اس ذلیل عادت سے آگاہ کرتے ہوئے انھیں نیکی اور شرافت کی تلقین کی۔ اس اخلاقی پستی وگراوٹ میں حکومت اور سیاسی اقتدار حاصل ہونے یا نہ ہونے کی کوئی بحث نہیں تھی۔ حکومت حاصل ہو لیکن دنیا کی قوموں کی نظر میں کوئی اخلاقی عظمت موجود نہ ہو اور بے حکومت و سلطنت ہوں مگر دنیا کی قومیں ان بے حکومت لوگوں کی شریفانہ زندگی اور خدمات پر ان کو عزت واحترام کا مقام دیں۔ یہ تاریخی حقائق ہیں۔

قاضی بیضاوی اور شاہ عبدالقادر

قاضی بیضاوی (قاضی شیراز وفات ۶۸۵ھ) نے اپنی تفسیر میں وجاعل الذین اتبعوك الخ (سورہ آل عمران: ۵۵) کی تفسیر کے تحت (تفصیل آگے آرہی ہے) یہ تحریر کیا: والی الآن لم یسمع غلبة الیھود علیھم یعنی اب تک یہ نہیں سنا گیا کہ عیسائیوں اور مسلمانوں پر یہود کو غلبہ حاصل ہوا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جب سے مسلمانوں نے یہودی حکومت (خیبر اور فلسطین) پر قبضہ کیا ہے اس کے بعد سے اب تک یہ نہیں سنا گیا۔

مولانا تھانوی علیہ الرحمہ نے مورخ مسعودی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ عیسائیوں کے دور میں چھوٹی چھوٹی یہودی حکومتیں قائم تھیں (بیان القرآن جلد ۲ ص ۲۴)۔ مولانا تھانوی بھی چونکہ اس نظریہ کے قائل تھے کہ ذلت و مسکنت کے مفہوم میں حکومت سے محرومی بھی داخل ہے اس لیے مولانا نے مسعودی کے قول کی یہ تاویل کی۔ وہ چھوٹی چھوٹی حکومتیں مسلمانوں اور عیسائیوں کی بڑی بڑی حکومتوں کے مقابلہ میں اس قابل نہیں کہ اسے غلبہ سے تعبیر کیا جائے۔ اس بحث کو چھوڑیئے کہ مولانا کی یہ تاویل کس درجہ تسلی دینے والی ہے، بہرحال شاہ عبدالقادر صاحب نے اردو کی پہلی تفسیر (موضح قرآن) میں بیضاوی کے قول کی بناء پر یہ تحریر کیا ہے: ''یہ یعنی یہود دنیا میں کہیں اپنی حکومت سے نہیں رہتے بغیر دست آویز اللہ کے کہ بعض رئیس توراۃ کی عمل میں لاتے ہیں اس کے طفیل پڑے ہیں اور بغیر دستاویز لوگوں

کے یعنی کسی کی رعیت میں، اس کی پناہ میں پڑے ہیں' مولانا ابوالکلام آزاد نے شاہ صاحب کے تفسیری حاشیہ کی وضاحت کرتے ہوئے (بغیر حوالہ کے) یہ لکھا: چنانچہ پہلی حالت عرب میں تھی کہ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے لوگوں (عرب) نے انھیں چھوڑے رکھا اور دوسری حالت روم اور ایران میں تھی کہ حکمران قوموں نے محکومیت اور اطاعت کے قول وقرار پر زندگی کی مہلت دیدی ہے۔ (ترجمان القرآن جلد دوم ۳۰۲)

شاہ صاحب کی تفسیری رائے تقریباً تمام اردو مفسرین نے اختیار کی ہے۔ آیت مذکورہ میں حبل کا لفظ ہے یعنی رسی، اہل تراجم نے اس کے مختلف مجازی تراجم کیے ہیں، خدا کی پناہ، دستاویز، عہد و پیان۔

الا بحبل من الله کا مطلب:

شاہ صاحب نے آیت مذکورہ میں الا بحبل من الله یعنی اللہ کی دستاویز کا جو مطلب لکھا ہے اس پر بعد والوں نے غور نہیں کیا۔ شاہ صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہود توراۃ پر عمل (اگرچہ ناقص سہی) کرتے ہیں اس لیے خدائی ذلت و مسکنت کے مکمل اثرات وحالات سے محفوظ ہیں۔ ذلت و مسکنت سے استثناء کا یہی مطلب بنتا ہے۔

تو پھر جب بے عمل (توراۃ سے بے ایمان نہیں) یہود پر خدا تعالیٰ کا کسی نہ کسی درجہ میں انعام ہے تو پھر حکومت سے محرومی پر مفسرین کرام کے ہاں اتنا زور کیوں ہے؟ مولانا آزاد کے الفاظ (لوگوں (عربوں) نے چھوڑ رکھا) کا مطلب یہ ہے کہ عرب میں آباد اہل کتاب اگر اہل کتاب نہ ہوتے تو پھر اہل عرب انھیں ختم کردیتے۔ تاریخ یہ کہتی ہے کہ عرب (یثرب) میں یہودی اقتدار کی حالت میں تھے، کمزور نہیں تھے بنی قریظہ اور اہل خیبر نے مسلمانوں کا زبردست مقابلہ کیا۔ بہر حال یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اہل عرب (بنی اسماعیل) اُمی (بے کتاب) کہلاتے تھے اور وہ اپنے چچازاد (اولاد اسحاق علیہ السلام) بھائیوں (بنی اسرائیل) کو اہل کتاب تسلیم کرتے تھے اور اس تعلق سے انھیں عزت کی نظر دیکھتے تھے۔ یہ کمزور فقرہ ہے کہ اہل عرب نے انھیں چھوڑ رکھا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے وعدہ:

خدا تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ سے یہ وعدہ کیا تھا: وجاعل الذین اتبوک فوق الذین کفروا الی یوم القیامة: ''اے نبی! خدا تعالیٰ تیرے متبعین کو تیرے منکروں پر برتری دے گا اور

قیامت تک ایسا ہی ہوگا'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کرنے والوں میں مفسرین نے مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کو داخل کیا ہے۔ فوقیت کے اس وعدہ کا تعلق بھی خاص طور پر حکومتی اقتدار سے قائم نہیں ہے بلکہ برتری، بالادستی اور فوقیت اپنے عام مفہوم میں ہے اخلاقی برتری، مالی برتری اور سیاسی برتری وغیرہ۔

بیضاوی لکھتے ہیں: یعلونهم ای یعلو المتبعین الیهود في غالب الامر حضرت عیسیٰ کے ماننے والوں (مسلمان، عیسائی) کو یہود پر عام حالات میں بلندر کھیں گے، عمومی حالت، ماننے والوں کی اچھی ہوگی، انکار کرنے والوں کے مقابلہ میں۔ صاحب جلالین نے لکھا، بالحجة والسیف، یہ برتری از روئے دلیل بھی ہوگی اور از روئے تلوار بھی۔ (جلالین ۵۲) اس نظریہ کو یہود کی مخالفت میں افراط کا پہلو سمجھئے۔

یہود کی حمایت میں تفریط:

اس نظریہ کے مقابلہ میں یہود اور یہودی حکومت کی حمایت میں دوسرا نظریہ وہ ہے جس کی اشاعت مولانا عبدالماجد دریابادی علیہ الرحمہ نے قرآن کریم کی ایک آیت کے سہارے کی ہے۔ مولانا دریابادی نے اپنے اخبار صدق جدید میں سچی باتوں کے عنوان کے تحت آیت ذیل (بنی اسرائیل ۱۰۴) کی تاویل کرتے ہوئے لکھا۔ آیت یہ ہے: وقلنا من بعده لبني اسرائیل اسکنوا الارض فاذا جآء وعد الأخرة جئنا بکم لفیفاً. آیت مذکورہ کا متفق علیہ ترجمہ یہ ہے: ''اور ہم نے فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل (یہود) سے کہا کہ اب تم اپنے قومی وطن کی سرزمین (فلسطین) میں رہو، پھر جب آخرت کا وعدہ آجائے گا تو ہم تمہیں جمع کر کے حاضر کریں گے''۔

اس آیت میں وعد الأخرة سے مراد یوم آخرۃ نہیں ہے بلکہ قیامت کے قریب ایک وقت موعود ہے اور جئنا بکم لفیفاً سے مراد بنی اسرائیل کے مختلف گروہوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دینا ہے۔ اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ ''مطلب واضح ہے۔ یعنی اسرائیلیوں کو بعد واقعۂ فرعون ہی خبر دے دی گئی تھی کہ اب تم آزاد ہو، دنیا میں جہاں چاہو رہو بسو، البتہ جب زمانہ قرب قیامت کا آجائے گا تو ہم تم کو مختلف سمتوں سے، مختلف ملکوں سے، مختلف زبانیں بولتے ہوئے، مختلف وضع و لباس اختیار کئے ہوئے، سب کو ایک جگہ جمع کر دیں گے اور وہ جگہ اور کونسی ہو سکتی ہے بجز ان کے قدیم وطن ملک فلسطین کے۔ آج جوارض فلسطین میں یہود کا اجتماع ہر ہر ملک سے ہو رہا ہے کیا یہ اسی غیبی پیش خبری کا ظہور

نہیں؟'' یہ نتیجہ جو مولانا نے اس آیت سے نکالا ہے، مفسرین قدیم و جدید میں سے کسی بڑے چھوٹے مفسر نے نہیں نکالا، اشارتاً بھی اس قسم کی اجتہادی تاویل بعید تفسیر کی کسی کتاب میں نہیں ملتی۔

یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت کے سیاسی حالات نے مولانا کے اندر اس قسم کی تاویل کا القاء کیا، اس وقت برطانیہ اور امریکہ فلسطین میں یہودیوں کا قومی وطن بنانے اور فلسطین سے عربوں کی قوت ختم کرنے میں مشغول تھا۔ اعلان بالفور کے نام سے برطانیہ کا یہ فیصلہ مشہور ہے ہم ذیل میں ماہ جون ۶۷ء کے ترجمان القرآن (مولانا مودودی) کا دریابادی کی اس تاویل باطل پر جو تبصرہ ہے وہ نقل کرتے ہیں:

> ان الفاظ میں ''قرب قیامت کے وقتِ موعود'' اور بنی اسرائیل کے وطن قدیم میں یہودیوں کے مختلف گروہوں کو ملک ملک سے لاکر جمع کر دینے'' کا مفہوم آخر کہاں سے نکل آیا۔ وعد الآخرۃ کا سیدھا اور صاف مطلب آخرت کا وعدہ ہے نہ کہ قیامت کے قریب زمانے کا کوئی وقتِ موعود اور سب کو اکٹھا کرلانے یا جمع کرلانے سے مراد قیامت کے روز جمع کرنا ہے۔ اس میں کوئی اشارہ تک اس بات کی طرف نہیں ہے کہ اسی دنیا میں بنی اسرائیل کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔ اس پر مزید ستم یہ ہے کہ ''ایک جگہ جمع کرنے'' کے تصور کو آیت کے الفاظ میں داخل کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ یہ بھی طے کر دیا گیا کہ وہ جگہ ''اسرائیلیوں کے وطن قدیم'' کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ یہ تو بعینہٖ یہودیوں کے اس دعوۃ کی تائید ہے کہ دو ہزار برس تک فلسطین سے بے دخل رہنے کے باوجود اس پر ان کا حق فائق ہے کیونکہ وہ ان کا وطن قدیم ہے اور اب دو ہزار برس سے یہ ملک جن لوگوں کا حقیقت میں وطن ہے اُن کے مقابلے میں برطانیہ اور روس اور امریکہ نے نہیں، بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین پر یہودیوں کے حق سکونت کو فائق قرار دے کر ہر ملک سے وہاں جمع کروایا ہے۔ اس طرح تو اسرائیلی ریاست کا قیام اللہ تعالیٰ کے ایک وعدے کا نتیجہ قرار پاتا ہے نہ کہ دنیا کی ظالم قوموں کی ایک سازش کا۔ حالانکہ آیت کے الفاظ میں اس مفہوم کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ (ترجمان القرآن جون ۶۷ء ماخوذ رسائل و مسائل حصہ پنجم مطبوعہ لاہور ص: ۳۰۰)

☆☆☆

ذمی اور جزیہ کی بے محل بحث

علماء تفسیر نے حبل من اللہ (خدا کی پناہ) اور حبل من الناس (لوگوں کی پناہ) کی تشریح کرتے ہوئے اسلامی احکام سیاسی ذمی اور جزیہ اور معاہدہ کی بحث چھیڑ دی ہے جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ عہد رسالت کے یہودیوں کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاملات کئے ان کا تعلق اسی قرآنی سزاء سے ہے جو ضربت علیھم الذلة میں بیان کی گئی ہے حالانکہ عہد رسالت کے یہودیوں کے ساتھ جو معاملات ہوئے ان کی ابتداء رسول آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق سے ہوئی۔

اس سلسلہ میں یہ اصول دین واضح رہے کہ نئی نبوت آنے کے بعد مخاطب قوموں کے ساتھ خدا تعالی کی طرف سے جو معاملہ کیا جاتا ہے وہ اس رویہ کے مطابق ہوتا ہے جو رویہ درویش مخاطب قومیں اپنے داعی حق کے ساتھ اختیار کرتی ہیں۔ نئی نبوت کے بعد اردو محاورہ کے مطابق "نیا دانہ، نیا پانی" والا معاملہ ہوتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ نئی نبوت کے بعد خدا کی طرف سے مخاطب قوموں پر ان کے اسلاف کی غلطیوں کی سزاء میں مبتلا کرنے کا اعلان کیا جائے۔

نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب کے ساتھ دعوت حق کے مسلم اصول کے مطابق اپنی آخری دعوت کا آغاز فرمایا چنانچہ خاتم الانبیاء علیہ السلام سے پہلے خدا تعالی نے آپ سے یہ دعوت پیش کرائی۔ قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء الخ (آل عمران ۶۴) اے نبی! تم ان سے کہو، اے اہل کتاب، ا ر! تم آؤ ایک ایسے پیغام اور ایک ایسے اصول کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اور تم (اپنے جد اعلی حضرت ابراہیم کے دین توحید کے مطابق) خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اس دعوت اتحاد کے بعد آپ نے مدینہ کے اہل کتاب (یہود) کے ساتھ صلح و سلامتی اور بھائی چارہ (امة واحدة)

☆ کٹرہ شیخ چاند، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

کا معاہدہ کیا جو تاریخ اسلام میں میثاق مدینہ کے نام سے مشہور ہے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مخلصانہ دعوت پر زندہ دل اور بے دار ضمیر اہل کتاب اسلام میں داخل ہونے شروع ہوئے۔ حضور علیہ السلام نے اپنی دعوت اتحاد کو خلوص پر (نہ کہ سیاسی مصلحت پر) قائم کرتے ہوئے سولہ مہینہ تک اہل کتاب کے قبلہ (بیت المقدس) کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی اور پڑھائی۔ قرآن کریم نے ایمان لانے والے اہل کتاب کی تعریف کرتے ہوئے قدیم یہودیوں کی مذمت والی آیت (ضربت علیهم الذلة) کے بعد فرمایا لیسوا سواء من اهل الکتاب امة قائمة (آل عمران ۱۱۳) تمام اہل کتاب برابر نہیں، ان یہود میں ایک فرقہ ایسا ہے جو راہ راست پر قائم ہے اور کتاب الٰہی (قرآن کریم) کی تلاوت کے ساتھ خدا کے حضور میں سجدہ ریز ہو کر نماز ادا کرتا ہے۔ اس گروہ سے حضرت عبداللہ ابن سلام (یہودی عالم) اسد ابن عبید ثعلبہ ابن شعبہ اور ان کے رفقاء مراد ہیں۔

عیسائی فرقہ میں ایمان لانے کی سعادت سب سے پہلے حبشہ کے عیسائی حکمراں نجاشی (اصحمہ) اور ان کے رفقاء کو حاصل ہوئی۔ قرآن کریم نے اس جماعت نصارا کی تعریف میں کہا: واذا سمعوا ما انزل الی الرسول تری اعینهم تفیض من الدمع (مائدہ ۸۳) اور جب یہ لوگ قرآن سنتے ہیں تو اے نبی محترم! آپ دیکھتے ہیں کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے ابلتی ہیں۔ اس وجہ سے کہ انھوں نے اسلام کی صداقت کو پہچان لیا۔

نجاشیؑ نے مہاجرین کے نمائندہ حضرت جعفر طیار کے ساتھ حبشہ کے عیسائیوں کا ایک وفد حضور کی خدمت میں مدینہ منورہ بھیجا، جن میں کچھ ملاح اور کسان (فلاحین) شامل تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ جس طرح حضرت جعفر طیار کی تلاوت قرآن (سورہ مریم) سے نجاشی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اسی طرح اس خوش نصیب عیسائی جماعت نے جب رسول پاک سے قرآن کریم سنا تو ان کی آنکھیں آنسو بہانے لگیں۔ قرآن کریم نے مائدہ کی آیت مذکورہ کے علاوہ سورہ آل عمران (۱۹۹) میں ان اصحاب ایمان اہل کتاب کو خاشعین للہ (خدا کے سامنے آہ وزاری کرنے والے مخلص لوگ) قرار دیا ہے اور سورہ قصص (۵۳) میں اس حق پرست جماعت کے بارے میں کہا قالوا آمنا به انه الحق من ربنا انا کنا مسلمین ان اہل حق اہل کتاب کو جب قرآن سنایا جاتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم قرآن پر ایمان لائے، بے شک یہ کتاب حق ہے اور ہم تو آج سے نہیں بلکہ بہت پہلے سے مسلمان اور صاحب

ایمان ہیں۔ یعنی قرآن سے پہلے توراۃ اور انجیل اور زبور پر ہمارا ایمان تھا اور اب ان آسمانی کتابوں کی جگہ قرآن آیا تو ہم اس پر بھی ایمان لاتے ہیں۔

نجران کے عیسائی:

نجران (یمن) کے عیسائی علماء اور قومی سردار غلطی کر بیٹھے، انھوں نے حبشہ کے عیسائی دانشوروں کی پیروی کرنے کے بجائے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مناظرہ کیا اور بحث ومباحثہ میں لاجواب ہونے کے بعد بھی جب یہ لوگ کج بحثی پر اتر آئے تو حضور علیہ السلام نے انھیں مباہلہ کی دعوت دیدی۔ مباہلہ کے معنی یہ ہیں کہ ہر فریق دوسرے فریق پر لعنت کرے اور ہلاکت کی بددعاء کرے۔ مباہلہ میں نجران کے علماء پیچھے ہٹ گئے، وفد کے ذہین لوگوں نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صداقت پر ہیں، اگر انھوں نے ہمارے حق میں بددعاء کی تو ہم ہلاک ہو جائیں گے۔ اس مشورہ پر یہ وفد آپ سے صلح کر کے واپس چلا گیا۔

یہود مدینہ کی سرکشی

آپ نے یہود کے ساتھ صلح وسلامتی اور بھائی بندی کا تعلق قائم کیا اور اس کے جواب میں یہود نے آپ کے ساتھ بدعہدی، دشمنی، زہرخورانی اور دشمنان مکہ قریش کے ساتھ مل کر اسلام کو شکست دینے کی کوشش شروع کی۔ رسول پاک کے شریفانہ طرز عمل کے جواب میں اور آپ کی طرف سے مذہبًا معاملات کے اندر رواداری اور تالیف قلب کی تمام جدوجہد کے باوجود یہود کی بدعہدیوں اور پھر جنگ وجہاد کے حالات کا تعلق آیات مذکورہ کے اعلان ذلت ومسکنت سے جوڑنا ناقابل فہم بات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عہد رسالت کے یہود کے ساتھ جنگ وجہاد کے جو حالات پیش آئے اور یہود کو میدان جنگ میں شکست کھانے کے بعد اہل ذمہ کی جو حیثیت اختیار کرنی پڑی یہ افسوسناک صورت حال رسول پاک کے دعوتی اتمام حجت کرنے کے بعد آئی۔ یہود کی سیاسی پسپائی ان کے اس ظالمانہ رویہ کے نتیجہ میں وجود میں آئی۔ یہ ان کے اسلاف کی نافرمانیوں کا نتیجہ نہیں تھا۔

عہد رسالت کے یہودی اور قتل انبیاء

عہد رسالت کے یہودیوں کو آیت مذکورہ میں بیان کردہ ذلت ومسکنت میں داخل کرنے کے جواز میں بعض مفسرین نے یہ دلیل دی ہے کہ عہد رسالت کے یہودی اپنے اسلاف کے ظالمانہ طرز عمل سے متفق تھے اس لیے یہ بھی اس سزا میں داخل ہیں۔ یہ دلیل صحیح نہیں ہے، یہودی اپنے اسلاف کی

عبادت عجل (بچھڑے کی پوجا) کو گناہ کا فعل سمجھتے تھے اور اس گناہ پر سزائے جہنم کے قائل تھے۔ پھر قتل انبیاء کرام کا فعل تو اس شرک سے کہیں زیادہ برا ہے۔ یہودیوں نے اپنی مذہبی کتابوں میں حضرات انبیاء کے قتل کیے جانے کے واقعات کا تذکرہ کیا ہے، یہ تذکرہ فخر و مباہات کے انداز میں نہیں کیا گیا بلکہ بطور تاریخی واقعات کے کیا گیا ہے۔ ان واقعات کے بیان میں کوئی فقرہ ایسا نہیں ملتا جس سے ان حوادث پر خوشی کا اظہار ہوتا ہو۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو زکریاہ نبی کو عین ہیکل سلیمانی میں سنگسار کر دیے جانے کا واقعہ (۲-تواریخ باب ۲۴ آیت ۲۱) یرمیاہ نبی کو پیٹے جانے قید کر دیے جانے اور رسی سے باندھ کر کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا دیے جانے کا واقعہ (یرمیاہ-باب ۱۵، آیت ۱۰-باب ۱۸- آیت ۲۰--۲۳- باب ۲۰، آیت ۱-۱۸- باب ۳۶ تا باب ۴۰) حضرت یحییٰ (یوحنا) کے سر مبارک کو بادشاہِ وقت کی محبوبہ کی فرمائش پر قلم کر کے اس کے سامنے نذر کر دیے جانے کا واقعہ (مرقس باب ۶ آیت ۱۷-۲۹ وغیرہ) ظاہر ہے کہ جس قوم نے اپنے فساق و فجار کو سرداری و سربراہ کاری کے لیے اور اپنے صلحا و ابرار کو جیل اور دار کے لیے پسند کیا ہو، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی لعنت کے لیے پسند نہ کرتا تو آخر اور کیا کرتا۔ ☆☆

حضرت عیسیٰ کی معجزانہ تخلیق کا مطلب؟

مولانا آزاد کی تفسیر قرآن میں بالغ نظری

علماء اسلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں متفق ہیں کہ ان کی تخلیق بن باپ کے ہوئی اور روح الامین (جبریل) کے روحانی عمل (نفخ روح) کے ذریعہ ہوئی ہر فعل کی طرح اس فعل کا حقیقی فاعل بھی خدا تعالیٰ ہے، اس لیے خدا تعالیٰ نے اس فعل کو واقعہ کی نزاکت کے سبب دو جگہ اپنا فعل قرار دے کر اسے ظاہر کیا۔

روح الامین کے فعل (نفخ روح) کا ثبوت کیا ہے؟

یعنی حضرت مریم کے حمل کا سبب کیا تھا؟ جب بقول اس عابدہ اور زاہدہ خاتون کے کہ مجھے کسی انسان نے آج تک ہاتھ نہیں لگایا، تو پھر وہ حاملہ کیسے ہوئیں؟

ہمارے مفسرین کو اس سوال کے بارے میں کوئی جواب اقوال رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں، آثار صحابہ وتابعین کے مستند ذخیرہ میں نظر نہیں آیا، تو ان حضرات نے نہایت کمزور الفاظ میں حضرت جبریل کے روحانی عمل کا تذکرہ کیا جیسے کہ ان حضرات کو خود اس تشریح پر اعتماد نہیں ہے۔

یہ حضرات اگر قرآن کی داخلی شہادت اور اس کے اسلوب بلیغ پر توجہ دیتے تو ان کی تشریحات میں کمزور اور بے وزن الفاظ نظر نہ آتے، علامہ ابن کثیر اور علامہ آلوسی کے تشریحی الفاظ نقل کرنے کے بجائے ہم ذیل میں علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کا تشریحی حاشیہ نقل کرتے ہیں کیونکہ حضرت عثمانی نے انہی مستند مفسرین کی ترجمانی کی ہے۔

مولانا لکھتے ہیں:

کہتے ہیں کہ فرشتہ نے پھونک ماری، حمل ٹھہر گیا، اس کے بعد بحر المحیط کے حوالہ سے یہ الفاظ ضعیف نقل کیے۔

وذکروا ان جبریل علیه السلام نفخ فی جیب درعها او فیه (تفسیر عثمانی ۴۰۹)

وہ لوگ کہتے ہیں، یہ نہایت مبہم فقرہ ہے اور اصطلاح علماء میں اسے قول ضعیف کہا جاتا ہے۔

مولانا آزاد کا استدلال:

مولانا آزاد علیہ الرحمہ نے حضرت عیسیٰ کی بن باپ پیدائش کے متفقہ نظریہ کے ثبوت کے لیے اقوال سلف کی طرف رجوع کرنے کے بجائے خود قرآن کریم کی داخلی شہادت اور اس کے اسلوب بلیغ سے استدلال کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

سورہ مریم کی آیات پر مولانا کا ایک تفصیلی نوٹ ہے، جس میں مولانا لکھتے ہیں:

"قرآن کی جتنی آیتوں سے اس طرح کے اشارات (بن باپ کی پیدائش کے) نکل رہے ہیں اگر انہیں ایک دوسرے سے الگ کر لیا جائے تو ہر آیت کے مطلب کے لیے ایک دوسرا جامہ بھی تراش لیا جا سکتا ہے، جیسا کہ سرسید احمد خاں اور ڈاکٹر توفیق صدقی (مصری) وغیرہما نے کوشش کی ہے، لیکن جب تمام آیات پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے اور معاملہ اور محل کے قدرتی مقتضیات اور قرائن بھی پیش نظر ہوں تو بلا تامل تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ قرآن اس اعتقاد (بلا باپ کی پیدائش) کے حق میں ہے، اس سے منکر نہیں۔ (ترجمان دوم ص ۴۴۹)

مولانا نے اختصار کے ساتھ جو بات کہی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ سورہ مریم (آیات ۱۵-۲۲) میں اسلوب آیات اور سیاق وسباق کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مریم کے حمل کا سبب روح الامین کا روحانی عمل (نفخ روح) تھا اور سورۂ انبیاء وتحریم (۱۲،۹۱) اور سورۂ نساء (۱۷) سے صراحت کے ساتھ یہ ثابت ہے کہ جبریل کا نفخ (پھونک) ایک ظاہری سبب اور واسطہ کی حیثیت رکھتا تھا، حقیقی عمل خالق حقیقی کا تھا۔

اگرچہ ہر فعل کا خالق خدا ہے؛ لیکن اس فعل کی معجزانہ حیثیت کے پیش نظر خدا تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ روح پھونکنے اور روح ڈالنے کے عمل کو اپنا عمل قرار دے کر اس کا اظہار کیا۔

مولانا آزاد کی تفصیلی تفسیر البیان حوادث کا شکار ہوگئی، ورنہ مولانا نے ترجمان القرآن کے مختصر حواشی میں جو بات کہی ہے وہ تفصیل کے ساتھ ہمیں اس میں مل جاتی۔

ہمیں امید تھی کہ مولانا حمید الدین صاحب فراہی علیہ الرحمہ سورہ تحریم کی تفسیر میں اس اہم مسئلہ پر روشنی ڈالیں گے، مگر ہمیں ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا، مولانا فراہی کے تفسیری

مجموعہ میں سورہ تحریم شامل ہے۔ اب ہم اس مسئلہ سے متعلق تمام آیات پر غور کرتے ہیں:

سورہ مریم کی آیات:

سورہ مریم میں واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا گیا: "فارسلنا الیھا روحنا فتمثل لھا بشراً سویا، قالت انی اعوذ بالرحمان منک ان کنت تقیا قال انما انا رسول ربک لاھب لک غلاما زکیا۔" (ترجمہ) ہم نے مریم کے پاس اپنا خاص فرشتہ روح الامین (جبریل) کو بھیجا، وہ فرشتہ اس کے سامنے ایک مکمل انسان کی صورت میں ظاہر ہوا، اس فرشتہ کو بصورت ایک جوان العمر آدمی دیکھ کر مریم گھبرا گئیں اور خدا تعالیٰ سے پناہ مانگنے لگیں، اس نے کہا: گھبرانے کی کوئی بات نہیں، میں تمہارے پروردگا کا قاصد ہوں، اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہیں ایک صاف ستھرا لڑکا عطا کروں مریم نے کہا: یہ کیسے ہوگا، مجھے آج تک کسی انسان نے ہاتھ تک نہیں لگایا اور میں ایک پاک دامن عورت ہوں۔

فرشتہ نے کہا: ایسا ہی ہوگا، تمہارے قادر مطلق پروردگار کے لیے یہ بات مشکل نہیں، خدا تعالیٰ اس بچہ کو اپنی قدرت کا خاص نشان اور پیغام رحمت بنانا چاہتا ہے۔

یہاں تک جبریل امین کے آنے اور مریم کے ساتھ بات چیت کا تذکرہ کر کے قرآن نے کہا: " فحملته فانتبذت به مكانا قصیاً" (۲۲) پھر مریم حاملہ ہو گئیں اور وہاں سے ایک دوسری جگہ چلی گئیں۔

حاملہ ہونے کے سبب کا اس جگہ کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا، البتہ آیات مذکورہ کے سیاق وسباق سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حمل ٹھہرنے کا عمل اسی آنے والے روح الامین سے صادر ہوا، اور وہ عمل روح پھونکنے کا تھا اور القاء روح کا تھا۔

مریم کی آیات میں اختصار؟

قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ کی تخلیق کا ابتدائی اور آخری حصہ سورہ مریم میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے؛ لیکن اس واقعہ کی تفصیل میں درمیانی حصہ کا واقعہ چھوڑ دیا گیا۔

یعنی ان آیات میں یہ واضح نہیں کیا گیا کہ حضرت مریم کے حاملہ ہونے کا سبب کیا تھا، اور وہ عمل کیا تھا جس کے نتیجہ میں مریم حاملہ ہوئیں؟ (دیکھو سورہ مریم ۱۶ تا ۳۵)

وہ روحانی عمل قرآن نے سورہ انبیاء (۹۱) اور سورہ تحریم (۱۲) میں بیان کیا اور

اپنے براہ راست عمل کے طور پر بیان کیا۔

ان آیات میں واقعہ کی تشریح کے اندر یکسانیت ہے البتہ سورہ نساء (۱۷۱) میں روح پھونکنے کی تعبیر کو بدلا گیا۔

روح پھونکنے کی تعبیر:

قرآنی تعبیر روح پھونکنے (نفخ روح) کا اکثر مفسرین نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ روح پھونکنا یعنی حکم الٰہی کو بجالانا۔قرآن نے روح کو امر الٰہی کہا ہے۔

قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّي وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلاً (۵۷)

اے نبی! آپ کہدیں کہ روح امر الٰہی (حکم الٰہی) ہے، اے لوگو! تمہیں روح کے بارے میں اتنا ہی بتلایا جاسکتا ہے، اس کی حقیقت تمہارے علم سے بالاتر ہے، تمہارا علم قلیل ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: "فنفخ فيه من روحی"

یعنی خدا تعالیٰ نے آدم کے خاکی پتلہ کو حکم دیا کہ وہ انسانی اور بشری وجود اختیار کرلے، پس خدا کا وہ حکم جاری ہوگیا۔خدا تعالیٰ کے حکم اور اس کے امر کی شان یہ ہے:

"انما امره اذا اراد شيئاً ان يقول لهٗ كن فيكون" (یٰس ۸۲)

خدا تعالیٰ کا حکم دینا یہی ہے کہ جب وہ کسی بات کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے، ہو جا، وہ ہو جاتا ہے۔

یعنی خدا تعالیٰ کا ارادہ ہی ہر شئی کی علت ہے، یہی مطلب حضرت عیسیٰ کی پیدائش والے معاملہ میں ہوا، یعنی خدا تعالیٰ نے حکم دیا کہ اے مریم بے شوہر کے بچہ کی تولید کرو، پس مریم نے حکم کی تعمیل کی یا یوں کہئے کہ خدا تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ مریم کے بطن میں شوہر کے بغیر بچہ کی تولید ہو، پس وہ ہوگئی۔

البتہ یہ ناچیز اس تاویل کو قرآنی عبارت کے قریب سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے آدم وعیسیٰ کے لیے جو روحیں پیدا کی تھیں وہ داخل کردیں، روحی اور روحنا کے الفاظ میں جو نسبت ہے وہ نسبت تشریفی ہے اور مراد خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ روحیں ہیں۔

بالواسطہ عمل کیوں:

آدم میں القاء روح کا واقعہ عالم ازل سے تعلق رکھتا تھا، جہاں براہ راست خدا کے

احکام جاری ہوتے ہیں اور حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا واقعہ عالم اسباب کا تھا، جہاں اسباب وذرائع سے نظام چلایا جاتا ہے اس لیے جبریل کے واسطہ سے القاء روح کا عمل صادر ہوا، البتہ اس عمل کی حیثیت صرف ایک واسطہ کی تھی، حقیقی موثر عمل براہ راست پروردگار عالم ہی کا ہوتا ہے اور خاص طور پر معجزانہ واقعات میں اصل قوت کار اسی خالق حقیقی کی کام کرتی ہے۔

بالواسطہ عمل کو اہمیت نہیں دی؟

اب سوال یہ ہے کہ ان آیات میں سیاق عبارت کے لحاظ سے جبریل اور قاصد الٰہی کے بالواسطہ عمل کا لفظوں میں اظہار ہونا چاہیے تھا اور یہ کہنا چاہیے تھا کہ فنفخ فیھا من روحنا یعنی اس قاصد نے ہماری پیدا کردہ خاص روح مریم کے اندر ڈال دی اور اس سے مریم حاملہ ہوگئیں۔

سیاق عبارت کا یہی اقتضاء تھا، ظاہر ہے کہ ان آیاتِ کے اندر سورہ انبیاء کے الفاظ میں اگر خدا تعالیٰ فاعل حقیقی کے طور پر اپنے عمل کا اظہار کرتا تو اس سے عبارت قرآنی میں بے ربطی پیدا ہوجاتی، یعنی فنفخنا فیہ من روحنا، کی عبارت مریم کی آیات سے جوڑ نہیں کھاتی اور قرآنی عبارت کی لفظی بلاغت ختم ہوجاتی۔

معنوی اعتبار سے اسکی ایک یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ فرشتہ وحی کے بالواسطہ عمل کو اہمیت دینا نہیں چاہتا تھا، اس لیے اشارہ کرنے پر اکتفا کیا گیا اور دوسرے مقامات پر اپنے عمل (براہ راست) کا تذکرہ کیا جہاں پہلے حضرت مریم کی عصمت اور پاک دامنی کا واضح اعلان کیا گیا اور اس کے ساتھ بتایا کہ حقیقت میں خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کا اعجاز دکھاتے ہوئے ایک پاکباز خاتون کے بطن میں بن باپ کے ایک بچہ کی پیدائش کا انتظام کردیا۔

تردید تہمت، اثبات عصمت:

حضرت عیسیٰ کے مخالفین (یہود) ان کی صدیقہ ماں حضرت مریم پر بدکرداری کی ملعون تہمت لگاتے تھے۔

قرآن کریم نے اس تہمت طرازی کا نہایت مضبوط جواب دیا اور اپنے خاص فن (ایجاز بلاغت) میں صرف دو فقروں کے اندر جواب دیا، جن دو فقروں میں پہلا فقرہ منفی

مفہوم میں ہے اور دوسرا فقرہ مثبت مفہوم میں ہے۔

تردید تہمت کی دو آیات ہیں اور دونوں قریب قریب ایک ہی عبارت کے اندر ہیں، تحریم میں حضرت مریم کے نام کے ساتھ تردید کی گئی اور کہا گیا:

"ومریم ابنت عمران التی احصنت فرجها فنفخنا فیه من روحنا، وصدقت بکلمات ربها و کانت من القانتین"(۱۲)

-اور عمران کی بیٹی مریم، جس نے اپنی شرم گاہ کی مکمل حفاظت کی، پھر ہم نے اس کے گریبان میں اپنی خاص روح پھونک دی اور اس نے اپنے پروردگار کے احکام کی تصدیق کی اور وہ عبادت گذار کامل مردوں میں داخل تھی۔

موقعہ ومحل کا تقاضا تھا کہ بدکرداری کی بے بنیاد تہمت کی تردید نہایت واضح اور صریح بیان میں کی جائے۔

چناں چہ قرآن کریم نے عربی لفظ فرج (شرم گاہ) استعمال کیا، یہ لفظ عربی زبان میں شرم گاہ اور گریبان دونوں معانی میں آتا ہے، پہلے فقرہ کی تردید کا اسلوب منفی ہے یعنی مریم بدچلن نہیں تھی۔ قرآن نے دوسرے فقرہ میں اس کا جواب دیا کہ خدا تعالیٰ نے اس کے گریبان میں (بواسطہ جبریل) روح خاص پھونکی جو رحم مادر میں داخل ہوگئ اور خدا تعالیٰ کی خاص قدرت سے حضرت عیسیٰ کی تخلیق ہوئی۔

مثبت تردید کے دوسرے فقرہ میں فاعل حقیقی (خدا تعالی) کی عظمت شان کا تقاضا تھا، کہ ادب قائم رہے اور بات صاف ہوجائے، چناں چہ لفظ فرج کے ایک مفہوم (گریبان) نے یہ مقصد پورا کر دیا۔

فرج کا کثیر المعانی لفظ:

قرآن کریم نے تخلیق عیسیٰ کی آیات میں فرج کا کثیر المعانی لفظ استعمال کیا، فرج کا بنیادی مفہوم کشادگی اور فراخی ہے۔

اہل زبان اس بنیادی مفہوم سے مختلف جزئی معانی پیدا کرتے ہیں شرم گاہ کے معنی میں جو دو ٹانگوں کی کشادگی میں ہوتی ہے، گریبان کے معنی میں جو کرتے کی کشادگی میں ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے شرم گاہوں اور آسمان کے پھٹنے اور ان میں دراڑ پڑنے کے معانی

میں استعمال کیا ہے۔

لفروجهم حافظون (مومنون ۳۱) اذا السماء فرجت (مراسلات ۹)

وہ لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اور جب آسمانوں میں دراڑیں پڑ جائیں اور وہ ٹوٹ پھوٹ جائے۔

آیات کے مختلف تراجم:

اب آپ ان آیات کے مختلف فارسی اور اردو تراجم پر غور کریں اور دیکھیں کہ کن کن مترجم حضرات نے اسم ظاہر (فرج) اور اسم ضمیر (فیہ، فیہا) کے تراجم میں قرآن کے منفی اور مثبت مفہوم رکھنے والے ان دونوں جامع فقروں کا صحیح مطلب اپنے ترجمہ میں واضح کیا ہے؟

دونوں فقروں میں (فیہ، تحریم) اور فیہا (انبیاء) کا مرجع لفظ فرج ہے، یہ لفظ مذکر ہے لفظوں میں اور مؤنث ہے مفہوم میں اس لیے قرآن نے ایک جگہ ضمیر مذکر استعمال کی اور ایک جگہ ضمیر مؤنث استعمال کی۔

علامہ شریف جرجانی کا فارسی ترجمہ، پہلا عجمی ترجمہ ہے، جرجانی کا ترجمہ یہ ہے:

آں زنیے کہ نگاہ داشت دامن خود را پس دمیدیم درآں از روح خود۔

یہ تحریم کی آیت کا ترجمہ ہے۔

اس میں جرجانی نے فرج کا ترجمہ "دامن" کیا ہے، یہ مجازی ترجمہ ہے، اس میں ادب کی رعایت ضرور ہے، لیکن تہمت کی تردید کا جو زور ہونا چاہئے وہ نہیں ہے، وہ زور تردید شرم گاہ ہی کے لفظ میں معلوم ہوتا ہے۔

پھر اگلے فقرہ میں (فیہ) کی ضمیر کا مرجع ظاہر نہیں کیا گیا کیونکہ دامن میں پھونکنے کا کوئی مطلب نہیں بنتا۔

سورہ تحریم سورہ مدنی ہے، یعنی اس دور میں نازل ہوئی جب قرآن کے سامنے اہل کتاب کے معاملات تھے اور ضرورت تھی کہ یہود کی ہفوات کی تردید واضح طور پر کی جائے۔

علامہ جرجانی نے آیت سورۂ انبیاء کا یہ ترجمہ کیا:

آں زنے کہ نگاہ داشت شرم گاہ خود را پس دمیدیم دراں از روحے کہ فرمان است۔

اس آیت میں فرج کا ترجمہ شرم گاہ کرتے ہیں اور روح کا مطلب فرمان (حکم)

لکھتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ لیا جاسکتا ہے کہ علامہ کو پہلی آیت کے ترجمہ کے بعد یہ احساس ہوا کہ فرج کے مجازی ترجمہ کے اندر تردید تہمت کا وہ زور نہیں ہے۔ جو شرمگاہ کے ترجمہ سے پیدا ہوتا ہے اور جو قرآن کا بنیادی مقصد ہے۔

شاہ ولی اللہ نے دونوں آیات میں لفظ فرج کا ترجمہ نہیں کیا؛ بلکہ اسی لفظ کو برقرار رکھا، شاید شاہ صاحب نے اپنے ترجمہ کو مذکورہ الجھن سے بچانے کی کوشش کی اور اسے بعد والوں کے لیے چھوڑ دیا۔

شاہ صاحب کے دو صاحبزادوں نے آیات مذکورہ کے اصلی مقصد (تردید) کو سامنے رکھا اور فرج کا ترجمہ حسب ذیل کیا:

اور وہ عورت جس نے قید میں رکھی اپنی شہوت، پھر پھونک دی ہم نے اس عورت میں اپنی روح (شاہ عبدالقادر)

شاہ رفیع الدین صاحب نے شرم گاہ کا لفظ رکھا ہے اور فیہا کی ضمیر کے مرجع کا ترجمہ نہیں کیا اور لکھا:

''پھونک دی ہم نے بیچ اس کے روح اپنی''

یہ آیت انبیاء کا ترجمہ ہے، تحریم کی آیت میں شاہ عبدالقادر صاحب نے پہلے ترجمہ سے اتنا فرق کیا کہ قید میں رکھی کے بجائے روک رکھی اپنی شہوت، تحریر کیا۔

شاہ عبدالقادر نے آیت انبیاء کے ترجمہ میں پہلے فقرہ کے اندر شہوت کی جگہ فرج کا ترجمہ کر کے اس فقرہ کی روح (پرزور تردید) کو قائم رکھا اور فیہا کی ضمیر کا مرجع اللتی (عورت) کو قرار دے کر فاعل حقیقی (خداوند عالم) کی شان عظمت کی پوری رعایت کی لہذا دونوں فقروں میں مقصد کے لحاظ سے شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کو فوقیت حاصل ہوگی۔

پہلے بامحاورہ ترجمہ (ڈپٹی نذیر احمد) میں سورہ انبیاء کے اندر فرج بمعنی ناموس اور تحریم میں فرج بمعنی عصمت ترجمہ کیا اور مجازی الفاظ استعمال کیے، تحریم میں فیہ، کی ضمیر کا ترجمہ (ان کے پیٹ) میں کیا۔

مولانا تھانوی نے دونوں جگہ فرج کا ترجمہ ناموس کیا، اور ڈپٹی صاحب کی پیروی کی اور تحریم میں فیہ کا مرجع، چاک گریبان'' تحریر کیا، جو فرج کا دو میں سے ایک لغوی مفہوم

ہے اور اس ترجمہ میں فنفخنا کے فاعل حقیقی کی عظمت کا لحاظ کیا گیا۔

روحوں کی تخلیق:

سورۂ اعراف ۱۷۲ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یوم ازل میں تمام اولادآدم سے اپنی ربوبیت کا عہد و پیمان لیا اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ آدم کی پشت سے ان کی تمام ذریت کی ارواح کو نکالا گیا اور ان سے خدا تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا اقرار کرایا اور پھر انھیں پشت آدم میں واپس کر دیا۔

صحیح احادیث میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد ازل کے اس واقعہ کی تفصیل منقول ہے، اس لیے بعض علماء کی یہ رائے کہ یہ واقعہ، ایک تمثیلی واقعہ ہے درست نہیں ہے۔

ازل میں پوری نسل انسانی کے اس اجتماع کو اگر کوئی شخص (تعقل پرست) بعید از امکان سمجھتا ہے تو یہ محض اس کے دائرہ عقل کی تنگی کا نتیجہ ہے ورنہ حقیقت میں نسل انسانی کی موجودہ تدریجی (آہستہ آہستہ) پیدائش حقیقی قریب از امکان ہے۔ اور ازل میں اس کا مجموعی ظہور اور ابد میں (قیامت کے دن) ان کا مجموعی حشر بھی قریب ازامکان اور تحقیقی ہے۔

ملکوتی جوہر:

مولانا آزاد علیہ الرحمہ نے مذکورہ بالا تشریحی نوٹ میں جہاں تفسیر القرآن بالقرآں کے اصول کے مطابق زیر بحث مسئلہ کا حل نکالنے کی طرف اشارہ کیا ہے وہیں (روح پھونکنے) کا ایسا مفہوم بیان کیا ہے، جس سے حضرت عیسیٰ کی خاص تخلیق اور ان کے وجود بشری کے دونوں جزء (بشری اور روحانی) کی حقیقت پر روشنی پڑ جاتی ہے۔ مولانا آیت انبیاء (۱۲) کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ: ”پس ہم نے اپنی روح میں سے یعنی اپنے ملائکہ کے جوہر ملکوتیت میں سے ایک جوہر اس میں پھونک دیا۔“ (ترجمان دوم ص ۴۸۲)

روح عالم ملکوت کی مخلوق ہے:

ملکوت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ کا خاص اصطلاحی لفظ ہے، شاہ صاحب اس لفظ کو ماورائے طبعیات (عالم بالا اور عالم روحانیات) کے لیے استعمال کرتے ہیں اور انسان کو قوت ملکوتی اور قوت مادی کا مجموعہ قرار دیتے ہیں اور ملائکۃ اللہ کو ملکوتی وجود تحریر کرتے ہیں۔

جبریل قرآن کی زبان میں روح الامین ہیں۔ صاحب قوۃ اور صاحب حسن (ذو مرۃ) ہیں۔

اسی ملکوتی ہستی کو خالق حقیقی نے حضرت عیسیٰ کی روح خاص کا ان کی ماں کے اندر القاء کرنے کا حکم دیا اور انھوں نے اس کی تعمیل کی۔

عام انسانی وجود ماں باپ دونوں کے بشری مادہ سے مل کر بنتا ہے، اور اس کا تیسرا جزء روح ہوتی ہے۔

حضرت عیسیٰ کا انسانی وجود صرف ماں کے بشری مادہ اور روح ملکوتی سے مل کر تیار ہوا، اس طرح حضرت عیسیٰ کے انسانی وجود پر روحانی اثرات غالب تھے اور مادی اثرات مغلوب تھے۔

بے جان چیزوں کو جاندار بنانے کے چند معجزات، بیماروں کو تندرست کرنے کے معجزات آپ کے اسی روحانی غلبہ کے اثرات سے صادر ہوئے اور آپ کا انسانی وجود آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد عالم ملکوت میں اپنے روحانی غلبہ والے وجود کے ساتھ بغیر مادی غذاء کے مقیم ہے، لیکن حضرت عیسیٰ کی یہ خاص حالت ان کے خدا اور خدا کا بیٹا بننے کی دلیل نہیں ہے۔ وہ خدا کی مخلوق تھے اور ان پر عام مخلوقات کی طرح موت کے حالات طاری ہوں گے۔ اس کی تفصیل علیحدہ مضمون میں کی گئی ہے۔

حضرت ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی پکڑنے کی نوعیت کیا تھی؟

اعظم تعلیمی کمپلکس پونہ کے ایک پروفیسر دینیات تحریر کرتے ہیں کہ ایک اہل حدیث مقرر صاحب توحید کی اہمیت اور شرک کی مذمت کرتے ہوئے اپنی تقریروں میں بار بار یہ فرماتے ہیں کہ توحید کی حفاظت کے جوش وجذبہ میں حضرت موسیٰ کلیم اللہ جیسے عظیم رسول نے اپنے بڑے بھائی ہارون علیہ السلام کے سر کے بال اور ان کی ڈاڑھی پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

کالج کے طلبہ اعتراض کرتے ہیں کہ کیا ایک جلیل المرتبہ اور صاحب شریعت رسول توحید کی حفاظت کے جذبہ کے ساتھ ہی سہی اپنے بڑے بھائی جو رسول و نبی تھی ان کے ساتھ ایسی نازیبا حرکت کر سکتے ہیں؟

دوسرے علماء کرام بھی ان کی تائید کرتے ہیں اور یہ فرماتے ہیں کہ یہ بات قرآن کریم میں موجود ہے۔

آں جناب اس معاملہ کی حقیقت پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں؟

اس ناچیز نے اس کا جو جواب تحریر کیا ہے وہ حسب ذیل ہے تاکہ حضرات مقررین اور واعظ صاحبان اس واقعہ کی حقیقت کو ذہن میں رکھیں اور اس نازک واقعہ کو بیان کرتے وقت احتیاط سے زبان کھولیں۔

سورہ اعراف (۱۵۰) میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فعل کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا: وَلَمَّا رَجَعَ مُوسٰى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ مِنْ بَعْدِیْ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗ اِلَیْهِ. قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَكَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ. قَالَ رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَلِاَخِیْ وَاَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِكَ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ.

(ترجمہ) ''حضرت موسیٰ جب کوہ طور سے توراۃ حاصل کرکے واپس آئے تو وہ نہایت خشمناک تھے اور بنی اسرائیل کے گؤ پرستی میں مبتلا ہونے پر انہیں افسوس تھا۔ موسیٰ نے یہود کی حالت دیکھ کر کہا:

تم لوگوں پر افسوس، تم نے میرے بعد کس قدر بری نیابت کی اور میرے بعد بہت برا کام کیا۔

پھر موسیٰ نے جوش میں آکر توراۃ کی تختیاں ایک طرف رکھ دیں اور اپنے جانشین ہارون کے سر کے بالوں سے انھیں پکڑ کر اپنی طرف کھینچا، ہارون نے کہا: اے میرے ماں جائے بھائی! میری قوم نے مجھے نہایت کمزور اور بے حقیقت سمجھا اور قریب تھا کہ میرے روکنے اور مذمت شرک کرنے پر مجھے قتل کردیں۔

پس میرے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کر کہ میرے دشمن مجھ پر ہنسیں اور مجھے ان مجرموں اور ظالموں میں شامل نہ کر۔''

مطلب یہ کہ حضرت ہارون نے سامری (جادوگر) کے بہکانے میں آکر گائے کے مصنوعی بچھڑے کی پرستش کرنے سے بہت روکا، مگر یہود کا ایک گروہ باز نہ آیا اور شرک میں گرفتار ہوگیا۔

ان واضح آیات کے اسلوب وعبارت پر غور کرو کہ قرآن کریم نے حضرت ہارون کے صرف سر کے بال پکڑ کر کھینچنے کا ذکر کیا ہے اور ڈاڑھی پکڑ کر کھینچنے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

اب سورہ طٰہٰ (۹۴) کی آیات پر غور کرو، ان آیات میں قرآن نے حضرت ہارون کا قول اور ان کی فریاد نقل کرتے ہوئے بطور حکایت کہا:

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي۔

(ترجمہ) ہارون نے کہا: اے میرے ماں جائے بھائی! میری ڈاڑھی اور میرے سر کے بال نہ پکڑ، میں اس بات سے ڈرا کہ تم یہ کہو گے کہ تو نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری نصیحت کو یاد نہ رکھا کہ بنی اسرائیل کو میرے بعد اختلاف میں پڑنے سے

بچائے رہنا، یعنی یہ لوگ اختلافات کے عادی ہیں، انہیں اس سے بچانے کی کوشش کرنا۔

حضرت ہارون نے اپنی فریاد میں سر کے بالوں اور ڈاڑھی دونوں کا ذکر کیا، ظاہر ہے کہ ہارون غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتے تھے، جب کہ یہ گفتگو آمنے سامنے ہو رہی تھی۔

ڈاڑھی پکڑنے کی بات اگر بالکل غلط ہوتی تو حضرت موسیٰ اسی وقت فرماتے کہ بھائی! مجھ پر ڈاڑھی پکڑنے کا الزام کیوں لگاتے ہو؟

قرآن کریم نے اس فعل کو اپنے بیان واقعہ میں کیوں نظر انداز کیا؟

اسلوب قرآنی کے اس لطیف فرق پر کسی نے غور نہیں کیا، یہاں تک کہ مشہور تفسیر جلالین کے مصنفین (علامہ محلی اور علامہ سیوطی) نے اپنی طرف سے یہ تشریح بھی کر دی کہ موسیٰ نے سیدھے ہاتھ سے سر کے بال پکڑے اور الٹے ہاتھ سے ڈاڑھی کے بال پکڑے۔

گویا یہ مفسرین کرام موقعہ پر موجود تھے اور اس واقعہ کا قریب سے مشاہدہ کر رہے تھے۔

کمال ہے کہ نہ تو قرآن میں، نہ کسی حدیث و قول صحابی و تابعین میں اس کی طرف کوئی اشارہ موجود ہے اور نہ یہ حضرات موقعہ واردات پر موجود تھے پھر جس معاملہ میں قرآن احتیاط کر رہا ہے اسے یہ مفسرین کرام نمایاں کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟

اب فطری طور پر واقعہ کی صورت یہ بنتی ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے سر کے بال دراز تھے اور جب حضرت موسیٰ نے حضرت ہارون کے سر کے بالوں پر ہاتھ ڈالا تو قدرتی طور پر بلا قصد و ارادہ حضرت ہارون کی ڈاڑھی کا کچھ حصہ ان کے ہاتھ میں آ گیا۔

یہ فعل اتفاقی تھا، ارادہ و قصد سے نہیں تھا، اس لیے قرآن کریم نے حضرت موسیٰ کے فعل کے تذکرہ میں ڈاڑھی پکڑنے کا ذکر نہیں کیا، جو فعل قصداً سرزد ہو رہا تھا اس کا ذکر کیا۔

حضرت ہارون پر جو گذر رہی تھی اس بات کی انھوں نے اپنے بھائی سے فریاد کی۔

مولانا شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمہ نے حضرت موسیٰ کے اس فعل کو حمیت دینی، حرارت ایمانی سیادت اور حکومت کا ظہور اور نشہ توحید کی سرشاری قرار دے کر ہلکا کرنے اور شرعی اور اخلاقی اعتبار سے درست ثابت کرنے کی کوشش کی اور حضرت ہارون کی کوتاہی کو تفسیر مظنون

(کوتاہی کا گمان) قرار دے کر ہارون نبی اللہ کی صفائی ثابت کی۔

مولانا تھانوی نے حضرت موسیٰ کے فعل کو سکر من المباح قرار دیا، یعنی وہ جائز بے خودی اور جائز سرمستی جس پر خدا کی طرف سے مواخذہ نہیں ہوتا مگر یہ تمام تاویلات سر کے بال پکڑنے کی حد تک ہی قابل قبول ہوتی ہیں اگر ڈاڑھی پکڑنے کے فعل کو بھی بالقصد فعل تسلیم کر کے اس میں شامل کر دیا جائے تب ان تاویلات کا قابل قبول ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے، البتہ یہ ساری بحث اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب واقعہ مذکورہ میں ڈاڑھی پکڑنے کا فعل اتفاقی حادثہ معلوم ہوتا ہے، جس میں حضرت موسیٰ کے قصد و اختیار کو دخل نہیں تھا، اب رہی بات سر کے بال پکڑنے کی تو ظاہر ہے کہ اس میں حضرت موسیٰ کے جلالی مزاج کا دخل تھا، جس کو حضرت موسیٰ نے بعد میں خود محسوس کیا اور خدا تعالیٰ سے بخشش کی دعاء فرمائی۔ اپنے لیے بھی اور اپنے بھائی ہارون کے لیے بھی۔

حضرت موسیٰ کے جلالی مزاج کے سبب ایک مصری جوان ہلاک ہوا، حالانکہ حضرت موسیٰ نے صرف ایک گھونسا مارا تھا، اس کے ہلاک کرنے کا کوئی قصد و ارادہ نہیں تھا، مگر اتفاق تھا کہ وہ مصری حضرت موسیٰ کے گھونسے کی تاب نہ لا سکا اور ہلاک ہو گیا۔

سورۂ قصص (۱۱۵) میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے، وہاں اس کی تفصیل دیکھی جائے۔

تفسیری روایات، اقوال صحابہؓ، آثار تابعین کے بارے میں مستند اور غیر مستند، معتبر اور غیر معتبر ہونے کی تحقیق ضروری ہے

قرآنِ کریم کی تفسیر کے سلسلہ میں روایات و آثار کا جو ذخیرہ متاخرین علماء کے ہاتھوں میں پہنچا ہے اس کا زیادہ تر حصہ غیر مستند ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم کی سب سے زیادہ معتبر اور صحیح تفسیر وہی ہو سکتی ہے جو آپ سے براہِ راست علم حاصل کرنے والے حضرات صحابہ کرامؓ سے روایت کی گئی ہو لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تفسیر قرآن کے لیے حدیث و اثر کے نام سے ہر قسم کی جعلی اور موضوع باتوں کو تسلیم کر لیا جائے۔

علامہ سیوطی نے اتقان میں حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے۔

قال احمد ثلاثۃ کتب لیس لھا اصل التفسیر والملاحم	تین کتابیں احادیث کی ایسی ہیں جن کی اصل نہیں تفسیری روایت پیش گوئیوں

والمغازی (ج ۲ ص ۵۳۵) اور غزوات سے متعلق واقعات واقوال۔

پھر سیوطی نے اپنی رائے ان لفظوں میں دی ہے۔

اصل المرفوع منہ فی غایۃ القلۃ (ج ۲ ص ۵۲۱)	ایسی روایات جو براہ راست حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحت کے ساتھ منقول ہوں تفسیر کے سلسلہ میں بہت کم ہیں۔

روایات کے بعد آثار صحابہ کا درجہ ہے اور ان میں خاص طور پر حضرت ابن عباسؓ کے اقوال زیادہ مشہور ہیں ان کے متعلق سیوطی محققین علماء کا فیصلہ نقل کرتے ہیں۔

وھذہ التفاسیر الطوال التی اسندوھا الی ابن عباس غیر مرضیۃ ورواتہا مجاھیل (ص ۵۵۳)	یہ لمبی لمبی تفسیری روایتیں جو ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہیں سب غیر پسندیدہ ہیں، سند کے لحاظ سے اور ان کے راوی و ناقل مجہول اور نامعلوم اشخاص ہیں۔

امام شافعیؒ نے جب اقوالِ ابن عباسؓ پر تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈالی۔ تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے۔

لم یثبت عن ابن عباس فی التفسیر الاشبہ بمائۃ حدیث۔ (ص ۵۵۴)	تقریباً سو روایتوں کے سوا حضرت ابن عباس کی طرف منسوب اقوال صحیح ثابت نہیں ہو سکے۔

اس مسئلہ کی وضاحت میں مولانا مناظر حسن صاحب گیلانی نے

حضرت مولٰنا سید محمد انور صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

احادیث کے سب سے معتبر اور صحیح مجموعے بخاری شریف میں تفسیری روایات کا حصہ دوسری قسم کی احادیث کے مقابلہ میں بہت کم ہے اور اس میں بھی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے منقول روایات سے زیادہ قرآن کریم کی لغوی تشریح پر زیادہ توجہ دی ہے۔

اس تشریح کے متعلق امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے شارح حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ امام نے اس تشریح میں ابو عبید معمر ابن المثنیٰ کی کتاب "مجاز القرآن" پر زیادہ بھروسہ کیا ہے۔

اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق یہ تھی کہ :۔

لم یعماج الی النقد اصلاً امام بخاری نے معمر کے اقوال تنقید کے بغیر اپنی کتاب میں نقل کر دیئے ہیں۔ اسی لیے ابن المثنیٰ کی کتاب میں جو نقائص پائے جاتے ہیں وہ کوتاہیاں صحیح بخاری میں کتاب التفسیر میں باقی رہ گئی ہیں۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے، بخاری میں جو تفسیری اقوال پائے جاتے ہیں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ محض ان کے ناقل ہیں، یہ سمجھنا غلط ہے کہ امام بخاریؒ کا اپنا فیصلہ بھی یہی ہے۔ .... (صـ۱۲۲ حیات انور بحوالہ فیض الباری)

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فیصلہ تھا کہ تفسیر قرآن کے بارے میں نہ یہ مسلک صحیح ہے کہ جب تک کسی آیت کی تفسیر کے لیے کوئی روایت نہ

ہو وہ تفسیر صحیح نہیں"..... اور نہ یہ آزاد روی درست ہے کہ سلف صالحین کے مستند خیالات اور لغت عربی اور سباق و سیاقِ قرآنی سے بالکل بے نیاز ہو کر قرآن کریم کی من مانی تشریح کی جائے، بلکہ تفسیر کے صحیح طریقہ کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ فرماتے تھے۔

ومن حجر علی العلماء ان لا یبدوا معانی الکتب بعد الامعان فی السباق و السیاق و النظر الی حقائق الالفاظ المراعیۃ لعقائد السلف	علماء کو اس بات سے کس نے روکا ہے کہ وہ کتاب الٰہی کے مطالب بیان کریں اس طرح کہ ان کے سامنے سیاق و سباق ہو، الفاظ قرآنی کے حقائق (لغوی معنی اور مرادی مفہوم) ہو اور ساتھ ہی سلف صالحین کے مسلمہ تصورات و عقاید کی رعایت ملحوظ رہے۔

اس کے بعد شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔

بل ذالک حظھم من الکتب فانھم ھم الذین ینظرون فی عجائبہ ویکشفون الاستار عن وجوہ دقائقہ ویرفعون الحجب عن خبیات حقائقہ فھذا النوع من التفسیر بالرائی حظ اولی العلم ونصیب العلماء المستنبطین۔	بلکہ کتاب الٰہی میں علماء کا درحقیقت یہی حصہ ہے کہ وہ اس کتاب کے نئے نئے پہلوؤں پر غور کرتے ہیں اور اس کے پوشیدہ اسرار سے نقاب الٹتے ہیں جو باتیں چھپی ہوئی ہیں انہیں باہر لاتے ہیں اگر یہی تفسیر بالرائے ہے تو اہل علم کا حقیقت میں یہی حصہ ہے اور کتاب الٰہی سے مسائل کا استخراج کرنیوالے

علماء کی یہی غذا ہے۔

راقم نے تمہید کے طور پر یہ چند باتیں اس لیے بیان کی ہیں کہ حضرت شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اسلوب کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

شاہ صاحبؒ نے ترجمہ اور فوائد میں براہِ راست قرآنِ کریم کے اسرار و رموز پر غور کر کے ان کے چہرہ سے نقاب اٹھائی ہے، شاہ صاحبؒ کے فوائد میں خاص طور پر ایسی ایسی حکیمانہ تفسیریں ملتی ہیں جن سے تفسیر کی اگلی کتابیں بالکل خالی نظر آتی ہیں۔ شاہ عبد القادر صاحبؒ نے ہر آیت کی تفسیر میں روایت و اثر پر تکیہ نہیں فرمایا بلکہ آیات اللہ کے اندر چھپے ہوئے گہرے معانی اور اسرار کو الہامی نور و بصیرت سے دیکھا اور وہ اسرار کے موتی موضح قرآن کے صفحات پر بکھیر دیئے۔

لیکن تفسیری کتابوں کے ذخیرہ میں جو اسرائیلی روایات اور موضوع آثار (اقوال صحابہ و تابعین) بکھرے پڑے ہیں آخر شاہ صاحبؒ ان سے اپنا دامن کہاں تک بچاتے۔

اوپر بتایا گیا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے کمزور روایات سے بہت احتیاط برتی ہے مگر پھر بھی بعض مقامات میں ان غیر مستند آثار کو ان کی شہرت کی بنا پر قبول کرنے پر مجبور رہے ہیں۔

علامہ قرضاوی کا فتویٰ

میرے سامنے لاہور میثاق کا تازہ پرچہ ہے۔ اس میں علامہ یوسف قرضاوی صاحب کا ایک فتویٰ نقل کیا گیا ہے جو ان کے مضمون سیاسی اسلام سے ماخوذ ہے وہ یہ ہے:

''اسلام ہر مسلمان پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ ایسی ریاست میں زندگی گزاریں جس پر ایک امام کتاب اللہ کی رو سے حکومت کرتا ہو۔ اور عوام نے ان کی بیعت کی ہو۔

اگر کوئی مسلمان ایسا نہیں کرتا تو وہ اہل جاہلیت میں سے ہے۔ مسلم کی صحیح حدیث میں ہے۔ جو اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں امام کی بیعت کا قلادہ نہیں ہے تو وہ جاہلیت کی موت مرا''۔

سندھ کراچی کے صدر جماعت اسلامی مولانا وسیع مظہر ندوی صاحب نے اس فتویٰ پر تنقید کی ہے اور اسے غیر اسلامی فتویٰ قرار دیا ہے اور جماعت اسلامی کے ایک قدیم رکن کی یہ تنقید ان حالات کا ردعمل ہے جو افغانستان کی خلافت کے ساتھ امریکن درندوں کے ہاتھوں پیش آیا ہے۔

راقم نے مسلم کی حدیث اور اس حدیث کی تشریح جو محدثین کرام نے کی ہے اپنے ایک الگ مضمون میں تحریر کی ہے اور علماء کو دعوت دی ہے کہ اس حدیث کے اندر وہ فتویٰ کہاں درج ہے صراحۃ النص کو چھوڑ دو اشارۃ النص کے ذریعہ بھی یہ فتویٰ ثابت نہیں ہوتا۔

اس قسم کے غالیانہ اور جذباتی فتوؤں اور جذباتی مضامین نے ملت مسلمہ کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے۔ اس کا اندازہ آج ہر شخص کو ہو رہا ہے۔

کل بھی یہ مغربی اتحاد تھا جو کمیونیزم کے مقابلہ میں سیاسی لڑائی کو جہاد اسلامی کہہ رہا تھا اور خلافتی اور جہادی تحریکوں کی زبردست مالی اور اخلاقی امداد کر رہا تھا اور آج بھی وہی مغربی امپریل ازم ہے۔ جو مسلمانوں کی طاقت کو پامال کر رہا ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ الفیصل کے مدیر مولانا محمد ہاشم القاسمی صاحب میرے اس مختصر مضمون کو تازہ پرچہ میں شائع کریں گے۔ اور سرزمین حیدرآباد کے ماحول سے خائف نہ ہوں گے۔

مرکز اسلامی حیدرآباد کا ماہوار ترجمان

الفیصل فروری ۲۰۰۳ء

علامہ قرضاوی کے فتوی کا ماخذ

علامہ قرضاوی صاحب نے مسلم شریف کی جس حدیث کو اپنے فتوی کا مستدل قرار دیا ہے وہ حدیث اور اس کی مستند شرح حسب ذیل ہے۔

مسلم شریف کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابی هريرة قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول من خرج من الطاعة و فارق الجماعة فمات ميتة جاهلية و من قاتل تحت راية عمية يغضب لعصبية اويدعو لعصبية او ينصر لعصبية فقتل قتلة جاهلية ومن خرج على امتى بسيفه يضرب برها و فاجرها ولا يتحاشى من مؤمنها ولايفى لذى عهد عهده فليس منى ولست منه (مشکوۃ ۳۱۹)۔

حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص اطاعت سے باہر ہو گا اور جماعت سے نکل جائے گا تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا اور جو شخص کسی مشتبہ پرچم کے نیچے قتال کرے گا اور محض کسی قسم کی پچ اور ضد کی وجہ سے کسی پر ناراض ہوگا یا تعصب و ہٹ دھرمی کی دعوت دے گا یا تعصب و عصبیت کی بنیاد پر کسی کی مدد کرے گا اور اس راہ میں مارا جائے گا تو اس کی یہ موت جاہلیت کی موت ہوگی اور جو شخص میری امت پر تلوار اٹھائے گا اور امت کے نیک و بد دونوں کو قتل کرے گا اور امت کے اہل ایمان کی پرواہ نہیں کرے گا اور نہ کسی عہد و پیمان کا لحاظ کرے گا تو وہ شخص مجھ سے نہیں اور نہ میں اس سے ہوں۔

اس حدیث نبوی کا مطلب اس وقت واضح ہو گا جب الجماعۃ کا مفہوم واضح ہو گا۔

لغت میں جماعت کا جو مفہوم ہے اگر وہی مراد ہے تو پھر آج کی دنیا میں ہزاروں جماعتوں میں سے کونسی جماعت مراد لی جائے گی۔

حضور کے عہد میں کونسی جماعت تھی؟

صرف امت مسلمہ اور خیر امت تھی۔ حضور کا اشارہ امت مسلمہ کی طرف تھا اور آپ کا مطلب یہ تھا کہ جو شخص امت مسلمہ کو چھوڑ کر ارتداد کی راہ اختیار کرے گا تو وہ کفر کی موت مرے گا۔

طاعت سے مراد نبی اکرم کی طاعت ہے اور اس لحاظ سے جماعت سے باہر ہونے اور اطاعت سے دور ہونے کا ایک ہی مطلب ہوگا۔ ہر ایک فقرہ دوسرے فقرہ کی وضاحت کر رہا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو طاعت رسول کے ۲/۱۶ اولی الامر کی اطاعت کا واجب ہونا ظاہر ہے اور اس اطاعت امراء میں یہ شرط ہے کہ وہ قرآن و حدیث کے تحت ہو۔ خلاف نہ ہو۔

الجماعۃ سے مراد اہل ایمان کی اجتماعیت ہے اور اہل ایمان کی با اختیار اجتماعیت کا نام اسلامی ریاست ہے۔

اب حدیث نبوی کا مطلب محدثین کی مذکورہ تشریحات کے بعد یہ ہے کہ اسلامی ریاست اور قرآن و سنت کے احکام کے مطابق چلنے والی حکومت کا شہری مسلمان اس کے نظام کی اطاعت کرے اور اس سے بغاوت نہ کرے۔ بغاوت کرنے والا جاہلیت کی موت مرے گا۔

علامہ قرضاوی صاحب نے اس حدیث سے یہ مطلب کیسے نکالا کہ ہر مسلمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی ریاست میں ایک امام اسلام کی اطاعت میں زندگی گزارے اور اگر کوئی مسلمان اسلامی ریاست کے بجائے کسی دوسری حکومت اور دوسرے ملک میں زندگی گزارتا ہے تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

اسی قسم کے غیر دینی فتووں سے اسلامی سیاست کی تحریکوں میں غلو اور شدت پیدا ہوئی اور اس کا آخری انجام وہ ہوا جس سے افغانستان اور پاکستان دونوں گزر رہے ہیں اور یورپ کے اور ہندوستان کے رہنے والے اس کا کڑوا مزا چکھ رہے ہیں۔

مولانا وصی مظہر ندوی (سندھ) نے علامہ قرضاوی کے مذکورہ فتوی پر تنقید کرنے کے بعد اس کی تاویل کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

یہ تاویل بتا رہی ہے کہ جماعت اسلامی کے یہ ذمہ دار عالم صاحب اگر یہ تاویل ضعیف نہ

51945 / : 7.5.06

کرتے تو اچھا تھا۔ بہ ظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ تاویل کرنے والے بزرگ اپنی شرمندگی کا احساس کم کرنا چاہتے ہیں۔ تاویل کی عبارت ملاحظہ ہو۔

جناب قرضاوی صاحب در حقیقت مسلمانوں کو غلبہ دین کی جدوجہد کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے ان کے سامنے اس خوفناک حقیقت کو واشگاف انداز میں بیان کر رہے ہیں کہ جو مسلمان قرآن کے مطابق قائم کسی حکومت کے سایہ عاطفت سے محروم ہو اس کو اپنا ایمان بچانے کے لیے غلبہ دین کی راہ میں سرگرم عمل ہونا چاہیے (میثاق جنوری لاہور ص ۴۵) ۔

تاویل کا یہ وہ انداز ہے جو تارک صلوۃ کے کافر ہونے والی حدیث کے متعلق کی جاتی ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

من ترک الصلوۃ متعمدا فقد کفر۔ جس شخص نے جان بوجھ کر نماز ترک کی وہ کافر ہو گیا۔

کفر کا تعلق عقیدہ سے ہے۔ عمل سے نہیں ہے۔ یہ علماء اصول کا متفقہ فیصلہ ہے اس لیے علماء حدیث نے اس وعید کو تنبیہ اور تغلیظ کے باب میں داخل کیا ہے اور بعض علماء نے کفر کو کفران نعمت کے مفہوم میں لیا ہے۔ لیکن حدیث مذکورہ میں کسی شارح حدیث نے یہ تاویل نہیں کی بلکہ اس کی وہ تشریح کی ہے جو اوپر تحریر کی گئی۔

دین حق کو غالب کرنے کی جدوجہد کا جہاں تک تعلق ہے وہ حسب استطاعت ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے اس ذمہ داری کو واضح کرنے کی غرض سے احادیث رسول کی روشنی میں غلط فتوی جاری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

تحریک اسلامی کے بانی مولانا ابوالاعلی صاحب مودودی علیہ الرحمہ نے اپنی مشہور کتاب خلافت و ملوکیت میں امام اعظم ابوحنیفہ کا اس مسئلہ میں جو مسلک ہے اسے واضح کیا ہے۔ اس کی روشنی میں اقامت دین کی جدوجہد اور عزیمت اور رخصت کے مختلف حالات کے مطابق اس جدوجہد کی مختلف صورتیں واضح ہو کر سامنے آگئی ہیں۔

مولانا مرحوم کی تحریک سے تعلق رکھنے والے حضرات نے اس مسئلہ میں غلو اور انتہا پسندی کا جو راستہ اختیار کیا ہے وہ درست نہیں معلوم ہوتا۔ ○